جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے کامیاب ایکسپورٹر بننے کا خواب حقیقت میں بدلیے

urdudigest.com
www.urdudigest.pk

اُردو ڈائجسٹ

مئی 2015ء

ہندو سے مسلمان
پروفیسر بننے تک

ہزاروں برس کی زندگی کا آرزومند انسان کیا مشین کے قالب میں ڈھل جائے گا؟

صفحہ ۴۸

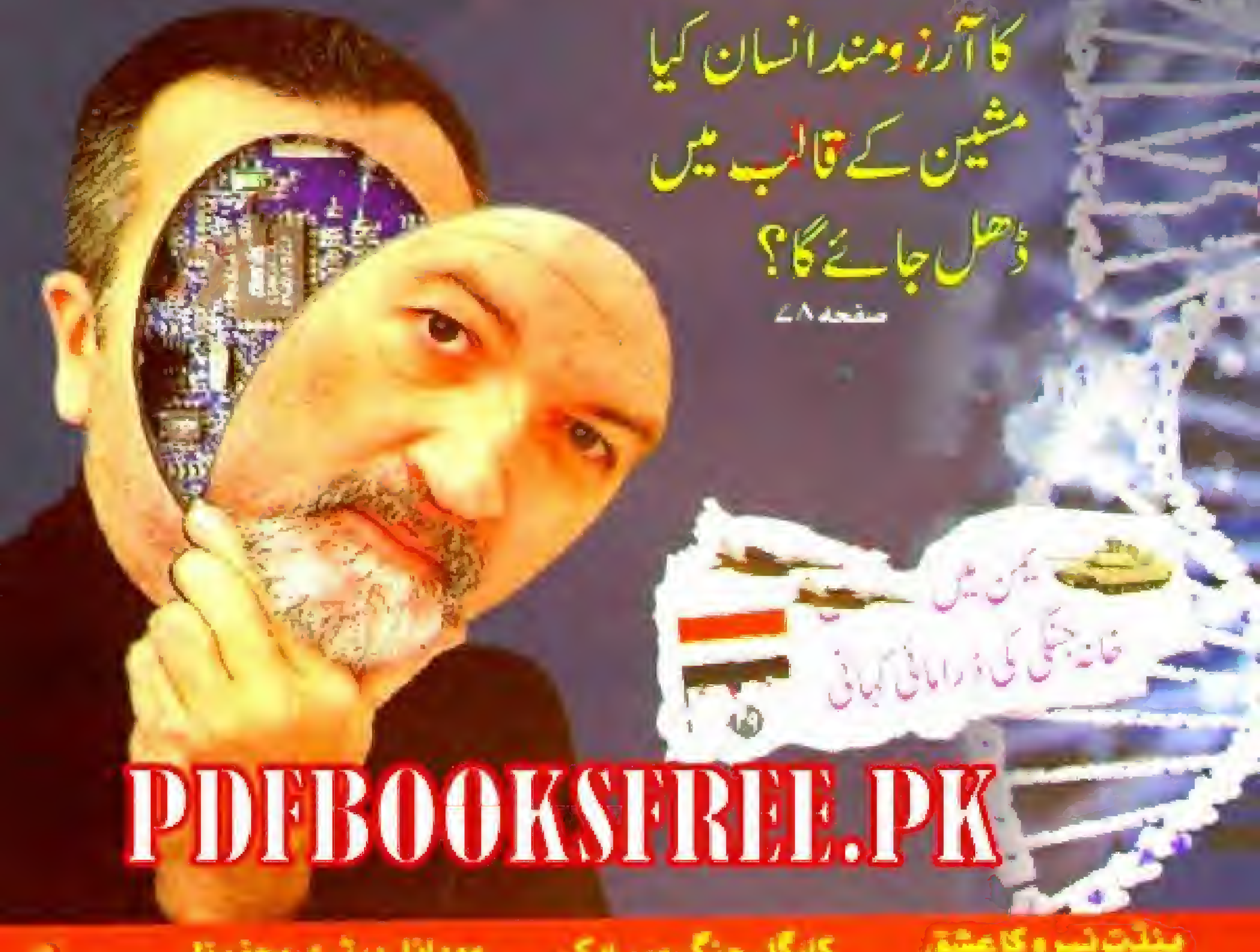

یمن میں خانہ جنگی کی ڈرامائی کہانی

PDFBOOKSFREE.PK

پنڈت نہرو کا عشق

کارگل جنگ میں ایک مجاہد کی داستان شجاعت

موبائل بیٹری محفوظ رکھنے کے نادر گُر

www.pdfbooksfree.pk

قارئین کے لیے نئے سال کا تحفہ

اپنے بچوں، دوستوں اور رشتہ داروں کو ادب سے روشناس کرائیے، آپ گزشتہ شمارے اپنے دوستوں کو تحفتاً بھی بھجوا سکتے ہیں، یہ سہولت اندرون و بیرون ملک دونوں کے لیے میسر ہے۔

۱۲ شمارے	۶۰۰ روپے
۲۴ شمارے	۱۰۰۰ روپے
۳۶ شمارے	۱۵۰۰ روپے
ڈاک خرچ یا کوریئر چارجز اس کے علاوہ ہوں گے	

ایک شمارہ ۵۰ روپے میں

کامیاب افراد کے حالات زندگی، ملک کی نامور شخصیات کے دلچسپ، خصوصی انٹرویوز، سماجی، سیاسی، معاشی و معاشرتی کہانیاں، حالات حاضرہ اور سیاست کے بدلتے رنگ، معاشرتی مسائل اور ان کا حل، شکاریات، روحانی واقعات، سائنس، طب و صحت، ٹیکنالوجی، کھیل، سیرت نبویؐ، اردو ادب، افسانے، ڈرامے، تازہ ترین معلومات اور بہت کچھ..........

شمارے حاصل کرنے کے لیے اپنا ایڈریس اور موبائل نمبر میسج کریں

subscription@urdu-digest.com

www.pdfbooksfree.pk

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

معبود

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے ارشاد فرمایا: اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں اس لیے میری ہی عبادت کرو۔ (الانبیاء: ۲۵)

اللہ کی مدد

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بیشک ہم اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور قیامت کے دن بھی مدد کریں گے جس دن اعمال لکھنے والے فرشتے گواہی دینے کھڑے ہوں گے۔

(المومن: ۵۱)

رسول ﷺ کا فرمان

اہل جنت

حضرت عمر فاروقؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خطاب کے بیٹے! جاؤ، لوگوں میں یہ اعلان کر دو کہ جنت میں صرف ایمان والے ہی داخل ہوں گے۔"

(رواہ مسلم، باب غلظ تحریم الغلول، رقم: ۲۰۹)

ایمان کا مزا

حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا: "ایمان کا مزا اس نے چکھا (اور ایمان کی لذت اُسے ملی) جو اللہ کو رب، اسلام کو دین اور محمد ﷺ کو رسول ماننے پر راضی ہو جائے۔

(رواہ مسلم، باب الدلیل علی ان من رضی باللہ ربا، رقم: ۱۵۱)

www.pdfbooksfree.pk

مئی 2015ء
رجب المرجب 1436ھ
جلد نمبر 55، شمارہ نمبر 5
urdudigest.com www.urdudigest.pk

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
الطاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی
قاسم محمود
[illegible]
حافظ [illegible]
فاروق [illegible] قریشی
[illegible] قریشی
[illegible]
[illegible]

خیرہ کن بلندی، پراسرار گہرائی [illegible]

[illegible] میں معروف ترین ایک
[illegible] کے بعد ہماری اگلی منزل
[illegible]
ہماری [illegible] جیرہان

[illegible] چینی شہر کے دو روزہ دورے کے دوران مترجم کا کردار ادا کرتی رہی [illegible] ریلوے اسٹیشن کے باہر [illegible] الوداع کہا۔ ہم [illegible] آرام دہ ویگن سے نکل کر اپنا سامان تھامے [illegible] جانے کے لیے اسٹیشن کی طرف بڑھے [illegible] عمارت کی پیشانی پر [illegible] ایک بہت بڑی [illegible] (CCTV) [illegible] چینی صدر شی جن پنگ کے دورۂ پاکستان کی [illegible] دکھا رہا تھا۔ چینی بڑی توجہ سے اپنے لیڈر کا پاکستان میں [illegible] استقبال [illegible] ہو رہے تھے۔

پچھلے بیس سال میں مجھے متعدد بار [illegible] اور مختلف صوبوں، شہروں اور قصبوں کی سیاحت کے ساتھ ساتھ ان کی [illegible] قریب سے دیکھنے کا موقع [illegible] کاروباری شخصیت کی سب سے بڑی [illegible] چینی شہر میں منعقد ہوتی ہے۔ چند سال پہلے تک [illegible] اب حالات بدل چکے۔ خصوصاً [illegible] بین الاقوامی نمائشوں کا مرکز بن چکا۔ اس دفعہ بھی [illegible] مقصد [illegible] میں منعقدہ ایک نمائش اور کانفرنس میں شرکت کرنا تھا۔

دورے کے دوران بہت سے کاروباری اور [illegible] اداروں کے سربراہان سے ہماری ملاقات [illegible] چینی صدر کے دورۂ پاکستان سے بہت [illegible] کہ پاکستان سے معاشی تعلقات میں مزید مضبوطی آئے گی [illegible] اپنی معاشی ترقی کو برقرار رکھنے کے لیے پاک چین اقتصادی راہداری کی اشد ضرورت [illegible] پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم [illegible] چینی حکومت [illegible] پاکستان کے تمام سیاست دانوں خصوصاً مذہبی رہنماؤں [illegible] کے شکوک و شبہات ختم [illegible] مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ پاکستان کے [illegible] کم ترقی یافتہ [illegible] منصوبوں [illegible] چینی کمپنیاں ہی کام کریں گی [illegible] منصوبوں کی تکمیل کے [illegible] سرمایہ [illegible] پاکستان [illegible] رہیں گے۔

بہت [illegible] نئے [illegible] چینی [illegible]

0300-8460093 [illegible]
advertisement@urdu-digest.com
0300-4005579 [illegible]
[illegible]
subscription@urdu-digest.com
02-42-37532357 [illegible]
URDU DIGEST Current A/C No. [illegible]
[illegible] (Samanabad, Lahore.)
[illegible] Code No. 110
+92-42-35290731 [illegible] +92-42-35290738
editor@urdu-digest.com

www.pdfbooksfree.pk

سائنس و ٹیکنالوجی کی مدد سے

ان نرالے انسانوں کی تحیر خیز کہانی جو سائنسی تجربوں کے سہارے ابدی حیات کا خزانہ پانے نکلے ہیں

سید عاصم محمود

انگریزی زبان کے چند فقرے سیکھنے میں کئی سال لگ جاتے ہیں، انھوں نے کرشمے کر دکھائے ہیں۔ ان کے کامیاب ہونے کی ایک بڑی وجہ ریاست اور حکومت کا طاقتور اور مستحکم ہونا ہے۔ چین کی آبادی ایک ارب ۳۱ کروڑ ہے۔ پھر وہاں کروڑوں سیاح آتے ہیں۔ ان سب کی نقل و حرکت پر جگہ جگہ نصب کیے گئے سی سی ٹی وی کیمروں اور خفیہ اداروں کے ذریعے ریاست ہر وقت نظر رکھتی ہے۔ کوئی بزنس مین، فنکار اور مذہبی شخصیت ریاست سے زیادہ طاقتور نہیں۔ وردی میں ملبوس کم عمر، پست قامت اور کمزور سے چینی کے سامنے امیر و غریب سب قطار لگا کر کھڑے ہوتے ہیں۔

چین میں شہری گوگل، واٹس ایپ، ٹوئٹر اور فیس بک کا استعمال نہیں کر سکتے کیونکہ حکومت نے اپنے تیار کردہ متبادل سافٹ ویئر انھیں دیے ہیں تاکہ ان سے ڈیٹا پر اپنا کنٹرول رکھ سکے۔ ای میل کے نظام پر بھی حکومت کی کڑی نظر ہے اور کئی فلٹروں کے بعد ہی ای میل متعلقہ کمپیوٹر تک پہنچتی ہے۔

چینی دراصل غیر جذباتی اور پُراسرار قوم ہے۔ نئی نسل مذہب سے بہت دور ہو چکی۔ آبادی پر کنٹرول کے لیے چین نے ایک بچے کی پالیسی اپنائی۔ اس کا فائدہ تو بہت پہنچا لیکن اب حالت یہ ہے کہ ایک نوجوان کو اوسطاً ۱۲ بزرگوں کی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔ صحت کی اچھی سہولتوں سے عمریں طویل ہو گئیں اور اب بوڑھوں کا بوجھ نوجوان اٹھا رہے ہیں۔ نوجوان نسل میں اسلام اور پاکستان سے متعلق معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن چینیوں کے دلوں میں پاکستان کے لیے احترام اور محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔

بڑھتی ہوئی مہنگائی نے چینی عوام کے لیے مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔ مختلف وجوہ کی بنا پر امریکا، روس اور یورپ میں چینی اشیا کی امپورٹ بتدریج کم ہو چکی جس کا منفی اثر چینی معیشت پر بھی پڑا۔ اس لیے حکومت اندرون ملک ترقیاتی منصوبوں پر تیزی سے عمل کر کے اپنی معیشت میں بہتری لا رہی ہے۔ چین کی ترقی کا بیشتر حصہ انفراسٹرکچر کی تعمیر پر ہے۔ بڑی بڑی ہائی ویز، تیز رفتار ریلوں کا جال، بے شمار ہوائی اڈے، اونچے اونچے ٹاورز اور عمارتیں، آئی ایم ایف اور [illegible] کی اندرونی و بیرونی تنازع میں الجھے بغیر تعمیر کرتے چلے جانا بھی اس قوم کی ترقی کا راز ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ [illegible] بڑے منصوبے تو بن رہے ہیں لیکن چین اور پاکستان کے درمیان براہ راست ذریعہ آمد و رفت صرف پی آئی اے ہے۔ پی آئی اے کی ہفتے میں صرف دو پروازیں بیجنگ جاتی ہیں۔ تھائی ایئرویز کے ذریعے جائیں تو بنکاک ہوائی اڈے پر خاصا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ چین کی تو کوئی پرواز پاکستان آتی ہی نہیں۔ اس مسئلے کو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان اور چین کی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ دو یا تین بڑے پاکستانی و چینی شہروں کے لیے اپنی ایئرلائنوں کی براہ راست پروازوں کا بندوبست کریں۔ یوں [illegible] ہونے سے باہمی کاروبار و تجارت میں روزافزوں اضافہ ہوگا۔

www.pdfbooksfree.pk

یہ ایک ایسے خوش قسمت انسان کی آپ بیتی ہے جو ہندو گھرانے میں پیدا ہوا لیکن اوائل عمری ہی میں خواب کی حالت میں نبی کریم ﷺ کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ مسلمان ہونے کی خبر جب خاندان کو پہنچی، تو انھوں نے اُسے دوبارہ ہندو بنانے کے لیے بے شمار ہتھکنڈے آزمائے لیکن وہ مذہب اسلام پر سختی سے قائم رہا۔ یہ انتہائی دلچسپ اور سبق آموز داستان مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۳۶

یہ انٹرویو ایک ایسے معالج کا ہے جو پردۂ چشم کے دائروں، رنگوں اور دیگر خصوصیات کا جائزہ لے کر قدرتی طریقہ علاج (جڑی بوٹیوں) سے تمام انسانی بیماریوں کا شافی علاج کرتے ہیں۔ بطور خاص سرطان، گھٹنوں کے درد، ذہنی دباؤ کے کئی مریض ان کی تحقیق سے شفا پا چکے۔ ان کی باتیں موذی مرض میں مبتلا مریضوں کے لیے مفید معلومات رکھتی ہیں۔ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۴۴

راشد اشرف کا یہ مضمون اردو کے ممتاز ادیب، نقاد اور مزاح نگار مشفق خواجہ کی شخصیت، ادبی خدمات اور مزاحیہ تحریروں کا احاطہ کرتا ہے۔ آپ روزنامہ جسارت اور تکبیر میں خامہ بگوش کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ جن لوگوں پر آپ نے مزاحیہ کالم لکھے، ان کے انتقال پر وہ سب سے زیادہ یہ کہہ کر روئے کہ اب ہم پر کون قلم اٹھائے گا! یہ دلچسپ سوانح حیات مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۸۴

اردو کے ممتاز کہانی کار، بلونت سنگھ کا یہ منفرد افسانہ ایک افسر اور وفادار ہیڈ کلرک رگھو ناتھ کے درمیان ہونے والی پر اثر گفتگو اور انسانی شبت رویے کو زیر بحث لاتا ہے۔ زلزلے میں سب کچھ تباہ ہونے کے بعد ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ہیڈ کلرک رگھو ناتھ کے گھر کچھ نہیں بچتا۔ لیکن غیرت نے اُسے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی اجازت نہ دی۔ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۷۲

یہ ایسا معاشرتی موضوع اجاگر کرتی کہانی ہے جس پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ بعض اوقات انسان نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا عمل کر گزرتا ہے جو اس کی شان اور عزت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ توقیر عاشق کی اس کہانی میں بھی ایک معزز و محترم شخص کے ذہن میں منفی سوچ پیدا ہوئی جس سے وہ خود کو قصور وار ٹھہرا کر مجرم تصور کرنے لگا۔ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۵۲

www.pdfbooksfree.pk

کامیاب کاروباری بننے کی خواہش تو ہر دل میں موجود ہے لیکن جن راستوں پر چل کر یہ منزل حاصل کی جا سکتی ہے، وہ ہر کسی کی دسترس میں نہیں آپاتے۔ طیب طارق نے اس مضمون میں تحقیق کے ساتھ ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو خصوصاً ایکسپورٹ کے کاروبار کی بابت ہر سطح پر قارئین کی بہت راہنمائی کرتی ہیں۔ مزید تفصیل جاننے کے لیے پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۹۳ الف

اس منفرد سفرنامے میں مصنف نے دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کان "کھیوڑہ"، ہندومت کے تاریخی مقام "کٹاس راج" اور خوبصورت وادیوں کی سرزمین "کلر کہار" کی تاریخ اور قدرتی مقامات اپنے قلم کا موضوع بناتے ہوئے ان کے بارے میں بے شمار معلومات فراہم کی ہیں۔ دلچسپ سفرنامہ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۳۶

بچے ہی ہر گھر میں رونق بڑھاتے ہیں۔ یہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا خاص تحفہ ہیں۔ جہاں بچے نہ ہوں، وہ گھر ویرانے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس آپ بیتی میں ایک والد نے اپنی ماشاء اللہ بیٹی کی دلچسپ باتیں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کی ہیں۔ ان میں خوبصورتی، سادگی، محبت اور چاہت کا بھرپور احساس موجود ہے۔ اس دلچسپ [illegible] کو [illegible] پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۲۱

دنیا کے بلند اور مشکل ترین محاذ جنگ میں پاک فوج کے بہادر اور غیور جوانوں نے اپنے لہو سے بہادری کی ایسی داستانیں رقم کی ہیں جن کا ذکر تا قیامت دنیا کی عسکری تاریخ میں ہوتا رہے گا۔ لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن جو بھارتی فوج سے دست بدست جنگ کرتے ہوئے کارگل کے میدان میں شہید ہوئے۔ جرأت اور بہادری کی اس [illegible] پڑھیے صفحہ نمبر: ۹۵

سلیم اختر کی یہ پراسرار کہانی دولت کی ہوس، لالچ کے اندھے پن میں مبتلا ایک نوجوان جہانگیر کے گرد گھومتی ہے جو چودہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگا اور اس وقت واپس آیا جب والد سمیت جائداد کے تمام حقیقی وارث فوت ہو چکے تھے۔ اسی لالچ میں وہ اپنی بیگم کو ساتھ لیے تابوت خانے میں اتر گیا جہاں اس کے باپ دادا اور پردادا تابوتوں میں دفن تھے۔ مزید پڑھیے صفحہ نمبر: ۱۹۰

www.pdfbooksfree.pk

کچھ اپنی زباں میں | ہم کہاں کھڑے ہیں

بشیر احمد بھٹی
ایک ملازمہ کی کتھا جس نے قانونی پیچیدگی آسانی سے حل کر ڈالی

ڈاکٹر ندیم بھٹی
عالم اسلام میں پنپنے والا دورِ جدید کا ایک المیہ

پروفیسر خالد پرویز
نیکی کا راستہ دکھلانے والے نصیحت آموز واقعات

نیلم احمد بشیر

جاوید بسام

ابوالاثر حفیظ جالندھری

راحت عائشہ

سلمیٰ اعوان

تنویر اقبال واگیوارہ

جیک ریچی

ساجد ہاشمی

محسن فارانی

عالیہ فاطمہ

محمد علی صدیقی

صالحہ محبوب

عبدالغفار نوابشاہی

ابوصارم

ہادی خان

عائشہ طاہر

محمد خلیل چودھری

فقیر اللہ خان

محمد اسلم لودھی

سراج دین

زکی امیر

حبیب اشرف صبوحی

کنہیا لال کپور

ملک محمد شاہد اقبال

خادم حسین مجاہد

پروفیسر شاہانہ اصغر

قصہ کوتاہ | چمن خیال | تبصرہ کتب

مشورہ حاضر ہے | پوچھو تو جانیں

www.pdfbooksfree.pk

صدر شی جن پنگ نے دورۂ پاکستان کے موقع پر جو حیات افروز مناظر طلوع ہوئے ان سے امیدوں کا ایک جہان کھل اٹھا ہے۔ امیدیں جو جوانوں کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے اور اب پوری قوم کو شاہراہ امید پر ایک نئے عزم اور ایک نئے اعتماد کے ساتھ سفر کا آغاز کرنا چاہیے۔ ایک ایسے وقت میں جب پاکستان سنگین آزمائشوں سے دوچار ہے ہمارے سب سے قابلِ اعتماد اور آزمودہ دوست نے ہمارا ہاتھ مضبوطی سے تھاما ہمیں اپنی اہمیت صلاحیت اور عظمت کا احساس دلایا ہے اور یہ خوش خبری سنائی ہے کہ ہم جلد اندھیروں کا لشکر چیر کر نکلنے والے ہیں۔ چین کے صدر نے پاکستان کو "فولادی بھائی" قرار دیا اور اعلان کیا کہ چین کے عوام اپنے بھائیوں سے ان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے تعاون کی کوششیں دوگنی کرتے جائیں گے۔ پارلیمان کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے پاکستان کو خراج تحسین پیش کیا کہ اس نے دہشت گردی سے جنگ میں زبردست قربانیاں دی ہیں اور ہمارے مغربی علاقے بھی محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس پر وزیر اعظم نواز شریف نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ چین کی سلامتی پاکستان کی سلامتی ہے۔ ان مخلصانہ جذبات پر مبنی قدروں کے پیچھے ۴۶ ارب ڈالر کے معاہدوں اور منصوبوں پر دستخط ہوئے اور چین کے صدر نے ان منصوبوں کی تختیوں کی نقاب کشائی کی جن میں پارلیمان ہاؤس کو بجلی فراہم کرنے کا منصوبہ ایک بہت بڑی علامت کی حیثیت رکھتا تھا۔

آنے والے پندرہ برسوں میں پاکستان کے اندر چھیالیس ارب ڈالر کی سرمایہ کاری سے ایک عظیم الشان اقتصادی تبدیلی سے معاشی ترقی اور خوشحالی کے شعبے میں زبردست انقلاب آ سکتا ہے۔ ان معاہدوں میں ۳۲ ارب ڈالر توانائی کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ چین پاک اقتصادی راہداری جس پر ۲۰۱۳ء میں وزیر اعظم کے دورۂ چین کے موقع پر دستخط ہوئے تھے اس میں گوادر سے کاشغر تک ریل اور سڑکوں کا جال بچھانا اور صنعتی زونز قائم کرنا اور چین کو گوادر کے ذریعے افریقہ اور یورپ کے بازاروں تک پہنچنے کا ایک مختصر اور محفوظ راستہ فراہم کرنا ہے۔ یہ وہی گزرگاہ ہے جہاں سے دنیا کی ساٹھ فیصد تجارت اور تیل کی رسد فراہم ہوتی ہے۔ چین اس وقت دنیا کی دوسری بڑی معاشی طاقت ہے۔ وہ عالمی تجارت و ترقی میں سب سے آگے ہے۔ چین کی ترقی کا سفر تیز ہے اور پاکستان اس کا اہم حصہ ہے۔ ان معاشی سرگرمیوں سے پورے خطے کی تقدیر بدل سکتی ہے اور پاکستان علاقائی تجارت کا مرکز بن سکتا ہے۔ قوموں کی

www.pdfbooksfree.pk

زندگی میں ایسے نادر مواقع شاذ و نادر ہی آتے ہیں۔ پاکستان نے چین کا ساتھ اس آن استقامت اور جرأت سے دیا تھا جب وہ دنیا میں تنہا تھا اور اس کے ساتھ رابطے پیدا کرنا عظیم طاقتوں کی نگاہ میں بہت بڑا جرم تھا۔ امریکہ نے چین کو آزادی کے تیس برس بعد تسلیم کیا جبکہ پاکستان نے تمام خطرات کو خاطر میں لائے بغیر اسے تسلیم کرنے میں پہل کی تھی۔ اب اس دوستی کا حق ادا کیا جا رہا ہے۔

اتنی بڑی سرمایہ کاری کے ثمرات عام آدمی تک پہنچانے کے لیے حکومت پاکستان اپنے اندر بڑی تبدیلیاں لانے کا عمل فوری طور پر شروع کر سکتی ہے۔ ہمارا انتظامی ڈھانچہ انتہائی فرسودہ ہے اور سیاسی نظام کے اندر بھی شفافیت لانے کی اشد ضرورت ہے۔ ہماری کمپنیاں اور ہمارے مزدور عالمی معیار سے بہت پیچھے ہیں اس لیے ہمیں اصلاحات کی ایک تحریک چلانا ہوگی اور استعداد کار میں اضافے کے لیے بڑے پیمانے پر تربیتی مراکز قائم کرنا ہوں گے۔ اس کے علاوہ اچھی حکمرانی اور قابل اعتماد عدالتی سسٹم کے قیام پر خصوصی توجہ دینا ہوگی۔ ایک اہم بات یہ کہ قوم کے اندر چینی زبان سیکھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ منصوبوں پر کام کرنے کے لیے لاکھوں چینی پاکستان آئیں گے اور سنکیانگ کے پس ماندہ علاقوں میں کام کرنے کے لیے اتنی ہی تعداد میں پاکستانیوں کی مانگ پیدا ہوگی۔ مناسب ہوگا کہ چینی زبان پڑھانے کے انتظامات اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں شروع کر دیے جائیں جو دائمی دوستی کو ایک عظیم تہذیبی معنویت اور بلندی سے ہمکنار کریں گے۔

ہمیں اس حقیقت کا ادراک بھی ہونا چاہیے کہ بعض ممالک اور عناصر کے لیے پاکستان اور چین کی اسٹریٹجک شراکت داری اور اتنے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری بڑی تکلیف دہ ہوگی۔ وہ اقتصادی راہداری کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات کو ہوا دیں گے۔ اس کا سب سے مؤثر دفاع حکومت کے دانش مندانہ اور منصفانہ اقدامات ہی سے ہو سکے گا۔ اقتصادی راہداری کے مختلف نقشے گردش کر رہے ہیں جن سے خدشات جنم لے سکتے ہیں۔ وہ علاقے جہاں سے شاہراہیں گزریں گی اور ترقیاتی منصوبے شروع ہوں گے وہاں کے نمائندہ لوگوں اور پارلیمانی جماعتوں کے سربراہوں کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ اب جمہوریت کا دور دورہ ہے اور اس واقعے پر جائز گرفت ہو رہی ہے کہ معاہدوں پر دستخطوں کی تقریب میں تمام صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کیوں شامل نہیں کیے گئے۔ یہ معاملات غیر معمولی احتیاط اور چابک دستی اور دور اندیشی کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ معاہدے اور منصوبے دونوں طرف کے عوام کی پرجوش تائید ہی کی ریاضت سے وجود میں آئے ہیں اس لیے انھیں عوام کی تائید حاصل ہے۔ ان شاء اللہ یہ وقت پر تکمیل پذیر ہوں گے۔ فوجی قیادت نے چینی کارکنوں کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک الگ ڈویژن قائم کر کے کامیابی کا سگنل دے دیا ہے۔

الطاف حسن قریشی

www.pdfbooksfree.pk

غیر ذمے دارانہ رویوں کے شرارے

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

ہماری تاریخ میں جہاں اچھے فیصلوں کے سنہرے مناظر دکھائی دیتے ہیں، وہاں جذباتی لمحات میں اختیار کیے گئے سیاسی رویوں کی تپش بھی محسوس ہوتی ہے۔ آج ہم جن مشکلات کے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں، ان کے اسباب میں جہاں فوجی حکمرانوں کی پے در پے مداخلت کے علاوہ بعض گروہ اور خود پسند سیاست دانوں کے غیر ذمے دارانہ فیصلے بھی شامل ہیں۔ ہمارے بیشتر دانشوروں نے ان کا محاسبہ نہیں کیا کہ تاریخ ہمارا پیچھا کرتے رہے گی۔ قدرت نے پاکستان کی صورت میں ہمیں اپنی حالت بہتر بنانے کا ایک نادر موقع عطا کیا ہے، اس کا اولین تقاضا ہے کہ ہم امید کے چراغ فروزاں رکھیں۔ یہ بھی تاریخ کا طالب علم ہونے کی حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ افراد کے درمیان اقتدار کی کشمکش پر سمجھوتہ نہیں ہوتا، اس لیے ہماری سیاست میں بہت بگاڑ پیدا ہوا ہے۔ پاکستان کے وجود میں آتے ہی وزیراعظم خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی کے درمیان سیاسی رقابتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اس سے مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان بدگمانیاں جنم لینے لگیں۔ اسی کے ساتھ مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن نے وہاں عوامی حمایت حاصل کرنے کی خاطر ایک دور شروع ہوا اور صوبائی خودمختاری کا مطالبہ شدت کی حدوں کو چھونے لگا۔ مولانا بھاشانی نے "کاگماری" کانفرنس کے جلسے پر ۱۹۵۷ء میں مغربی پاکستان کے عوام کو ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے السلام علیکم کہا تھا۔

پنجاب میں نواب افتخار حسین ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ کے مابین سیاسی کشمکش ایک ایسی خوفناک شکل اختیار کر گئی تھی کہ بیوروکریسی کو مداخلت کا موقع مل گیا اور اسی کشمکش میں جمہوریت کا چراغ گل ہوا۔ آپ تاریخ پڑھتے جائیے اور آپ کو ہر مرحلے پر ایسے کردار نظر آئیں گے جن کی خواہشات آج بھی آگ کو ہوا دے رہی ہیں اور شرارے شعلوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ ہم اس امر کا جائزہ لیں گے کہ وحشت زدگی کا ماحول کیسے پیدا ہوا؟ تازہ بات یمن کے منظر نامے کی تحریک میں ہے کہ ہم کہاں کہاں کھڑے ہیں اور سعودی عرب سے تعلقات میں نقب لگانے کی سازش کہاں تیار ہوئی اور ایسے بیانیے کو تقویت کن حلقوں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ ان عجیب و غریب واقعات کے پس منظر میں ہمارے بعض سیاست دانوں اور دانشوروں کے اعمال اور انتہائی غیر ذمے دارانہ رویے اور فیصلے شامل ہیں جن کی نشاندہی مستقبل میں پہنچنے والے نقصانات کی روک تھام کے لیے ناگزیر ہے۔

☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk

چین کے صدر کا دورۂ پاکستان ستمبر ۲۰۱۴ء میں طے پا چکا تھا جو آٹھ ماہ کی تاخیر سے ۲۰ اپریل 2015ء کو وقوع پذیر ہوا۔ یہ تاخیر ان دھرنوں کے باعث ہوئی جس کی وجہ سے عمران خان اور علامہ طاہرالقادری کئی ماہ تک پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں ڈٹے رہے اور شاہراہِ دستور پر قابض رہے۔ چیئرمین صاحب جب ۱۳ اگست کی رات لاہور سے روانہ ہوئے تو انھیں لوگ پہنچنے کے انتظار میں دو روز گوجرانوالہ میں قیام کرنا پڑا۔ انھیں معلوم تھا کہ ستمبر میں چین کے صدر پاکستان کا دورہ کرنے والے ہیں اس کے باوجود انھوں نے دارالحکومت میں لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کیا۔ پارلیمان ہاؤس کے گیٹ کا محاصرہ کیے رکھا، ایوانِ صدر کی طرف جانے والے راستے کنٹینر لگا کر بند کر دیے اور وزیراعظم ہاؤس پر حملے جاری رکھے۔ کچھ روز بعد پی ٹی وی اسٹیشن پر بھی ہلہ بول دیا اور دنیا کو پیغام دیا کہ ان کا حکومت پر قبضہ ہو گیا ہے۔ یہ ڈرامہ چار ماہ تک جاری رہا اور پولیس فورس کو بہت بڑے عذاب سے گزرنا پڑا۔ عمران خان اس دوران فرماتے رہے کہ چین کے صدر کا پاکستان آنے کا کوئی پروگرام ہی نہیں تھا اور حکومت نے ان کے فرضی دورے کا ایک افسانہ تراش رکھا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے رہے کہ امپائر کی انگلی اٹھنے کو ہے اور سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔ وہ ان دنوں خواہشات کے گھوڑے پر سوار تھے اور سیاسی اخلاقیات اور انسانی قدریں بے دردی سے روندتے چلے جا رہے تھے۔ انھیں فوج کے اندر چند جرنیلوں اور ریٹائرڈ فوجی افسروں نے پورا یقین دلا رکھا تھا کہ عدالتِ عظمیٰ کے ذریعے موجودہ حکومت معزول کر دی جائے گی اور ٹیکنوکریٹس کی حکومت ان کی سربراہی میں قائم ہو گی۔ وہ پارلیمان کو بھی تہس نہس کرنے پر تلے ہوئے تھے اور قومی اسمبلی سے استعفے دے چکے تھے۔ چین پارلیمان کا مشترکہ اجلاس مسلسل جاری رہا جس نے وزیراعظم اور قانونی حکومت کا ساتھ دیا۔ دریں اثنا تحریکِ انصاف کے منتخب صدر مخدوم جاوید ہاشمی نے عمران خان کا پورا خفیہ منصوبہ بے نقاب کر دیا اور کھلے بندوں کہا کہ خان صاحب جو کچھ کر رہے ہیں اسے کور کمیٹی کی تائید حاصل نہیں۔

۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کی صبح آرمی پبلک اسکول پشاور پر دہشت گردی کے دلفگار واقعات کے بعد انھوں نے دھرنا ختم کر دینے کا اعلان کیا، مگر دنیا کو یہ پیغام دے گئے کہ پاکستان کی منتخب حکومت غیر محفوظ ہے، ریاست ناکام ہوتی جا رہی ہے اور کسی سربراہِ مملکت کا یہاں آنا خطرے سے خالی نہیں۔ ان کی اس بچگانہ اور عاقبت نااندیشی سے قومی مفاد اور ملکی معیشت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور چین کی قیادت یہ سوچنے پر مجبور ہوئی کہ پاکستان سے معاملات کرتے وقت سیکیورٹی کو اولین اہمیت دینا ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۰ اپریل کو جو منصوبے اور معاہدے ہوئے، ان کی اور چینی کارکنوں کی حفاظت کے لیے فوج کو ایک خصوصی ڈویژن کھڑا کرنا پڑا ہے۔

۲۰۱۳ء کے انتخابات کے ایک سال بعد عمران خان نے منظم دھاندلی کا شور مچایا اور تحقیقات کے لیے عدالتِ عظمیٰ کے جج صاحبان پر مشتمل عدالتی کمیشن کے قیام کا مطالبہ کیا۔ ان کے مطالبے سے دو روز پہلے وزیراعظم نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو عدالتی کمیشن تشکیل دینے کے لیے خط لکھ دیا تھا، مگر حکومت اور تحریکِ انصاف کے درمیان کمیشن کی شرائط پر مہینوں مذاکرات ہوتے اور ٹوٹتے رہے۔ آخرکار وہ ایک مسودے پر متفق ہو گئے جس کے مطابق سپریم کورٹ کے فاضل چیف جسٹس نے حکومت کی درخواست پر بلاتاخیر کمیشن اپنی سربراہی میں تشکیل دے دیا اور دوسرے ہی روز سیاسی جماعتوں کو منظم دھاندلی کے ثبوت ایک ہفتے کے اندر پیش کرنے کے احکام صادر کیے۔ سات روز گزرنے کے بعد تحریکِ انصاف نے مزید مہلت طلب کی جو واضح اشارہ تھا کہ سرے سے ہوم ورک ہی نہیں ہوا۔ جناب عبدالحفیظ پیرزادہ نے کمیشن کے روبرو موقف اختیار کیا

www.pdfbooksfree.pk

کہ ۱۳ مئی ۲۰۱۳ء کی نصف شب نواز شریف نے ٹی وی پر اپنی کامیابی کا جو اعلان کیا وہ منظم دھاندلی کے زمرے میں آتا ہے۔ کمیشن نے پوچھا آپ کس بنیاد پر یہ بات کہہ رہے ہیں۔ اس نے متعلقہ سیاسی جماعتوں سے کہا ہے کہ وہ اس امر کا ٹھوس ثبوت لے کر آئیں کہ منظم دھاندلی کا منصوبہ کس نے بنایا اور اس پر کس نے عمل کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تحریک انصاف کے پاس منظم دھاندلی کے ٹھوس ثبوت موجود ہی نہیں اور وہ غیر متعلق واقعات کی ایک لاکھ چھتیس ہزار صفحات پر مشتمل رپورٹ کمیشن میں داخل کر کے معاملے کو الجھانا چاہتی ہے۔ کنٹونمنٹ بورڈز کے حالیہ انتخابات نے ۲۰۱۳ء کے انتخابات کی صحت پر بڑی حد تک مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ عدالتی کمیشن کی منظم دھاندلی کا سراغ نہیں لگا سکے گا اور عمران خان کو ایک بار پھر خفت کا سامنا کرنا ہوگا کہ جذباتی فیصلے آخرکار تباہی اور ذلت کا باعث بنتے ہیں۔

عمران خان نے اپنی جماعت کی اکثریتی رائے کے خلاف اپنی تنظیم کے اندر انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا اور ناتجربہ کاری اور وقت کے شدید دباؤ کے تحت قواعد و ضوابط کی پاسداری نہ ہو سکی اور ان گنت شکایات منظرِ عام پر آئیں۔ انھیں چیئرمین صاحب مسترد کرتے رہے۔ چند ہی ماہ پہلے ان داخلی انتخابات کے بارے میں جسٹس (ر) وجیہ الدین احمد کی رپورٹ سامنے آئی تھی جو الیکشن ٹریبونل کے سربراہ کی حیثیت سے پیش کی گئی۔ اس کے مطابق پارٹی کے داخلی انتخابات میں بڑی دھاندلی ہوئی، بہت پیسہ چلا اور جعلی طریقے برتے گئے۔ اس رپورٹ کے بعد چیئرمین عمران خان نے تمام انتخابات کالعدم قرار دے دیے اور مختلف سطح پر انتخابات کے ذریعے قائم شدہ تنظیمیں توڑ ڈالیں۔ فردِ واحد کے آمرانہ فیصلے کو یہ دوسری بڑی شکست ہوئی ہے۔ تیسری شکست بھی منڈلا رہی ہے کیونکہ فاضل جسٹس (ر) وجیہ الدین احمد نے اس رائے کا بھی اظہار کیا ہے کہ جو ارکان قومی اسمبلی سے مسلسل چالیس دن سے زائد غیر حاضر رہے، ان کی رکنیت آئین کی رو سے ختم ہو گئی ہے۔ اس پر چیئرمین صاحب نے الیکشن ٹریبونل تحلیل کر ڈالا۔ یہ غیر جمہوری فیصلہ پارٹی کے اہم لوگوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ فاضل جسٹس (ر) وجیہ الدین احمد جو بڑے منکسر المزاج اور زیرک انسان ہیں، انھوں نے عمران خان کو بڑا صائب مشورہ دیا ہے کہ دنیا کو بدلنے سے پہلے انھیں اپنے رویے بدلنا ہوں گے۔

٭٭٭

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت عدالتی کمیشن قائم ہو رہا تھا، ان دنوں یمن میں حوثی قبائل صدر ہادی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر رہے تھے اور دارالحکومت صنعا کے علاوہ عدن بندرگاہ پر بھی حملے شروع کر رہے تھے۔ اسی خطرے کی پیش بندی کے لیے سعودی عرب کے فرمانروا سلمان بن عبدالعزیز نے وزیرِاعظم نواز شریف کو دورے کی دعوت دی۔ پہلی بار ان کا ہوائی اڈے پر استقبال ہوا۔ انھی دنوں ہمارے ہاں سینیٹ کے انتخابات آخری مراحل میں تھے، اس لیے شہباز شریف اسی رات واپس آ گئے تاہم نواز شریف اور وفد کے ارکان کی سعودی عرب کی اہم شخصیتوں سے تفصیلی ملاقاتیں جاری رہیں۔ سرکاری سطح پر تو کچھ نہیں بتایا گیا لیکن اس خطے کے حالات پر نگاہ رکھنے والے سیاسی تجزیہ نگار کہہ رہے تھے کہ ایران سے چھ ممالک کے کامیاب مذاکرات کے تناظر میں عرب اور عجم کے درمیان تناؤ بڑھنے والا ہے۔ چند روز بعد یمن سے بغاوت کی خبریں آنے لگیں۔ تب شاہ سلمان نے وزیرِاعظم نواز شریف سے ٹیلی فون پر طویل گفتگو کی اور پاکستان سے فوج کے علاوہ طیارے اور بحری جہاز فراہم کرنے کی استدعا کی۔ ہماری قومی قیادت یہ اعلان کرتی رہی کہ پاکستان مشکل کی گھڑی میں اپنے برادر ملک سعودی عرب کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد یہ انتہائی اہم اور حساس معاملہ

www.pdfbooksfree.pk

پارلیمان کے مشترکہ اجلاس میں اٹھایا گیا۔ پارلیمان میں بحث شروع کرنے سے پہلے اس نازک مسئلے پر کابینہ میں غور و خوض اور پارلیمانی اجزاء سے ایک مؤثر حکمت عملی اپنانی ضروری تھی مگر ایسا نہیں ہوا۔ مشترکہ اجلاس میں تحریک انصاف کے ارکان بھی شریک ہوئے اور چیئرمین صاحب نے فرمایا ہم اجلاس میں شرکت اس لیے کر رہے ہیں کہ پاکستانی فوج کو سعودی عرب جانے سے روک سکیں۔ اس موقف کا اعلان میں سعودی عرب کے لیے حد درجہ تکلیف دہ پیغام تھا جو پاکستان سے بہت ساری توقعات لگائے بیٹھا تھا۔

پارلیمنٹ سے وزیر دفاع خواجہ آصف نے بحث کا نہایت تمہیدی سے آغاز کرنے کے بجائے تحریک انصاف پر تند و تیز حملے شروع کر دیے۔ اس پر پارلیمان ہاؤس مچھلی منڈی بن گیا اور بعض ارکان پارلیمان کی فہم و فراست سے عوام میں سخت تشویش پیدا ہوا۔ ... ہو چکا تھا اور احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ رہا تھا۔ دانش وری اور آزاد خیالی کے گھمنڈ میں بعض مقررین پاک سعودی عرب تعلقات پر آرے چلاتے رہے۔ دراصل مشترکہ اجلاس ان کیمرہ ہونا چاہیے تھا۔ تیسرے روز اختر خان جدون کا تیار شدہ قرارداد پارلیمان ہاؤس میں پیش کی گئی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس وقت مشیر خارجہ جناب سرتاج عزیز ایوان میں موجود نہیں تھے۔ تحریک انصاف نے قرارداد میں غیر جانبداری اور ثالثی کے الفاظ شامل کرنے پر اصرار کیا اور اتفاق رائے کی خاطر یہ تجاویز شامل کر لی گئیں جس کے سبب کئی آوازیں اٹھیں اور یہ قرارداد ... میں طلب و عرض میں کھو گئیں کہ پاکستان نے سعودی عرب کے معاملات میں غیر جانبدار رہنے کا اعلان کر دیا ہے۔ ان پر اطلاعات نے نائب وزیر خارجہ کا بیان آیا کہ پاکستان کو اپنے کیے سے پیدا ہونے والے نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔ سعودی عرب سے مذہبی امور کے مشیر شیخ ... آئے۔ ابتدا میں ان کا رویہ بھی خاصا سخت تھا لیکن اہم شخصیتوں سے ملاقات کے بعد ان کے بیانات میں دانش اور حقیقت پسندی جھلکنے لگی۔ انھوں نے کہا ہمیں یقین ہے کہ مشکل کی گھڑی میں پاکستان ہمارے شانہ بشانہ کھڑا ہے اور ہمیں علاقائی سالمیت آزادی اور خودمختاری کی ضمانت دی گئی ہے۔

سعودی عرب جس کے پاکستان کے ساتھ گہرے، دیرینہ اور قابل رشک تعلقات قائم ہیں وہ یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ آزمائش کی گھڑی میں پاکستان خود امداد کی پیشکش کرے گا اور اپنی فوجیں اس کی جانب کے علاوہ مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے بھیجے گا۔ وزیراعظم نواز شریف نے سعودی عرب کے فرمانروا شاہ سلمان سے ٹیلی فون پر بات چیت کرتے ہوئے یقین دہانی کرائی مگر پارلیمان کی قرارداد میں دل جوئی اور حق دوستی ادا کرنے کے بجائے ایک ایسا لب و لہجہ اختیار کیا گیا جس میں گرم جوشی کم اور احتیاط بہت زیادہ تھی۔ جب توقعات بہت زیادہ ہوں تو نصیحت کی بات بھی گراں گزرتی ہے۔ سعودی عرب میں جو بے چینی موجود ہے اس نے پارلیمان میں ہونے والی تقریروں سے مزید مسالا لگا کر اعلیٰ حلقوں تک پہنچایا اور ہمارے ہاتھ دور بیٹھے کچھ نقصان پہنچانے کی مزید کوشش کی۔ نقصان پر قابو پانے کے لیے شہباز شریف کی قیادت میں ایک وفد ریاض گیا مگر وہ شاہ سلمان سے ملاقات نہ کر سکا۔ تب وزیراعظم نواز شریف اور آرمی چیف جنرل راحیل شریف اور اعلیٰ حکام ایک روزہ دورے پر سعودی عرب گئے۔ ہم نے ٹی وی پر ان کی جو تصاویر دیکھیں ان سے اندازہ ہوا کہ معاملات بڑی حد تک سلجھ گئے ہیں اور سیاسی اور فوجی قیادت کی مشترکہ کوششوں سے سعودی حکام صورت حال کی نزاکت واضح طور پر سمجھ چکے ہیں کہ یمن میں پاکستان کی افواج کا جانا کسی کے فائدے میں نہیں اور اسے بھی اپنی فوجیں وہاں نہیں بھیجنی چاہییں کیونکہ یمن تو افغانستان جیسا ہے کہ وہاں جو گیا اس کا قبرستان بن گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

سعودی عرب کے امام کعبہ خالد الغامدی ایک ہفتے کے دورے پر پاکستان آئے ہیں۔ لاہور میں ان کا زبردست خیر مقدم ہوا ہے۔ وہ ان مراکز میں جا رہے ہیں جو دینی جذبوں سے سرشار اور سعودی عرب پر ناز کرتے ہیں۔ ان کے دورے سے دونوں ملکوں کے برادرانہ تعلقات میں جو کچھ تلخی وقتی طور پر آ گئی تھی۔ پاکستان کے عوام سعودی عرب سے ٹوٹ کر محبت کرتے اور اسے اپنی روح سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کو آپس میں تقسیم کرنے کی اپیلوں سے تشویش محسوس کرتے ہیں اور ان کے مسائل پر فکر مند رہنا چاہتے ہیں۔ ہمارے میڈیا کو اس امر کا پورا احساس ہونا چاہیے کہ اس نازک موقع پر اس کی ذمے داریاں کس قدر اہم ہیں۔ ہمارے دانش وروں پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ پاکستان نے جس محبت اور خلوص کی روایت سے تعلقات استوار کیے ہیں ان کی عزت کو کوئی ٹھیس نہ پہنچنے پائے اور پرانے روابط تر و تازہ رہیں۔ یہ منظر بہت روح فرسا ہے کہ مشکل کے وقت دو مخلص دوست ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے کے بجائے برہم سے اور الگ الگ نظر آتے ہیں۔ یہ وقت اپنے دوست کی مشکلات میں ان کی مدد کے لیے پہنچنے کا ہے۔ ہم اس کی جنوب سے اشتعال سے بھی واقف ہیں اور سوچ سمجھ کر مسئلے کا حل تلاش کرتے رہے ہیں۔ اب ہمیں پیچیدہ مسئلے کا حل تلاش کرنا اور سعودی بھائیوں کے ساتھ ثابت قدمی سے کھڑا ہونا ہوگا۔

مشرقِ وسطیٰ کے تناظر میں یہ سوال غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ کس طرح خانہ جنگی جیسے ختم ہو سکتی اور عجم اور عرب میں اچھے تعلقات فروغ پا سکتے ہیں۔ سعودی عرب کی امداد سے یمن میں عرب ملکوں کا جو اتحاد قائم ہوا، اس نے فضائی طاقت کا استعمال اس قدر مؤثر انداز میں کیا کہ حوثی قبائل کی پیش قدمی رک گئی ہے اور وہ پسپا ہو رہے ہیں۔ عرب طاقتوں میں ہمت پیدا ہو گئی ہے۔ اب امریکی بحری بیڑا بھی وہاں پہنچ گیا ہے جو ایرانی جہازوں کی اس غرض سے تلاشی لے گا کہ کوئی اسلحہ حوثی باغیوں تک نہ پہنچ سکے۔ پاکستان اس لیے بہت خوش قسمت ہے کہ اس کے عرب اور عجم کے ساتھ ہمیشہ اچھے تعلقات رہے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ "سیٹو" اور "آر سی ڈی" کا ممبر رہ چکا ہے جس میں ایران اور ترکی بھی شامل تھے۔ ترکی کی سے اقوام متحدہ کی جنرل کونسل نے یمن کا بحران حل کرنے کے لیے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں فوری جنگ بندی کرنے اور مذاکرات کا عمل شروع کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اس قرارداد کی ایران کی حمایت اور اقوام متحدہ کے ذمہ دار رکن کی حیثیت سے دونوں طرف سے دباؤ ضرور پڑے گا۔ اس موقع پر اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ مسلم وزرائے خارجہ کا ہنگامی اجلاس طلب کر کے مذاکرات کے ذریعے بحران کا پائیدار حل تلاش کیا جائے۔ پاکستان ان کوششوں میں مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے اور امن فوج قائم کرنے کی تجویز بھی زیرِ غور آ سکتی ہے۔ یہ تجویز اس وقت قابلِ عمل ہوگی جب مسلمان ممالک اپنے تنازعات حل کر لیں گے۔ نیٹو کے قیام سے پہلے یورپ نے اپنے باہمی اختلافات ختم کیے تھے۔

***

کراچی میں ضمنی انتخابات میں ایم کیو ایم کو اس کی شاندار کامیابی پر مبارکباد پیش کی جانی چاہیے کہ اس نے بڑی حد تک شفاف انتخابات میں عوام کی بھاری حمایت کا ثبوت دیا اور سیکٹر کمانڈروں سے نجات پائی ہے۔ مگر اس بھاری حمایت کا احترام بھی تحریکِ انصاف کے لیڈروں کی طرف سے ہونا چاہیے۔ ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کے خلاف شائستگی اور تہذیب سے گری ہوئی زبان استعمال کر رہے تھے تو اس کا نوٹس لیا جائے۔ ایم کیو ایم کے ترجمان میں تند و تیز بھی جاری

www.pdfbooksfree.pk

جب انھوں نے جس جارحانہ انداز میں اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا، اس نے مہاجرین کو یہ پیغام دیا کہ اسٹیبلشمنٹ ان کے ذریعے ان کی طاقت پارہ پارہ کر دینا چاہتی ہے۔ بدقسمتی سے ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے گئے جو یہ تاثر دیتے رہے کہ ایم کیو ایم کا چاروں طرف سے گھیراؤ کیا جا رہا ہے۔ رینجرز فورس نے کراچی میں خاصا کامیاب آپریشن کیا، مگر ان سے کئی زیادتیاں بھی سرزد ہوئیں جو بڑھا چڑھا کر پیش کی جاتی رہیں کہ صرف مہاجر تختۂ مشق بنائے جا رہے ہیں۔ وہ اربابِ اختیار جنھوں نے نبیل گبول سے استعفا لے کر ضمنی انتخاب کا ڈراما رچایا، دراصل وہی ایم کیو ایم کو تقویت پہنچانے کا باعث بنے ہیں۔ منصوبے کے مطابق نبیل گبول کو تحریکِ انصاف کے ٹکٹ پر انتخاب لڑانا تھا، مگر ان کے درمیان معاملہ طے نہ پا سکا۔ رینجرز نے نائن زیرو پر جب چھاپہ مارا تو ایم کیو ایم کا پورا وجود لرز اٹھا تھا، مگر صولت مرزا کی پھانسی سے چند گھنٹے پہلے ان کے اقبالی بیان نے چھاپے کا سارا تاثر زائل کر دیا اور مہاجرین کو یقین ہو گیا کہ ایم کیو ایم ہی انھیں تحفظ فراہم کر سکتی ہے۔

الطاف بھائی نے بھابی ریحام خان کی خدمت میں دوپٹے کا تحفہ پیش کرنے کی رومانوی فضا پیدا کر کے عمران خان کی انتخابی مہم کے غبارے سے پہلے روز ہی ہوا نکال دی تھی۔ پولنگ سے ایک روز پہلے دو سواریوں پر پابندی اور ووٹ ڈالنے کے لیے اصل شناختی کارڈ پیش کرنے کی شرط سے اس تاثر کو تقویت ملی کہ اسٹیبلشمنٹ ایم کیو ایم کی انتخابی طاقت پر ضرب لگانا چاہتی ہے۔ ضمنی انتخاب میں کوئی ۳۴ فیصد ووٹ پڑے اور بے ضابطگیوں کی بہت ساری شکایتیں سامنے آئیں جن سے الیکشن کمیشن میں بنیادی اصلاحات کی ضرورت کا احساس مزید شدت اختیار کر گیا ہے۔

ضمنی انتخابات میں جماعتِ اسلامی کی کارکردگی بڑی مایوس کن رہی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اپنی تقاریر اور تحریروں میں ایک بات بڑی صراحت سے بیان کرتے رہے کہ ہمیں سیاسی بقا اور نشوونما کے لیے ہوا اور روشنی کی طرح جمہوریت درکار ہے۔ اسی نظریے کے تحت جماعتِ اسلامی انتخابات میں حصہ لیتی رہی۔ قاضی حسین احمد (مرحوم) جب امیر بنے تو انھوں نے اس جماعت کو جو اقامتِ دین کے عظیم الشان نصب العین کے لیے اٹھی تھی، اسے اپنی ذاتی پالیسی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ وہ نواز شریف کو سخت ناپسند کرتے تھے، اس لیے انھوں نے ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں مسلم لیگ سے انتخابی اتحاد کرنے کے بجائے "اسلامی فرنٹ" کے نام سے انتخابات میں حصہ لیا اور تمام امیدوار شکست کھا گئے۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں اس نے متحدہ مجلسِ عمل کے پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لیا اور شاندار کامیابیاں حاصل کیں، مگر ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں قاضی صاحب نے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر کارکنوں میں بڑی مایوسی پیدا ہوئی اور ہم نے انھیں بڑے اضطراب کی حالت میں دیکھا۔ انھیں قلق یہ تھا کہ ہم نے ساٹھ سال کی محنت سے انتخابی سرمایہ جمع کیا تھا، وہ ضائع ہو جائے گا۔ ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں کراچی کے حلقہ ۲۴۶ میں جماعتِ اسلامی کے امیدوار کو پہلے دو گھنٹوں میں دس ہزار ووٹ پڑے اور خواتین و حضرات کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اچانک قیادت نے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ کارکنوں اور ووٹروں کو پیغام یہ ملا کہ جماعتِ اسلامی انتخابات میں سنجیدہ نہیں رہی، چنانچہ ضمنی انتخاب میں کارکن پوری طرح متحرک ہوئے نہ ووٹر چل کر اس کی طرف آئے۔ کراچی میں امن قائم کرنے کے لیے جماعتِ اسلامی کو بلدیاتی انتخابات میں پوری تیاری کے ساتھ حصہ لینا اور اس شہر کے بنیادی مسائل حل کرنے میں قائدانہ کردار ادا کرنا ہو گا۔ آسمان رنگ بدل رہا ہے اور ایم کیو ایم ایک سیاسی جماعت کے طور پر مثبت کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں آ رہی ہے اور تحریکِ انصاف کے لیے اپنے رویے بدلنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

◆◆◆

اسٹاک مارکیٹ تک رسائی کا آسان ذریعہ...

NI(U)T میں سرمایہ کاری

NIUT

سب سے بڑا اور سب سے زیادہ متنوع ایکوٹی فنڈ

کئی سال سے ڈیویڈنڈ کی مسلسل ادائیگی کا شاندار ریکارڈ

پیشہ ور، انتہائی تجربہ کار فنڈ منیجرز کی نگرانی

آپ کے سرمایہ میں اضافہ اور مسلسل منافع کے شاندار امکانات... اعداد و شمار کی روشنی میں

	FY 2005	FY 2006	FY 2007	FY 2008	FY 2009	FY 2010	FY 2011	FY 2012	FY 2013	FY 2014	*YTD 2015	[illegible]
NI(U)T (%)	35.67%	28.20%	44.53%	-4.15%	-41.48%	17.92%	24.30%	7.57%	56.42%	55.95%	6.71%	15.44%
KSE 100 (%)	41.12%	34.08%	37.83%	-10.77%	-41.72%	35.74%	28.54%	10.45%	52.20%	41.16%	1.60%	15.84%
Dividend Per Unit (Rs.)	3.3	5.80	6.50	5.50	2.25	2.25	4.00	3.50	3.75	4.50	-	-

*As on March 27, 2015 [illegible]

AMC Rating AM2 by PACRA

NIT
NATIONAL INVESTMENT TRUST LIMITED

UAN: 111-648-648 | Toll-Free: 0800-00648
Email: info@nit.com.pk | Website: www.nit.com.pk

Risk Disclaimer: All investments in mutual funds are subject to market risks. The NAV of units may go up or down based on the market conditions. Past performance is not necessarily indicative of the future results. Please read the Offering Documents to understand the investment policies & the risks involved.

www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر بشیر چودھری کا دعویٰ

میں نے کینسر کا مریض صحت یاب کر دیا

قدرتی طریق علاج سے موذی امراض کی تشخیص کرنے والے معالج کی معلومات افروز باتیں

الطاف حسن قریشی

گزشتہ دنوں ہمارے دوست ہاشمی صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے ایک ایسے ڈاکٹر سے ملاقات کرانے کی بات کی جو آنکھوں سے معلوم کر لیتے ہیں کہ جسم میں پائے جانے والے امراض کا سراغ لگاتے اور قدرتی طریقوں سے علاج کرتے ہیں۔ ہاشمی صاحب اکاؤنٹس کے پیچیدہ معاملات کے ماہر ہیں اور ہم ملاقاتی تھے۔ میں مقررہ وقت پر ان کے ہاں پہنچ گیا اور وہ مجھے بشیر احمد چودھری سے ملوانے لے گئے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ آپ ۱۹۲۵ء میں میرا انٹرویو لینے آئے تھے۔ تب میں پاک فضائیہ میں تھا۔ سب مختلف شعبوں میں ان سے مختلف باتیں ہوئی رہیں جن میں کئی دلچسپ باتیں سامنے آئیں۔

انھوں نے اپنی زندگی کے دلچسپ حالات بتاتے ہوئے کہا کہ میں جب پاک فضائیہ میں تھا تو میرے ائیر چیف ائیر مارشل نور خان سے تعلقات قدرے کشیدہ تھے۔ اس لیے میں نے استعفیٰ دے دیا۔ دوست احباب

www.pdfbooksfree.pk

نے مجھے پی آئی اے جوائن کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ میں قومی ائیر لائن میں چلا گیا۔ اسی دوران مجھے گٹھیا (آرتھرائٹس) نے آن دبوچا۔ ایک روز میں ہوائی جہاز سے نیویارک پہنچا اور وہاں سے جوں ہی ایئرپورٹ سے باہر نکلا تیز بارش ہو رہی تھی۔ میں آرام کرنے ہوٹل آ گیا۔ شام تک پہنچتے پہنچتے میں چلنے پھرنے سے بھی گیا۔ اگر اسی پر بڑھتا رہتا تو میں معذور ہو جاتا۔ اس سے قبل میں ورزش کیا کرتا اور روزانہ پیدل چلتا تھا۔ اس سے بڑھ کر میں تیز بھی دوڑ سکتا تھا۔ دو دن بعد میں بڑی مشکل سے اٹھ پایا۔

"جب مجھے گٹھیا میں شدید درد ہوتا تو ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے مجھے درد کش گولیاں دیں۔ وہ کھا کر میں چند دن ٹھیک ہو گیا۔ ایک ہفتہ وہ دوائی کھائی تو آرام رہا۔ جب دوائی چھوڑی تو درد پھر شروع ہو گیا۔ میں پھر اس مرض پر تحقیق کرنے لگا تا کہ اس کی وجہ جان سکوں۔ یہ تحقیق مجھے نیویارک کے ایک لائبریری لے گئی۔ تب تک میں گٹھیا کے علاج سے آگاہ نہیں تھا۔ وہاں میں نے ایک کتاب دیکھی جس کا عنوان تھا: ''Arthritis can be cured!'' (گٹھیا قابل علاج ہے)۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ آرتھرائٹس کیا چیز ہے۔ لہٰذا وہ کتاب خرید لی۔"

میں نے پوچھا: "آپ نے اس کتاب میں کیا خاص بات پائی؟"

ڈاکٹر امجد چودھری کہنے لگے: "اس میں مرض یعنی جوڑوں کے درد سے متعلق دوا کے بارے میں بہت عمدہ معلومات موجود تھیں۔ لہٰذا جیسے ہی میں نے وہ کتاب پڑھنی شروع کی تو مشغول ہو گیا۔ جیسے جیسے پڑھتا گیا، مجھے محسوس ہوا وہ میرے متعلق ہی لکھی گئی ہے۔ میں جن غلط عادات میں مبتلا تھا، وہ سب کا سب اس میں درج کی گئی تھیں۔

"اسی کتاب سے مجھے معلوم ہوا کہ گٹھیا چھونے کی ایک وجہ ذہنی دباؤ (Stress) بھی ہے۔ ڈاکٹر اسی دباؤ کا زیادہ شکار ہوتے ہیں، ان کے ہاں چھوٹی موٹی باتیں بھی بڑی بن جاتی ہیں۔ ذہنی دباؤ کی تعریف انسان کے قابو سے باہر ہے۔ اسے صرف اللہ تعالیٰ ہی دور کر سکتا ہے۔ میں آپ کو دونوں کی مثال دیتا ہوں جن کا ذہنی دباؤ سے تعلق ہو چکا۔ ایک مثال تو میں کر دوں گا۔ وہ جو چاہتا تھا اسے نہ ملا تو اس نے سوچا اور وہی پچھتاوا اسے کھا گیا۔ وہ بیمار ہو گیا۔ یہ اس کی شدید ذہنی پریشانی تھی، وہ چوٹ نہیں تھی۔ یہ دوسرا آدمی جس کا فیصلہ بھی دیر سے ہوا، وہ اپنے شدید ذہنی دباؤ کے باعث دل کا دورہ پڑنے سے اچانک چل بسا۔ اس مثال سے واضح ہے کہ ذہنی دباؤ جان لیوا کیفیت ہے۔

"مجھے مریض آ کر بتاتے ہیں کہ وہ رات بھر ساری رات کام کرتے رہتے ہیں۔ صبح جب ہم اٹھیں تو جسم تھکا تھکا محسوس ہوتا ہے۔ میں انھیں بتاتا ہوں کہ جب دماغ مطمئن نہ ہو تو جسم بھی پرسکون نہیں رہتا۔ ذہنی دباؤ ہر انسان کو بیمار کر دیتا ہے۔ مگر اسے دوا کے ذریعے کم کرنا ممکن ہے۔

"میرے پاس ایک ادھیڑ عمر خاتون شوہر کے ساتھ آئیں۔ انھوں نے بتایا: 'میں ذہنی دباؤ دور کرنے والی دوائیں بھی استعمال کر چکی ہوں، لیکن مجھے فائدہ نہیں ہوا۔' ان کے شوہر نے بتایا، بیماری کے باعث ان کی حالت یہ ہے کہ جیسے کوئی چیز چھت سے لٹکی ہو۔ یعنی جب انسان پریشان یا ذہنی دباؤ کا شکار ہو تو اس کی یہی حالت ہوتی ہے۔

"اس کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ نیویارک میں ایک ایسا کلینک ہے جہاں لوگ اس مرض پر قابو پانے جاتے

www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ وہاں بحران کا ایسا شافی علاج ہوتا ہے کہ مجھے تین ہفتوں میں وہ اپنے پیروں پر چل کے گھر جاتے ہیں۔ یورپ اور امریکا میں واقع ایسے کئی کلینکوں میں صرف قدرتی علاج کیا جاتا ہے۔ بہرحال اس کتاب کی مدد سے میں قدرتی طریق علاج کے ذریعے اپنی دیکھ بھال کرنے لگا۔ میں جلد اتنا تندرست ہو گیا کہ پندرہ سال بعد ٹینس کھیلنے لگا۔

"میں نے پھر قدرتی طریق علاج کا کورس کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ اصطلاح میں نیچروپیتھی (Naturopathy) کہلاتا ہے۔ نیویارک میں ایک ادارہ نیچروپیتھی کا کورس کراتا ہے۔ میں نے اس میں داخلہ لیا اور مقررہ مدت میں کورس کامیابی سے مکمل کر لیا۔ بعدازاں اس موضوع سے متعلق کتب بھی زیرِ مطالعہ رہیں۔

"جب میں کراچی سے لاہور منتقل ہوا تو ماڈل ٹاؤن میں مطب کھول لیا۔ لیکن اسے اس لیے بند کرنا پڑا کہ مریضوں کا ہجوم لگا رہتا اور مجھے قرآن کا مطالعہ کرنے کے لیے مناسب وقت نہ ملتا۔"

میں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا "آپ جڑی بوٹیوں کے ذریعے جو علاج کر رہے ہیں اس کی تعلیم کسی معیاری کالج سے حاصل کی ہے؟"

انھوں نے جواب دیا "ایک دفعہ پی آئی اے کی فلائٹ فرینکفرٹ، جرمنی گئی تو میں نے عملے سے پوچھا، یہاں کوئی ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہے؟ انھوں نے بتایا، یہاں ایک بہت بڑا ہومیوپیتھک ڈاکٹر تو ہے لیکن اس قدر مصروف کہ پہنچ ہی نہیں، وقت نہیں دیتا۔ ساتھ ہی انھوں نے بتایا کہ وہ آنکھ کے پردے دیکھ کر سارے طبی مسائل بتا دیتا ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت تعجب لگا۔ بعدازاں ایک مرتبہ میرے ہاتھ ایک کتابچہ لگا جس پر "آئریڈولوجی" (Iridology) درج تھا۔ اس میں بھی یہی لکھا تھا کہ آنکھ کے پردوں کا معائنہ کرنے سے تمام بیماریوں کا پتا چل سکتا ہے۔ جب میں نے پوری کتاب پڑھی تو میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میری بیٹی امریکی شہر ڈیلس میں رہتی ہے۔ تب میں اس کے پاس گیا ہوا تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ایک کالج میں آئریڈولوجی کا شعبہ قائم ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "آئریڈولوجی کس قسم کا علم ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "قدرتی طریق علاج کے بعض ماہر "پردہ چشم" (Iris) کا معائنہ کر کے ذہنی امراض کا پتا چلاتے ہیں۔ طبی اصطلاح میں یہ علم "آئریڈولوجی" کہلاتا ہے۔ اس طریق علاج میں پردہ چشم کے نمونوں، رنگوں اور دیگر خصوصیات کا جائزہ لے کر جانا جاتا ہے کہ انسان کو کس قسم کی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔

"یورپ میں یہ انکشاف بیسویں صدی سے پہلے ہی سامنے آ چکا ہے۔ لیکن اس طریق علاج کو اپنانے والوں کے مابین آپس میں رابطہ نہیں تھا۔ مثلاً ایک ماہر آئریڈولوجی آسٹریا میں ہے، دوسرا جرمنی اور تیسرا برطانیہ میں ہے۔ ہر کوئی اپنا اپنا کام کر رہا ہے لیکن وہ ایک دوسرے سے رابطے میں نہیں تھے۔ جب باہمی رابطے قائم ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان کا مشاہدہ، علاج اور نتائج تقریباً ایک جیسے ہیں۔ اب امریکا میں بھی یہ طریقہ علاج مروج ہے اور انھوں نے اس میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

"میں نے جب تین کالج میں داخلہ لینا چاہا تو انھوں نے کہا کہ آپ کو ڈاکٹر ہونا چاہیے، فلاں ڈگریاں ہونی چاہئیں۔ انھیں بتایا کہ میں نے تجربہ جتنی کا کورس کر رکھا ہے جس میں بنیادی طبی مضامین پڑھائے جاتے ہیں مثلاً اناٹومی، فزیالوجی وغیرہ۔ تب وہ مجھے داخلہ دینے پر رضامند ہوئے۔ یہ کورس ڈھائی سال کا تھا۔ اس میں اناٹومی، فزیالوجی وغیرہ مجھے سب طبی مضمون پڑھنے پڑے۔ میں نے ایک ڈاکٹر کو ٹیوٹر رکھا جس نے چھے ماہ تک مجھے یہ علم پڑھایا۔

"اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کو جانچنے پرکھنے کے کئی طریقے مقرر کیے ہیں۔ مثال کے طور پر چین میں کئی نظام ہائے علاج رائج ہیں۔ ان کے ہاں ۱۸ نبضیں ہیں، ۹ ایک طرف اور ۹ ایک طرف۔ زبان اور آنکھ سے وہ طبی معائنے میں مدد لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم کے کئی نظام بذریعہ اعصاب پردہ چشم سے ملا رکھے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب آپ اندھیرے سے نکل جائیں تو وہ پردہ کھل جاتا ہے تاکہ زیادہ روشنی آنکھ میں جائے۔ جب آپ سورج کے سامنے جاتے ہیں تو بند ہو جاتے ہیں۔

میں نے دریافت کیا کہ ذیابیطس کے مریض کا علاج آپ کس طرح کرتے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب کا طریق علاج دوسروں سے مختلف تھا۔ انھوں نے بتایا:

"اکثر ڈاکٹر یہ غلط فہمی پھیلاتے ہیں کہ شوگر میں شہد استعمال نہ کیجیے، پھل نہ کھائیں اور فلاں چیز نہ کھائیے۔ میں اپنے مریضوں کو شہد کھلاتا ہوں۔ لیکن شہد اصلی ہونا چاہیے۔ میرے مریضوں کا بیان ہے، اگر ہم روزانہ تین چار بڑے چمچ شہد کے نہ کھائیں تو ہماری شوگر کنٹرول میں نہیں رہتی۔ یقین کیجیے شہد بناتی شوگر والوں کے لیے ہے۔

"قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان! جیسے میں نے تمھیں بنایا، اسی طرح میں نے ان پودوں کو بنایا ہے۔ پوری کائنات کی تخلیق میں مجھے سات دن اور سبزیوں اور پودوں کو بنانے میں مجھے تین دن لگے۔" یہ پڑھ کر میں حیران ہوا اور سوچا کہ پوری کائنات کی تخلیق کے مقابلے میں پودوں کو تین دن تک بنانے میں خاصا وقت لیا گیا۔ اس میں یقیناً کوئی حکمت ہوگی۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ جتنے نظام انسانی جسم کے اندر ہیں، اتنے ہی پودوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ہمارے جسم میں تقریباً یہی نظام پائے جاتے ہیں۔"

میں نے دریافت کیا، سنا ہے، جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والے ڈاکٹر کورٹی زون (Cortisone) سٹیرائڈ ہارمون استعمال کرتے ہیں؟ جواب میں ڈاکٹر صاحب ایک دلچسپ قصہ سنانے لگے:

"میرا دوست مجھے ایک دفعہ سفر کے دوران مل گیا اور اس نے مجھے اپنی صحت کے مسائل بتائے۔ میں نے اسے اپنے کلینک کا پتا دیا۔ وہ چند روز بعد میرے پاس آیا۔ وہ طبی مزاج رکھتا تھا۔ میں نے اسے تین چار مختلف دوائیوں کا مرکب بنا کر دیا۔ اس نے جا کے لیب میں ان کا ٹیسٹ کرایا۔ ایک ہفتے بعد میرے پاس آیا اور کہا، چودھری صاحب! آپ دوائیوں میں کورٹی زون ڈالتے ہیں۔ میں نے اس دوائی کا لیب میں ٹیسٹ کرایا، تو رپورٹ میں آیا ہے۔

"یہ سن کر میں بڑا پریشان ہوا۔ پھر وہ تو بحث کر کے چلا گیا۔ میں جس سے دوائی لیتا ہوں، انھیں فون کیا کہ اس طرح کی شکایت آئی ہے۔ انھوں نے کہا، آپ آئیے، ہم آپ کو لیب میں چیک کراتے ہیں۔ پھر مجھے اچانک ایک خیال آیا اور میں نے وہ دوائی اٹھا کر دیکھی جو اسے دی تھی۔ اس مرکب میں شامل ایک دوائی قدرتی طور پر کورٹی زون رکھتی تھی۔ یہ ملٹھی میں پائی جاتی ہے۔"

میں نے پوچھا "تجربہ جتنی کی یونیورسٹی یا کالج میں

www.pdfbooksfree.pk

پڑھائی جاتی ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے تفصیل سے بتایا "اس کے اپنے نسخوں کا ذکر ہیں جو عموماً یونانی مکاتب والے ہیں۔ ان کے ریسرچ سنٹر بھی ہیں۔ شاید جلد ہی ایسا دور آ جائے جب یہ علم یونیورسٹیوں میں بھی پڑھایا جانے لگے۔

"ایک دفعہ میرے پاس سرطان کا مریض آیا۔ یہ چند سال پرانی بات ہے۔ شوکت خانم اسپتال والوں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا تھا اور کہا کہ آپ کی زندگی تھوڑی باقی رہ گئی ہے۔ یہ شخص میرا پہلا مریض تھا۔ تب تک میں نے سرطان کے حوالے سے بہت ساری کتابیں پڑھ لی تھیں۔ اس بیماری کے علاج سے متعلق یہ علم تو تھا مگر تجربہ نہیں تھا۔

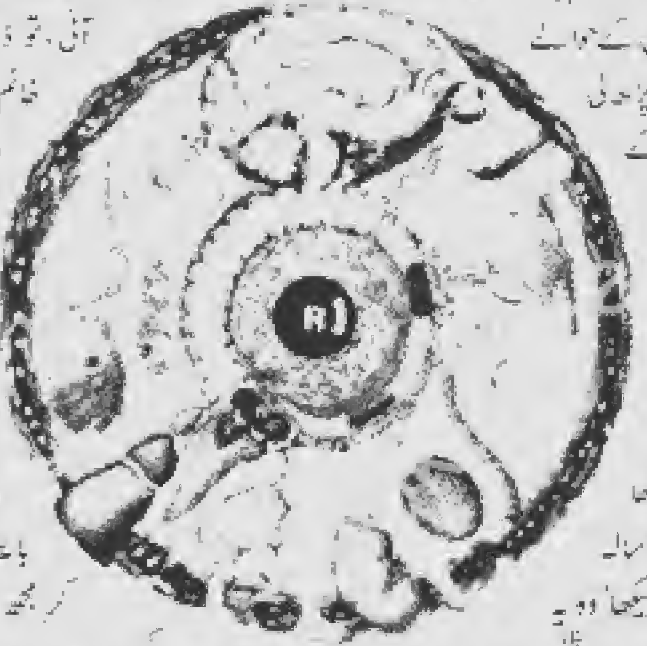

"امریکا کے ایک مشہور ماہر امراض سرطان، ڈاکٹر جان ایلی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی ۳۰ سالہ طبی زندگی سے جو کچھ سیکھا وہ یہ کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ ظلم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ۹۰ فیصد ایسے لوگ آتے ہیں جن کو سرطان ہوتا ہی نہیں۔ جب ہم بلڈ ٹیسٹ کرتے ہیں، تو انھیں سرطان ہو جاتا ہے۔ اس نے پھر سرجری چھوڑ دی اور لوگوں کا قدرتی طریقے سے علاج معالجہ کرنے لگا۔

"وہ کتاب پڑھنے کے بعد مجھ میں خود اعتمادی آئی اور میں نے اس کتاب سے کافی کچھ سیکھا۔ میرے پاس جو سرطان کا پہلا مریض آیا وہ بوڑھا تھا۔ شوکت خانم اسپتال والے لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ تاہم میں نے اس کا علاج کیا۔ اللہ نے اسے شفا دی اور چار پانچ ماہ میں وہ کافی حد تک صحت یاب ہو گیا۔

"ایک دفعہ ان کی بچی وہاں بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ بیٹے! آپ کے ابو ماشاءاللہ ٹھیک ہیں لیکن احتیاطاً آپ ان کا چیک اپ کرا لیں۔ وہ اپنے والد کو انمول اسپتال لے گئی۔ چیک اپ کے بعد وہ گھر آئی تو اس نے کہا کہ والد صاحب کا چیک اپ کرایا، الحمدللہ تمام ٹیسٹ ٹھیک آئے ہیں۔

"اس نے مزید بتایا کہ جب ٹیسٹ کی رپورٹ آئی تو ڈاکٹر نے تازہ اور شوکت خانم اسپتال والی پرانی رپورٹ کا موازنہ کیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہوا کہ جسم میں سرطانی خلیے ختم ہو چکے۔ لہٰذا وہ رپورٹیں لے کر دوسرے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اس سے بات چیت کرنے کے بعد آ کر مجھ سے پوچھا کہ آپ نے کہیں سے کیا علاج کرایا ہے؟ لڑکی نے جواب دیا کہ ہاں ہم نے دیسی علاج کروایا ہے۔ ڈاکٹر کہنے لگا کہ کیمو تھراپی ایسے علاج سے یہ مرض ٹھیک نہیں ہوتا۔ یہ خود بخود قدرتی طور پر ہی ختم ہو گیا۔ حالانکہ وہ مریض علاج سے تندرست ہوا۔"

ڈاکٹر صاحب سے دوبارہ ملاقات کا وعدہ لے کر ہم شام کے وقت چلے آئے۔ امید ہے کہ دوسری ملاقات میں وہ ہمیں علم آیورویدک کے متعلق مزید دلچسپ معلومات فراہم کریں گے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

براور اسلامی ملک

یمن خانہ جنگی کا نشانہ کیسے بنا؟

اقتدار و طاقت کے نشے میں مست سابق یمنی حکمران کی عبرت ناک داستان

محمد علی صدیقی

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یمن والے شریف النفس اور نرم دل کے لوگ ہیں۔ وہ ایمان اور دانش میں اپنی مثال آپ ہیں۔'' (صحیح بخاری)

یہ شاید یمنی عوام کی نرم خوئی اور شریف النفسی ہی ہے جس سے خصوصاً یمن کے سابق حکمران علی عبداللہ صالح نے ناجائز فائدہ اٹھایا جو ایک شاطر و چالاک انسان ہے۔ غیر ہاشمی زیدی شیعہ شمالی یمن میں پیدا ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں جب صرف اٹھارہ سال کا تھا، تو فوج کا حصہ بنا۔

www.pdfbooksfree.pk

افسروں کی چاپلوسی کرنے کے باعث تیزی سے ترقی کی یہاں تک کہ ۱۹۷۸ء میں شمالی یمن کا صدر بن گیا۔

اس زمانے میں جمہوریہ یمن شمالی اور جنوبی، دو حصوں میں تقسیم تھا۔ شمالی یمن کی ۷۰ فیصد آبادی زیدی شیعہ تھی۔ جبکہ جنوبی یمن میں آباد ۹۰ فیصد مسلمان سنی شوافع تھے۔ یہ دونوں پڑوسی ریاستیں امن اور جنگ کے ادوار سے گزریں۔ آخر ۱۹۹۰ء میں دونوں ریاستوں کا ادغام ہو گیا۔

اس وقت اور آج بھی ۸۰ فیصد یمنی کسی نہ کسی قبیلے سے وابستہ ہیں۔ ان قبائل کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ ایک قبیلے سے وابستگی یمنی شہری کو نہ صرف تحفظ فراہم کرتی بلکہ اسے بارزگار ہونے میں بھی مدد دیتی ہے۔

جب دونوں ریاستوں کا ادغام ہوا، تو یمنی آبادی میں سنیوں کی اکثریت ہو گئی۔ ۵۶ فیصد یمنی سنی، ۴۲ فیصد زیدی شیعہ اور ۲ فیصد اسماعیلی، اثنا عشری شیعہ تھے۔ لیکن سنیوں میں اتحاد نہ تھا اور وہ کئی قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے جو مختلف اختلافات کے باعث آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف زیدی شیعہ صرف تین بڑے قبائل..... بکیل، حاشد اور مذحج کی صورت متحد ہیں۔ یہ صورت حال آج بھی زیادہ تبدیل نہیں ہوئی۔

۱۹۹۰ء میں علی عبداللہ صالح نے ایک طرف حاشد اور بکیل کو ساتھ ملایا، دوسری طرف جنوبی یمن کے بعض سنی قبائل کی حمایت بھی حاصل کر لی۔ اس نے زیدی شیعہ و سنی قبائل کے سرداروں کو خوب انعام و اکرام سے نوازا اور یوں ان کی مدد پانے میں کامیاب رہا۔ انہی قبائل کی حمایت سے وہ متحدہ ملک، جمہوریہ یمن کا صدر بن گیا۔

علی عبداللہ صالح نے پھر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کی خاطر دو بنیادی اقدامات کیے۔ اول قبائلی سرداروں کو اپنی مٹھی میں رکھنے کے لیے انھیں انعام و اکرام سے نوازتا رہا۔ دوم اس نے حکومت اور فوج کے کلیدی عہدوں پر اپنے رشتے دار، دوست احباب تعینات کر دیے۔ انہی اقدامات کے ذریعے وہ آمرانہ و شاہانہ انداز میں حکمرانی کرنے لگا۔

بعدازاں یمن کے سیاہ و سفید کا مالک اور مطلق العنان سربراہ بن کر وہ کرپشن میں لتھڑ گیا۔ ہر سرکاری منصوبے میں علی عبداللہ صالح کا کمیشن مخصوص تھا۔ چناں چہ سرکاری آمدن صدر اور اس کے حواریوں میں تقسیم ہونے لگی۔ یمنی عوام ماضی کی طرح پس ماندہ اور زندگی کی بنیادی سہولیات سے بھی محروم رہے۔

جس طرح گرگٹ رنگ بدلتا ہے، علی عبداللہ صالح اسی طرح اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے کبھی روس کا طرف دار بن جاتا۔ کبھی امریکا کی غلامی کرتا اور کبھی سعودی عرب کی چاپلوسی کرنے لگتا۔ یوں اپنے تیکھے بہاؤں، سازشوں اور ہتھکنڈوں سے وہ ۲۰۱۱ء تک حکومت کرتا رہا۔

۲۰۱۱ء میں جب بڑھاپے نے دستک دی، تو علی عبداللہ صالح نے اپنے بیٹے، جنرل علی صالح کو جانشین بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ جنرل علی یمنی فوج کے سب سے طاقتور دستے، ریپبلکن گارڈ کا سربراہ تھا۔ لیکن ایک تیونسی پھیری والے کی خودسوزی نے صدر علی عبداللہ صالح کے عزائم خاک میں ملا دیے۔

بوعزیزی کی خودسوزی سے جس "عرب بہار" کا آغاز ہوا، وہ اوائل ۲۰۱۱ء میں یمن تک آ پہنچی۔ یمنی عوام مہنگائی اور بیروزگاری کے ہاتھوں ستائے ہوئے تھے۔ وہ بھی تیونسی شہریوں کی طرح حکومت کے خلاف احتجاج کرنے لگے۔

۲۰۰۴ء سے جنوبی یمن میں جاری القاعدہ اور سرکاری فوج

www.pdfbooksfree.pk

کی گرانی سے عوام کی مشکلات بڑھ رہی تھیں۔

اس دوران سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی کہ کئی اور ن شد قبائل کے سردار صدر علی عبداللہ صالح کے مخالف بن گئے۔ چناں چہ وہ صدر کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے لگے۔ ایک قاتلانہ حملے میں صدر بال بال بچا۔ آخر سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک کی مداخلت پر اس نے نومبر ۲۰۱۱ء میں اپنے تینتیس سالہ اقتدار کو خیرباد کہہ دیا۔

علی عبداللہ صالح نے اقتدار اپنے نائب عبدربہ منصور ہادی کے سپرد کیا۔ منصور ہادی ۱۹۹۴ء سے یمن کے نائب صدر چلے آ رہے تھے۔ وہ ایک سنی العقیدہ مسلمان ہیں۔ اقتدار سنبھالتے ہی وہ ملک میں قومی اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔

سابق صدر علی عبداللہ صالح نے اپنی شرائط منوا کر اقتدار چھوڑا تھا۔ لیکن آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ "یمنی لومڑی" کی چال تھی۔ دراصل یمنی پارلیمان میں اس کی (حکمران) پارٹی، جنرل پیپلز کانگرس کے ارکان کی اکثریت تھی۔ لہٰذا جنوری ۲۰۱۲ء میں پارلیمان نے یہ قرارداد منظور کر لی کہ علی عبداللہ صالح پر کوئی مقدمہ نہیں چلے گا۔ بعد ازاں پارٹی کا نیا صدر بھی منتخب کر لیا گیا۔

صدر عبدربہ منصور ہادی کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ کئی اہم سرکاری عہدوں پر علی عبداللہ صالح کے حواری فائز ہیں۔ لہٰذا حکمرانی کرنے کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس حقیقت نے نئے صدر کو سابق حکمران کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

نئے یمنی صدر کی بدقسمتی تھی کہ وہ بیشتر سنی قبائل کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں رہے۔ وجہ یہ کہ علی عبداللہ صالح نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ اس نے جنوبی یمن میں زیدی شیعہ قبائلی سرداروں کو وسیع زرخیز علاقے دیے جہاں وہ بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔ نیز اکثر ترقیاتی منصوبے شمالی یمن ہی میں انجام پائے۔

سابق یمنی صدر کی یک رخی پالیسی کے باعث ۱۹۹۴ء ہی میں جنوبی یمن کے سنی قبائل نے علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ علی عبداللہ صالح بہ مشکل اس بغاوت کو دبا سکا۔ لیکن آج بھی جنوبی یمن میں بعض سنی قبائل نے علیحدگی کی تحریک چلا رکھی ہے۔

صدر منصور ہادی رفتہ رفتہ حکومت اور فوج میں اپنا اثرورسوخ بڑھاتے چلے گئے۔ اس امر نے علی عبداللہ صالح کو چوکنا کر دیا اور اسے اپنا اثرورسوخ ختم ہوتا محسوس ہوا۔ چناں چہ سابق اور حاضر صدور کے مابین چپقلش کا آغاز ہوا۔ امریکا اور سعودی عرب صدر ہادی کے حامی تھے کیونکہ انھوں نے جنوبی یمن میں القاعدہ کے خلاف بھرپور عسکری مہم چھیڑ رکھی تھی۔

آہستہ آہستہ صدر منصور ہادی کو احساس ہوا کہ اپنی حکمرانی مضبوط بنانے کے لیے ضروری ہے کہ فوج اور حکومت میں علی عبداللہ صالح کے کارندے برطرف کیے جائیں۔ چناں چہ وہ مختلف حیلے بہانوں سے انھیں گھر بھجوانے لگے۔ اس جرأت مندانہ مہم کا نقطہ عروج مارچ ۲۰۱۳ء میں اس وقت دیکھنے کو ملا جب ری پبلکن گارڈز توڑ دی گئی۔

اس اقدام سے علی عبداللہ صالح کی عسکری قوت کم کرنا مقصود تھا۔ اس نے جو اپنی طاقت پر ضرب پڑتے دیکھی تو کھل کر صدر ہادی کے خلاف میدان میں اتر آیا۔ اس نے پھر ایسی شاطرانہ چال چلی کہ اپنے مفادات کو تحفظ دینے کی خاطر ملک و قوم کو خانہ جنگی کی آگ میں دھکیل دیا۔

ہوا یہ کہ شمالی یمن کے بالائی پہاڑی علاقوں میں زیدی شیعوں کا ایک گروہ، حوثی، طویل عرصے سے عبداللہ

عدن کی حکومت سے خوف زدہ رہا۔ حوثی رفتہ رفتہ طاقت پکڑتے گئے اور ۲۰۱۳ء تک بالائی شمالی یمن کے کئی صوبوں میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

یہ اپنی طاقت کو دوام بخشنے کی خاطر ہی عبداللہ صالح نے حوثیوں کو ابھارا کہ وہ یمن کی حکومت پر قبضہ کر لیں۔ یمنی فوج میں افسروں اور جوانوں کی اکثریت علی عبداللہ صالح کی حامی تھی۔ لہٰذا ان کی خدمات بھی حوثیوں کے حوالے کر دی گئیں۔ عسکری حمایت پا کر ہی حوثی اس قابل ہوئے کہ وہ حکومت صنعا کی سمت پیش قدمی کر سکیں۔

ادھر صدر منصور ہادی سابق صدر کی سیاسی و عسکری تدبیروں سے کمزور ہوتے گئے تو خود بخود ان کی حکومت کمزور ہوتی گئی۔ چنانچہ ستمبر ۲۰۱۴ء میں حوثیوں نے صنعا پر قبضہ کر لیا۔ صدر ہادی نے کوشش کی کہ حوثیوں کو اقتدار میں شریک کر لیں۔ مگر انھیں دھوکے کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں جان بچا کر وہ پہلے عدن اور پھر مارچ ۲۰۱۵ء میں سعودی عرب میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

فروری ۲۰۱۵ء میں حوثیوں کے لیڈر محمد علی حوثی نے یمنی حکومت چلانے کے لیے ایک انقلابی کمیٹی تشکیل دی اور یمن میں اقتدار سنبھال لیا۔ تاہم یمنی قبائل نے حوثی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اب حوثیوں نے عدن کی طرف پیش قدمی کی۔ یمنی قبائل کو تحفظ دینے کی خاطر ۲۵ مارچ سے سعودیہ اور دیگر عرب ممالک کے طیارے حوثیوں کے فوجی ٹھکانوں پر حملے کرنے لگے۔

جب حوثی فوج نے عدن کا محاصرہ کیا تو وہاں بڑی تعداد میں پاکستانی بھی مقیم تھے۔ ان پاکستانیوں کو وطن لانے کے لیے خصوصی اقدامات کرنا پڑے۔ یہ سطور تحریر ہوئے تک عدن میں منصور ہادی کی وفادار فوج، قبائل اور حوثیوں کے مابین جنگ جاری ہے۔

مغربی میڈیا نے بالخصوص یہ دعویٰ کیا کہ ایران حوثیوں کو عسکری و مالی امداد فراہم کر رہا ہے۔ گو ایرانی حکومت نے اس دعویٰ کو بے بنیاد قرار دیا ہے، تاہم یہ سچ ضرور ہے کہ وہ یمنی حوثیوں کی حمایت کرے گی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امریکا حوثیوں کا مخالف ہے۔

سعودی عرب نے ایک تو یمن میں ایرانی اثرات پھیلنے سے روکنے پر حملے کیے۔ دوسرے شاہ سلمان اپنے محبوب بیٹے محمد بن سلمان کو ہیرو بنانا چاہتے تھے۔ محمد ان دنوں ریاست کے کم عمر ترین وزیر دفاع ہیں۔ سعودی افواج انھی کی ہدایات میں یمن پر حملہ آور ہوئیں۔

یہ درست ہے کہ حوثی یمن میں بنیادی طور پر مقبول تنظیم ہے۔ تاہم علی عبداللہ صالح کی حکومت کے ساتھ گٹھ جوڑ نے اسے فرقہ وارانہ تحریک میں بدل ڈالا۔ حوثی حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ یمن میں کرپٹ نظام حکومت ختم کر کے عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کرنا چاہتی ہے۔ لیکن یمنی قبائل خصوصاً حوثی حکومت دیکھنے کو تیار نہیں اور انھیں باغی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا صورت حال دیکھتے ہوئے یمنی خانہ جنگی کا کوئی اختتام نظر نہیں آتا۔

اس صورت حال میں علی عبداللہ صالح کوشش کر رہا ہے کہ اب اپنے بیٹے احمد کو یمنی حکمران بنوا سکے۔ وہ اسے سب کے لیے قابل قبول حل کی صورت پیش کرنے کی کوشش میں ہے۔ اب یہ وقت ہی بتائے گا کہ یمن میں اپنے خاندان کا اقتدار بحال کرنے کے لیے علی عبداللہ صالح نے جو شاطرانہ کھیل کھیلا، اس میں اسے کامیابی ملتی ہے یا نہیں۔ اس کھیل نے بہرحال یمن کو تباہی و بربادی کے گڑھے میں ضرور دھکیل دیا ہے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

قاضیِ وقت الجھن میں......

خزانے کا مالک کون؟

اس عاقل ملازمہ کی کتھا جس نے قانونی پیچیدگی عقل کے سہارے حل کر ڈالی

بشیر احمد بھٹی

یہ اس زمانے کی بات ہے جب اسلامی ممالک میں مقدمات کے فیصلے قاضی کرتے تھے۔ قاضیوں کی بھرپور کوشش ہوتی کہ کوئی شخص اپنے حق سے محروم نہ رہے۔ وہ ہر فیصلہ حق بجانب کرنے کی سعی کرتے۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل قاضی رات بھر جاگتا۔ قانونی کتابوں کا مطالعہ کر مقدمہ کے حقائق تلاش کرتا تاکہ ناانصافی نہ ہو۔ بعض زندہ ضمیر قاضی اسی کوشش میں اکثر اپنی صحت بھی کھو بیٹھتے تھے۔

ایک بار ایک قاضی کی عدالت میں عجیب نوعیت کا مقدمہ آیا۔ دو آدمیوں کے مابین فیصلہ ہونا تھا۔ مقدمہ ذرا پیچیدہ قسم کا تھا۔ ایک غریب آدمی نے ایک امیر سے مکان خریدا۔ غریب آدمی کا نام عبدل اور امیر کا محمود تھا۔ عبدل نے محنت کر کے پیسا کمایا تھا۔ اسی پیسے سے اس نے محمود سے مکان خرید لیا۔

عبدل مکان کی مرمت کرانے کا خواہش مند تھا۔ اسی سلسلے میں کھدائی جاری تھی کہ ایک کمرے میں زیرِ زمین سے خزانہ نکل آیا۔ جب محمود کو یہ علم ہوا کہ مکان سے خزانہ نکلا ہے، تو وہ عبدل سے تقاضا کرنے لگا "اس خزانے پر میرا حق ہے۔ میں نے تجھے مکان بیچا تھا، خزانہ نہیں۔ لہٰذا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ خزانہ میرے حوالے کر دو۔"

جبکہ عبدل کا موقف یہ تھا "مکان میں نے خریدا ہے۔ اب اس کے اندر پتھر، روڑا، اینٹ، خزانہ، جو کچھ بھی ہے اس پر میرا حق ہے۔ کیونکہ میں تمہیں رقم ادا کر چکا۔"

اس بات پر دونوں فریقین میں کافی بحث و مباحثہ ہوا۔ لڑائی جھگڑے تک نوبت آگئی۔ محلے

www.pdfbooksfree.pk

سے چند شرفا نے محمود کو مشورہ دیا کہ لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں، تم شہر کے قاضی سے رجوع کرو۔ وہاں سے جو فیصلہ صادر ہو، اس کے مطابق عمل کر لیا جائے۔ قاضی اگر یہ فیصلہ کرے کہ خزانہ مکان فروخت کرنے والے کا ہے، تو خزانہ محمود لے۔ اگر قاضی یہ فیصلہ کر دے کہ خزانہ مکان خریدنے والے کا ہے، تو وہ عبدل کا ہوا۔ محلے داروں کے مشورے پر محمود نے قاضی وقت کی عدالت میں مدعا علیہ بن کر تمام حقائق لکھ درخواست دائر کر دی۔

قاضی سلطان احمد نے درخواست کے تمام متن پر غور کیا اور چکرا کر رہ گیا۔ یہ بڑا عجیب نوعیت کا مقدمہ تھا۔ اس وقت قاضی باضمیر تھے۔ وہ اسلامی تعلیمات سے بھی بھرپور واقفیت رکھتے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا ہے جہاں انصاف کا بول بالا ہو گا۔ کل بھر کسی سے زیادتی نہ ہوگی۔ ہر آدمی کے اعمال نامے کے مطابق اسے جزا اور سزا ملے گی۔ دنیاوی عدالتوں میں جو ناانصافیاں ہوں گی، ان کا بھی حساب دینا ہوگا۔

قاضی سلطان احمد ایک بار جو فیصلہ صادر کرتے، اس سے قبل تمام معاملے کی خوب چھان پھٹک کرتے تھے تاکہ کسی فریق کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ انھوں نے محمود کی درخواست کا جائزہ لینے کے بعد عبدل کو عدالت میں طلب کیا۔ فریقین کی بات غور سے سنی اور چند دن بعد عدالت میں پیشی کی انھیں تاریخ دے دی۔ وہ قانونی کتب سے مقدمے کے سلسلے میں دلائل اور حقائق کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔

کیس خاصا گمبھیر تھا۔ قاضی سلطان احمد کے لیے یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور پیچیدہ مقدمہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس خزانے پر اصل حق کس کا بنتا ہے ... مکان فروخت کرنے یا مکان خریدنے والے کا حق؟ دونوں کی حق تلفی سلطان احمد کو کھٹک رہی تھی۔ کسی کے ساتھ بھی ناانصافی ہوئی، تو اس کا تمام وبال قاضی سلطان احمد کے کاندھوں پر ہوتا۔ یہی بات انھیں پریشان کر رہی تھی۔

اصل حق دار اگر خزانے سے محروم ہو جاتا، تو یقیناً یہ سراسر زیادتی ہوتی۔ اس لیے جو بھی فیصلہ کرنا تھا، کافی سوچ بچار کے بعد وہ اسے اپنانا چاہتے تھے تاکہ حقدار کو اس کا حق مل جائے۔ سلطان احمد کی نیند اڑ گئی۔ گھر میں رکھی ہوئی تمام قانونی کتابوں کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ بہرکیف وہ ان کا مطالعہ کرنے لگے۔ وقت بہت ہی کم تھا۔ پیشی کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ کٹھن تھا۔

قاضی سلطان احمد عجیب الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ تمام کتابوں میں اس قسم کے مقدمے کی کوئی حتمی دلیل انھیں نہ مل سکی۔ وہ جب کسی کتاب کا مطالعہ کر کے اسے بند کرتے، تو سوچنے بیٹھ جاتے کہ کیا میں اس مقدمے کا فیصلہ کرنے سے عاجز ہوں؟ تب کیسا قاضی ہوا؟

قاضی سلطان احمد کے پاس ایک ملازمہ کام کرتی تھی۔ وہ عاقل و دانا تھی۔ رات کو سونے سے قبل قاضی صاحب گرم دودھ کا ایک پیالہ پی کر سوتے تھے۔ یہ ان کی عادت تھی۔ رات کو ملازمہ دودھ کا پیالہ لے کر آئی، تو اس نے دیکھا، قاضی صاحب لالٹین کی روشنی میں ایک موٹی سی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کا تمام دھیان کتاب کی طرف تھا۔ ملازمہ نے پیالہ میز پر رکھ دیا۔

وہ چند راتوں سے دیکھ رہی تھی کہ قاضی صاحب بہت زیادہ مطالعے میں مصروف ہیں۔ یقیناً کوئی ایسا مسئلہ ہے جو ان سے حل نہیں ہو رہا۔ ملازمہ پہلے تو ٹکٹکی باندھے مالک کو تکتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی "محترم قاضی صاحب! دودھ کا پیالہ میں نے میز پر رکھ دیا ہے۔ یہ بتانے کی جسارت اس لیے کی ہے کہ کہیں بے خیالی میں آپ کا ہاتھ پیالے سے نہ ٹکرا جائے۔ اس طرح وہ نیچے گر سکتا ہے۔"

قاضی صاحب نے کتاب بند کر کے ملازمہ کی طرف نگاہ کی اور بولے "ٹھیک ہے۔ تم جاؤ، آرام کرو۔"

ملازمہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ڈرتے

www.pdfbooksfree.pk

ڈرتے قاضی صاحب سے کہا "اگر آپ ناراض نہ ہوں، تو ایک سوال کر سکتی ہوں؟"

وہ بولے "ہاں ہاں، کیوں نہیں، پوچھو کیا پوچھنا ہے؟"

ملازمہ بولی "جناب میں چند راتوں سے یہ دیکھ رہی ہوں کہ آپ پوری رات جاگ کے کتب بینی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ بتائیں گے۔"

وہ مسکرائے اور بولے "تم جانتی تو ہو میں قاضی ہوں۔ میری عدالت میں مختلف نوعیت کے مقدمے آتے رہتے ہیں۔ بعض اس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں کہ راتوں کی نیند اور دن کا قرار ختم کر دیتے ہیں۔"

انھوں نے پھر ملازمہ کو سارا واقعہ سنایا۔ وہ دبے لفظوں میں بولی "قاضی صاحب! یہ تو معمولی مقدمہ ہے۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ اپنا سکون غارت کر دیا۔ اتنے چھوٹے سے مسئلے کو آپ نے پیچیدہ قرار دے ڈالا۔ لو یہ کوئی انہونی بات تو نہیں، جس کے لیے آپ کئی راتوں سے شب بیداری کر رہے ہیں۔ پہلے ہی روز مجھے یہ بتا دیتے، تو میں آپ کو بتاتی کہ اس خزانے پر کس کا حق ہے؟ مکان خریدنے یا بیچنے والے کا۔" یہ کہہ کے ملازمہ خاموش ہو گئی۔

قاضی صاحب حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں کھانے لگے۔ سوچنے بیٹھ گئے "کمال ہے کل کی چھوکری اور اتنا بڑا بول کہ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میں نے قانون کی تمام کتابیں کھنگال ڈالیں اور کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا اور اس نے کھڑے کھڑے اس مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا۔ حیرت ہے بھئی۔ ذرا سنوں تو یہ کیا کہتی ہے؟ بات ہے بڑی عجیب سی! دیکھوں تو سہی اس کے دماغ میں کیا چھپا ہے جو اس نے چند ثانیوں میں چٹکی بجاتے ہی گمبھیر مسئلے کا حل تلاش کر لیا۔ اگر بات میری سمجھ میں آئی تو اس کے مطابق میں فیصلہ کر دوں گا۔"

وہ ملازمہ سے بولے "ہاں میری بچی، تمھیں اجازت ہے۔ کھل کر بتاؤ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟"

ملازمہ نے لہجہ دھیما رکھا اور قاضی صاحب کو ایک ایسی مثال دی کہ وہ ششدر رہ گئے۔ لڑکی نے واقعی مسئلے کو حل کر دیا۔ وہ مطمئن ہو گئے۔ فریقین نے دو دن بعد عدالت میں پیش ہونا تھا۔ قاضی صاحب اتنے خوش ہوئے کہ ملازمہ سے کہا "یہ دودھ کا پیالہ اٹھاؤ، اسے دوبارہ گرم کرو اور نوش کر لو۔"

لڑکی نے ذرا تذبذب سے کام لیا، تو قاضی صاحب نے فرمایا "یہ ہمارا حکم ہے کہ یہ دودھ اب تم نوش کرو۔ آج رات ہم بغیر دودھ پیے سوئیں گے۔"

ملازمہ نے پیالہ اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

قاضی صاحب نے لالٹین بجھائی اور اطمینان سے سو گئے۔ پیشی والے دن قاضی سلطان احمد عدالت پہنچے۔ دونوں فریق بھی فیصلہ سننے کے لیے موجود تھے۔ قاضی صاحب نے فیصلہ سنا دیا۔ وہ بولے "جس شخص نے مکان خریدا خزانہ اسی کا ہے۔"

یہ فیصلہ سن کر محمود کچھ کلملایا۔ پوچھا کہ یہ فیصلہ کس بنیاد پر ہوا ہے؟ قاضی صاحب نے ملازمہ کی بیان کردہ مثال دہرا دی۔ اسے سن کر محمود بھی گنگ رہ گیا اور اسے قاضی کا فیصلہ تسلیم کرنا پڑا۔

ملازمہ نے جو مثال دی اب وہ ملاحظہ فرمائیے:

ملازمہ نے قاضی صاحب سے کہا "جناب فرض کیا آپ کے پاس مرغی ہے۔ آپ نے وہ مرغی کسی شخص کو فروخت کر دی۔ خریدار مرغی اپنے گھر لے گیا۔ دوسرے روز مرغی نے اس کے گھر سونے کا انڈا دیا۔ وہ انڈا آپ کا ہوگا یا خریدار کا؟"

وہ بولے "ظاہر ہے، وہ انڈا خریدار کو ملے گا۔"

لڑکی بولی "تو جناب یہ خزانہ بھی اب اس شخص کا ہے جس نے مکان خریدا۔"

مثال اتنی قوی ثابت ہوئی کہ قاضی صاحب انگشت بدنداں رہ گئے۔

◆◆◆

کافر گھرانے میں جنم لینے والا

ہندو جو مسلمان ہو کر پروفیسر بنا

سید الانبیاؐ کی نظرِ عنایت نے راہ سے بھٹکے ایک نوجوان کو ہدایت دے دی.... ایمان افروز آپ بیتی

پروفیسر غازی احمد

میں ۱۹۲۲ء میں ضلع جہلم (اب چکوال) کے دور افتادہ گاؤں، میانی میں ایک ہندو خاندان کے گھر پیدا ہوا۔ والدین نے میرا نام کرشن لال تجویز کیا۔ خاندان کے تمام افراد سناتن دھرمی عقائد کے مالک تھے۔ شروع شروع میں میرا میلان انھی عقائد و نظریات کی طرف تھا۔ جب آٹھویں جماعت میں پہنچا، تو میرا رجحان خودبخود دین اسلام کی طرف ہونے لگا۔

اسی اثنا میں بوچھال کلاں کے ایک عالم دین مولانا عبدالرؤف سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے متعدد نشستوں میں مجھ پر اسلام کی حقانیت واضح کر دی۔ میں ان کے مواعظ سے بہت متاثر ہوا، مگر ابھی لڑکپن کی منزل ہی کا راہی تھا، اس لیے اپنے آبائی مذہب، خاندان، بہن بھائیوں، والدین اور گھر بار کو چھوڑنے کا خیال بھی میرے ننھے سے دل میں قیامت خیز لرزہ برپا کر دیتا۔ جب بھی اسلام قبول کرنے کا خیال آتا، دل میں ماں اور بھائیوں کی محبت کا بہاؤ تیز ہو جاتا۔ بچپن کی ناتجربہ کاری اور ناپختگی میرے آڑے آتی اور میں کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچ پاتا۔

یکم مارچ ۱۹۳۸ء کی سہانی اور مبارک رات میں نے خواب دیکھا کہ مکہ معظمہ میں بیت اللہ شریف کے عین سامنے کھڑا ہوں۔ سید الاولین والآخرین حضرت محمد ﷺ (فداہ روحی، ابی، امی) دیوار کعبہ سے ٹیک لگائے جلوہ افروز ہیں۔ ارد گرد صحابہ کرام رضوان اللہ

www.pdfbooksfree.pk

علیہم اجمعین تشریف فرما ہیں۔ میں والہانہ جذبہ و شوق کے عالم میں صحابہ کرامؓ کے درمیان سے گزرتا سید الانبیا ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پہنچا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرے بدن کے رگ و ریشہ میں مسرت و شادمانی کی عجیب لہر دوڑ گئی۔

فرمایا ''کہو کیسے آئے؟''

''مشرف باسلام ہونے آیا ہوں۔'' میں نے عرض کیا۔

یہ سن کر آنحضرت ﷺ کا پُرانوار چہرہ مسرت سے چمک اٹھا۔ میرا ہاتھ اپنے مقدس ہاتھوں میں تھام کر آپ ﷺ نے کچھ پڑھا جسے میں اس وقت سمجھ نہیں سکا۔ پھر فرمایا ''بس اب تم دولت اسلام سے بہرہ ور ہوگئے۔''

حسب معمول صبح آنکھ کھلی، تو میرا ننھا سا دل خوشی کے جذبات سے معمور تھا۔ جب والد محترم کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانے لگا، تو انھوں نے مجھ سے خلاف معمول اس قدر خوش نظر آنے کی وجہ پوچھی۔ میں بات ٹال گیا۔

مدرسے کے اوقات میں مولانا عبدالرؤف سے مل کر جب رات کا پُرلطف خواب سنایا، تو انھوں نے فرمایا: ''روزانہ سوتے وقت اللہ تعالیٰ سے راہ ہدایت کی دعا کیا کرو۔'' تین مارچ ۱۹۲۹ء کو جمعرات کا دن تھا۔ میں رات کو حسب معمول سو رہا تھا کہ خواب میں یوں محسوس ہوا جیسے چھٹی ہونے پر میں میانی کے تمام طلبہ کے ساتھ گھر واپس آ رہا ہوں۔ راستے میں ایک قوی ہیکل، دیو قامت اور کریہہ المنظر شخص کھڑا ہے جسے دیکھ کر ہم سب پر لرزہ طاری ہو گیا۔

میں نے ساتھیوں سے کہا ''یہ دجال ہے۔ جس سے بھی یہ پوچھے کہ تم کس کے بندے ہو، وہ یہی جواب دے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔''

وہ پھر میرے ساتھیوں سے فرداً فرداً سوال کرنے لگا۔ جو طالب علم اس کی مرضی کے مطابق جواب دیتا، اسے قسم قسم کے کھانے، مزے کے پھل اور طرح طرح کے کھلونے دیتا۔ جو اس کی بات نہ مانتا، اسے مارتا پیٹتا۔ آخر جب میری باری آئی، تو اس نے پوچھا ''کس کے بندے ہو؟''

''اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی اس نے مجھے اس زور سے گھونسا رسید کیا کہ میں کئی گز دور جا گرا اور رونے لگا۔ دجال نے تحکمانہ لہجے میں آواز دیتے ہوئے کہا ''ادھر آؤ۔''

میں ڈرتا کانپتا ادھر جانے لگا تھا کہ میرے کانوں میں حضور نبی اکرم ﷺ کی شیریں آواز پڑی۔ ''پہلے

صاحب تحریر

پروفیسر غازی احمد ۲ رجون ۱۹۲۳ء کو میانی میں پیدا ہوئے۔ یہ مشہور قصبہ، بوچھال کلاں کے قریب واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ قبول اسلام کے بعد پاکستان ہی میں مقیم رہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات کرنے کے بعد شعبہ تدریس کی طرف آگئے۔ پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج، بوچھال کلاں میں طالبان علم کی علمی پیاس بجھاتے رہے۔ عربی کی مشہور کتب، الھدایہ اور اصول الشاشی کا اردو ترجمہ کیا۔ ممتاز اسلامی سپہ سالار، موسیٰ بن نصیر کی داستان حیات لکھی، نیز احادیث نبوی ﷺ پر ایک کتاب مرتب کی۔ آپ نے ۲۵ راگست ۲۰۱۰ء کو وفات پائی۔

www.pdfbooksfree.pk

میرے پاس آؤ۔"

آپ ﷺ کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا، سوچا، ابھی دو دن پہلے تو میں نے آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ میں دیکھا تھا، آج آپ یہاں تشریف لے آئے؟ میں دجال کے خوف سے روتا ہوا آنحضرت ﷺ کی بارگاہِ رسالت میں پہنچا۔ آپ ﷺ نے میری کمر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے فرمایا "دیکھو، دجال کی بات ہرگز نہ ماننا۔ میں تمھارے لیے دعا کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ناکامی کا منہ نہیں دیکھو گے۔"

یہ ارشاد فرما کر آپ ﷺ جب تشریف لے گئے، تو میں دجال کے پاس پہنچا۔ اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔ میں نے بھی حسبِ سابق وہی جواب دیا۔ اس پر وہ مارے غضب کے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے جھلا کر جب میرے منہ پر تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو مارے دہشت کے میں چیخ اٹھا۔ ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی اور پھر صبح تک مجھے نیند نہ آسکی۔

پھر میں نے فیصلہ کیا کہ آج ہی ہو چھال کلاں پہنچ کر قبولِ اسلام کا اعلان کر دوں گا۔ والدہ محترمہ نے جب صبح ناشتا تیار کیا، تو انھی کے پاس بیٹھ کر کھایا۔ اس وقت دل میں جذبات کا تلاطم بپا تھا۔ جانتا تھا کہ آج ہمیشہ کے لیے ماں اور بھائیوں سے جدا ہو رہا ہوں۔ پھر اس گھر میں جہاں زندگی کی کئی بہاریں لوٹی ہیں، شاید ہی دوبارہ یہاں قدم رکھنا نصیب ہو۔ چھوٹے بھائیوں کی محبت و شفقت نے مجھے مجبور کیا، تو بہانے بہانے سے ان کے سر پہ ہاتھ پھیر کر دل کو تسکین دی۔

اسی طرح کسی بہانے سے پیاری اماں کے قدم چھو کر ہدیہ عقیدت و احترام پیش کیا۔ کھانے سے فارغ ہوا، تو بستہ اٹھایا۔ گھر، تینوں بھائیوں اور محترمہ والدہ کی طرف حسرت بھری نگاہ ڈالی اور پرنم آنکھوں سے اپنے آبائی گھر سے رخصت ہو گیا۔

۴ مارچ ۱۹۳۸ء کو جمعہ کا مبارک دن اور محرم کی پہلی تاریخ تھی کہ میں سیدھا مسجد میں داخل ہوا۔ مولانا عبدالرؤف نے مجھے مشرف با سلام کر کے غازی احمد نام تجویز کیا۔ میرے اسلام لانے کی اطلاع جب گھر پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ سب رونے پیٹنے لگے۔ میرے والد کشمیر میں ملازم تھے۔ انھیں اور دیگر رشتہ داروں کو بذریعہ تار اس خبر سے مطلع کیا گیا۔ ابھی تین چار روز بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ والد نے رشتہ داروں سے مل کر مولانا عبدالرؤف اور ملک محمد طفیل، ہیڈ ماسٹر پر مقدمہ دائر کر دیا کہ انھوں نے ہمارے نابالغ بچے کو ورغلا کے زبردستی مسلمان بنا لیا ہے۔

ایس۔ ڈی۔ ایم کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ ایک طرف والد اور متعدد ہندو رشتے دار تھے، دوسری طرف میں اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان! عدالت میں میرا بیان لیا گیا۔ میں نے کہا "میں اپنی رضا و رغبت سے مسلمان ہوا ہوں۔ میرے قبولِ اسلام میں کسی فرد و بشر کا ہاتھ نہیں۔ میں مسلمانوں ہی کے پاس رہوں گا۔ والدین کے پاس مجھے جان کا خطرہ ہے۔" جب فیصلہ میرے حق میں ہوا، تو مسلمان خوشی سے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے عدالت سے واپس لوٹے۔

میرے والد بھلا کب خاموش بیٹھنے والے تھے، انھوں نے مختلف عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹایا، مگر انھیں کہیں کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ پولیس نے ہندوؤں کے دباؤ میں آ کر بڑی تحقیق و تفتیش سے کام لیا۔ مگر میرے رشتہ داروں کو اپنا مقصد حل ہوتا نظر نہیں آیا۔ ہر عدالت میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان میرے ساتھ ہوتے جو آخر

www.pdfbooksfree.pk

اوقات بوچھال کلاں سے پیدل چل کر جایا کرتے۔ اس کے بعد والد نے سیشن جج جہلم سے رجوع کیا اور کہا "میرے نابالغ لڑکے کو زبردستی مسلمان بنا لیا گیا ہے۔" جہلم کے سرکردہ ہندو ان کے ساتھ تھے، جنھوں نے مل ملا کر جج صاحب پر دباؤ ڈالا۔

عدالت میں پیشی ہوئی، تو میں نے محسوس کیا کہ جج کا رویہ میرے بارے میں ٹھیک نہیں۔ اس پیشی پر دو تین مسلمان میرے ساتھ تھے۔ جج صاحب نے مجھے دوسری پیشی تک والد کے سپرد کر دیا۔ جب میں نے انکار کیا، تو مجھے زبردستی کار میں بٹھا دیا گیا۔ پھر مجھے دریا کنارے ایک مندر لایا گیا جہاں سارا دن میں نے رو رو کر گزارا۔ اسی دوران والدہ محترمہ کو جہلم بلایا گیا۔ انھوں نے مجھے دھمکی دی "اگر تم نے ہمارے حق میں بیان نہ دیا، تو میں گھر زندہ نہیں جاؤں گی بلکہ دریا میں کود کر خودکشی کر لوں گی۔" دوسرے ہندو بھی وقتاً فوقتاً آ کر مجھے سمجھاتے بجھاتے اور قسم قسم کے لالچ دیتے رہتے۔

اس اثنا میں والد نے ہندو اکابر کے اثر و رسوخ سے کام لے کر ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر جہلم سے میرے نابالغ ہونے کا سرٹیفیکیٹ حاصل کر لیا۔ اسے مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے ہی عدالت میں پیش کیا۔ جج صاحب نے جب مجھ سے پوچھا "آپ والدین کے پاس رہتے میں خوش ہیں؟" تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ لیکن افسوس، میری کسی بات کو اہمیت نہ دی گئی اور زبردستی مجھے والدین کے سپرد کر دیا گیا۔

تعجب تو اس بات پہ تھا کہ والد کے حق میں فیصلہ دینے والے جج صاحب مسلمان تھے۔ بعدازاں والدین نے بتایا کہ انھوں نے جج کو رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرایا تھا۔

اسی دن والد مجھے ساتھ لیے کشمیر روانہ ہو گئے۔ تین دن ہم جموں میں ایک پنڈت کے ہاں فروکش ہوئے۔ پنڈت نے مجھے رام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر اس کے غیر معقول دلائل مجھے متاثر نہ کر سکے۔ کشمیر پہنچ کر میں نے مولانا عبدالرؤف کو خط بھجوانا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

والد نے سوتے میں وہ خط میری جیب سے نکال کر ضائع کر دیا۔ چوتھے دن والد مجھے لیے بھدرواہ روانہ ہو گئے۔ بٹوت تک بس کے ذریعے پھر بھدرواہ تک پیدل راستہ طے کیا۔ دوسرے دن وہ مجھے ایک پنڈت کی معیت میں گاؤں سے باہر ایک بلند پہاڑی پر لے گئے اور اپنے پاس بٹھا کر کہا "دیکھو میں اس مقدمے میں تم پر دس ہزار روپیہ خرچ کر چکا۔ تم نے مجھے کہیں کا نہیں رہنے دیا۔ خاندان میں میری ذرہ برابر عزت نہیں رہی۔"

یہ کہتے ہوئے والد کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے اپنی زندگی میں شاید پہلی اور آخری بار ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ میرا دل پسیج گیا، مگر رحمت ایزدی نے مجھے سہارا دیا اور حضور نبی اکرم ﷺ کی زیارت کے تمام حالات میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ میں نے والد کی خدمت میں عرض کیا "مجھے آپ کی پریشانیوں اور تکلیف کا احساس ہے۔ آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میرا دل ترک اسلام کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ اگر آپ مجھے اسلام پر قائم رہنے کی اجازت مرحمت فرما دیں، تو تمام عمر آپ کی غلامی میں بسر کروں گا۔"

والد یہ سنتے ہی چھڑی ہاتھ میں لے کر مجھے پیٹنے لگے۔ اتنا پیٹا کہ بدن سے خون بہنے کے باعث میرے سارے کپڑے سرخ ہو گئے۔ اس پر بھی انھیں رحم آیا اور

www.pdfbooksfree.pk

نہ اُن کی مار میں کوئی کمی آئی۔ میں آدھ موا ہو کر پڑا ٹھوکریں کھاتا رہا۔ آخر جب وہ دل کا غبار اچھی طرح نکال چکے، تو پنڈت سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ''کیوں نہ میں اسے دریا میں دھکیل دوں۔ شاید اسی طرح کلنک کا یہ ٹیکا میرے ماتھے سے اتر جائے۔''

پہاڑی کے دامن میں چناب دریا میرے سامنے تھا۔ اپنی موت کے خوف سے میں لرز گیا، مگر اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ہے، اس نے میرے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دی۔ میرے دل میں یہ خیال بار بار ابھرنے لگا کہ اگر والد مکرم نے مجھے دریا میں پھینکا، تو میں اپنے پیارے نبی ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کروں گا ''میرے آقا آپ نے مجھے اسلام کی جو دولت بخشی تھی، میں اس کو صحیح وسالم لیے حاضر ہو گیا ہوں۔''

> ''میں اپنی رضا و رغبت سے مسلمان ہوا ہوں۔ میرے قبول اسلام میں کسی فرد و بشر کا ہاتھ نہیں۔ میں مسلمانوں ہی کے پاس رہوں گا۔ والدین کے پاس مجھے جان کا خطرہ ہے۔''

پنڈت صاحب نے جو مارے خوف کے کانپ رہے تھے، والد سے کہا ''ابھی یہ بچہ ہے۔ بڑا ہو کر سنبھل جائے گا۔ آپ کوئی سخت اقدام نہ اٹھائیں۔''

والد نے پنڈت کی بات مان لی اور مجھے ساتھ لے کر چپ چاپ گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر والد نے خود ہی میری مرہم پٹی کی۔ چھڑی کی مار اور بوٹوں کی ان گنت ٹھوکروں سے جسم کا رواں رواں زخمی تھا، حتیٰ کہ ناک، منہ اور آنکھیں تک سوجی ہوئی تھیں۔

میں تقریباً ہفتہ بھر بستر پر دراز رہا۔ پھر والد نے مجھے بھدرواہ ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ میں ہندو لڑکوں کی نگرانی میں روز اسکول آنے جانے لگا۔ مسلمان طلبہ کو میرے ساتھ بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ہندو لڑکے ہی نہیں اساتذہ بھی مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ وہ اسکول میرے لیے جہنم سے کم اذیت ناک نہ تھا۔

آخرکار میں نے دوست محمد نامی مسلمان ہم جماعت سے تعلقات بڑھائے۔ اس کے توسط سے مولانا عبدالرؤف کو خط لکھا اور بتایا کہ میں بفضلہٖ تعالیٰ اسلام پر قائم ہوں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی دعا ہی کی برکت ہے کہ مجھے شدید جسمانی تکلیف بھی اسلام سے برگشتہ نہیں کر سکی۔ مولانا صاحب نے خط ملتے ہی قصبے کے سارے لوگوں کو جمع کر کے ان سے پوچھا ''کوئی ہے جو جان پر کھیل کر ایک مسلمان کو کافروں کے عذاب سے چھٹکارا دلا سکے؟'' اس پر ایک غریب لیکن جذبہ شہادت سے سرشار شخص اٹھا اور اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ ان کا نام جان محمد تھا۔

جان محمد اوقات مدرسہ ہی میں بھدرواہ پہنچ گئے۔ دوست محمد کی وساطت سے جب مجھے ان کی آمد کا پتا چلا، تو میں آدھی چھٹی کے بعد روتا ہوا ماسٹر صاحب کی خدمت میں پہنچا اور کہا ''میرے پیٹ میں سخت درد ہے۔ مجھے چھٹی عنایت فرمائی جائے۔'' ماسٹر نے چھٹی دے دی۔ میں نے بستہ اٹھایا اور چھپتا چھپاتا، ہندو طلبہ سے آنکھ بچاتا مدرسے سے نکل آیا۔

جان محمد نے ایک مسلمان راہبر کو ساتھ لیا اور ہم راتوں رات تیزی سے سفر کرتے ریاست کشمیر سے نکل ریاست چنبہ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ وہاں مسلمان راہبر واپس ہو گیا۔ ہم دونوں تقریباً ساٹھ میل سفر طے کر کے تیسرے دن صبح ڈلہوزی پہنچے۔ تھکان سے میرا برا حال تھا۔ کپڑے میلے اور پاؤں سوج چکے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

شام کو بذریعہ پٹھانکوٹ امرتسر پہنچے، تو میں نے اپنا ہندوانہ لباس اتار کر اسلامی کپڑے پہن لیے۔ اب ہم امرتسر سے کھیوڑہ کی راہ بوچھال کلاں پہنچ گئے۔ بس اڈے پر مسلمانوں کا ہجوم ہماری پذیرائی کے لیے موجود تھا۔

والد کو جب میرے فرار کا علم ہوا، تو انھوں نے تمام راستوں کی ناکہ بندی کرنے کے لیے تار دے دیے۔ لیکن جس راستے کو ہم نے اختیار کیا تھا، وہ ان کے علم میں نہ تھا، اس لیے بچ نکلے۔

چند روز بعد والدہ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اشکبار ہو کر فرمایا "بیٹا! تمھیں اس قدر ذلیل ہی کرنا تھا، تو پہلے بتا دیتے تاکہ روپے خرچ کرنے سے تو بچ جاتے۔"

عرض کیا "اماں جی! میں نے آپ سے پہلے کہہ دیا تھا کہ میں اسلام کو ترک کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں ہو سکتا۔ آپ میرے لیے کچھ نہ کیجیے۔ ہاں بیٹے، میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ کی ہر خدمت میرے لیے باعث سعادت ہے۔ مجھے آپ کے وہ احسانات یاد ہیں کہ جب بھی خاندان والوں نے مجھے ختم کرنے کی کوئی سازش کی، تو آپ نے مجھے پہلے ہی مطلع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔"

میں نے والدہ سے صلح کر لی اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ مگر والد کو میں نے چھے سال بعد دیکھا۔ راستے میں اچانک آمنا سامنا ہو گیا، مگر وہ بغیر توجہ دیے قریب سے گزر گئے! میں بھی ان سے بات کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے موقع پر میرے خاندان کے سبھی افراد بھارت چلے گئے۔ میں مسلمان بھائیوں کے ساتھ پاکستان میں رہا اور اپنے آبائی مکان منتقل ہو گیا۔ ۱۹۵۰ء میں مجھے اطلاع ملی کہ والد چل بسے ہیں۔ والدہ اور تین بھائی انبالہ کے قریب ایک گاؤں میں مقیم ہو گئے تھے۔

۱۹۳۱ء میں میٹرک کا امتحان میں نے اسکول میں اوّل رہ کر امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ بعدازاں علوم دینیہ کی طرف توجہ دی، چناںچہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک مدرسہ خادم الشریعہ چنڈی کھیپ، مدرسہ عربیہ اشاعۃ القرآن گجرات اور دارالعلوم دیوبند میں علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ ۱۹۳۸ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور صوبے بھر میں اوّل آیا۔

میرا ایمان ہے، یہ ساری کامرانیاں آنحضرت ﷺ کی دعا کی مرہون منت مجھے نصیب ہوئیں۔ ۱۹۵۴ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ ۱۹۵۷ء میں بی۔ایڈ کیا۔ ۱۹۵۸ء میں ایم۔اے عربی کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۵۹ء میں ایم۔اے علوم اسلامیہ کا امتحان دیا اور صوبے بھر میں اوّل رہا۔ ان تمام عنایات پر میں اپنے مالک حقیقی کا شکر گزار ہوں۔

اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے اپنے اندر بہت بڑا ذہنی و روحانی انقلاب محسوس کیا۔ پہلے میں ایک متوسط ذہن کا مالک تھا۔ اسلام کے سایۂ عافیت میں پناہ لینے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے دینی اور دنیوی ترقی کے دروازے بھی میرے لیے کھول دیے۔ دوسری بات جو میں نے اپنی عملی زندگی میں محسوس کی کہ نبی اکرم ﷺ کی دعا کا اثر ہے، مجھے آج زندگی کے کسی شعبے میں ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آنحضرت ﷺ کی دعا ہی میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ ان شاء اللہ قیامت کے دن بھی دعا میری نجات کا باعث ہوگی۔ (آمین ثم آمین)

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

دورِ جدید کا ایک المیہ

اسلام سے دور ہوتے مسلمان

مغربی تہذیب و ثقافت انھیں اسلامی تعلیمات سے دور کر رہی ہے

ڈاکٹر ندیم بھٹی

یہ اس زمانے کی بات ہے جب کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں اورٹن اسکوائر مال پر میرا دفتر واقع تھا۔ اس مال میں ایک بنگلہ دیشی مسلمان، نجیب کی دکان تھی۔ ایک دن نجیب نے بتایا کہ سامنے جوتے مرمت کرنے اور تالے کی چابیاں بنانے والے چینی میاں بیوی مسلمان ہیں۔

مجھے ایک دفعہ اپنے دفتر کی چابیاں بنوانے ان کے پاس جانا پڑا۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ مسلمان ہیں، میں نے السلام علیکم کہا۔ دونوں میاں بیوی نے جواب نہ دیا اور میرا منہ تکنے لگے۔ میں نے دوبارہ السلام علیکم کہا لیکن جواب نہ ملا۔ میں سمجھ گیا کہ انھیں السلام علیکم کی سمجھ نہیں آئی۔ خیال آیا کہ یقیناً نجیب کو غلطی لگی ہے۔

میں نے پوچھا ''آپ مسلمان ہیں؟''

دونوں نے جواب دیا ''ہاں۔''

میں نے کہا ''آپ کو السلام علیکم کی سمجھ نہیں آئی؟''

انھوں نے جواب دیا ''نہیں۔'' پھر عورت نے بتایا کہ اس کی ماں ایسے الفاظ استعمال کرتی تھی۔

میں نے پوچھا ''آپ کو بسم اللہ کے متعلق معلوم ہے؟''

www.pdfbooksfree.pk

انھوں نے کہا "نہیں۔"

میں نے پوچھا "کلمہ آتا ہے؟"

جواب دیا "نہیں۔"

میں نے پوچھا "نماز کبھی پڑھی ہے؟"

کہا "نہیں۔"

پھر پوچھا "آپ اللہ کو جانتے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا "ہاں۔"

گویا اسلام کے بارے میں ان کا علم صرف ایک لفظ تک محدود تھا۔ اس کے بعد میں وہاں سے گزرتے ہوئے انھیں السلام علیکم کہنے لگا اور ان کو جواب دینا سکھایا۔ باتوں باتوں میں اسلامی تعلیمات بھی سکھ گئیں۔ اس واقعے سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ کفر و شرک کے مغربی ماحول میں رہنے والے بہت سے مرد و عورتیں مسلمان کہلانے کے باوجود اسلام سے بہت دور ہیں۔

> یہ مسلمان ہو گا۔ اعتقاد کے ساتھ بے جھجک دروازے پر دستک دی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور آواز آئی "Who is it" (کون ہے؟)

دنیا کے مختلف خطوں میں ماہرین مذہبی رجحانات کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس امر کا مطالعہ نہایت پیچیدہ ہے۔ ایک طرف تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ دن بدن لوگ مذہب کی جانب مائل ہو رہے ہیں۔ دوسری جانب مذہب بیزاری اور بغاوت بھی تحریک کی صورت اختیار کر رہی ہے۔

حال ہی میں ون۔ گیلپ انٹرنیشنل (Win-Gallup International) کے سروے میں بتایا گیا کہ مذہبی رجحانات دم توڑ رہے ہیں۔ سروے کے مطابق دنیا کی ۵۹ فیصد آبادی اپنے آپ کو مذہبی کہتی ہے۔ ۱۳ فیصد نے اپنے آپ کو دہریہ (Atheist) کہا جبکہ ۲۳ فیصد آبادی نے بتایا کہ ان کا کوئی مذہب نہیں۔ اس تحقیق کے مطابق دہریے زیادہ تر چین، جاپان اور مغربی یورپ میں ملتے ہیں۔ مذہبی میلانات والے علاقوں میں افریقا، مشرق وسطیٰ، جنوب مشرقی ایشیا، جنوبی یورپ اور لاطینی امریکا کے علاقے شامل ہیں۔

یہ سروے کی رو سے کم آمدنی والے افراد میں مذہبی رجحانات امرا کے مقابلے میں ۱۷ فیصد زیادہ ہیں۔ نیز زیادہ تعلیم یافتہ نسبتاً کم مذہبی رجحانات رکھتے ہیں۔ یہ دلچسپ بات بھی معلوم ہوئی کہ جوں جوں انسان بالغ ہو، اس کے مذہبی رجحانات میں کمی آ جاتی ہے۔ یہ کمی ۶۵ سال کی عمر تک رہتی ہے۔ پھر مذہبی رجحان میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔

دور حاضر میں ایک طرف یہ سننے کو ملتا ہے کہ ۲۰۴۱ تک مذاہب ختم ہو جائیں گے۔ دوسری جانب مذہبی رجحانات کے حامی محقق دعویٰ کرتے ہیں کہ شعور کی بیداری لوگوں کو مذہب کے قریب لا رہی ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں لوگوں کا اسلام کی طرف مائل ہونا روزمرہ کی حقیقت ہے۔

اس امر پر تمام ماہرین متفق ہیں کہ بڑے مذاہب میں اسلام سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اسلام ۱.۶ فیصد سالانہ کے حساب سے پھیل رہا ہے۔ سکھ ازم ۱.۷، عیسائیت ۱.۲ فیصد اور ہندومت بھی ۱.۲ فیصد کے حساب سے بڑھ رہے ہیں۔ ان مذاہب کی رفتار عالمی آبادی میں اضافے کی شرح سے ۱.۱ فیصد زیادہ ہے۔ حقائق سے عیاں ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ اضافہ مسلمانوں کی تعداد

www.pdfbooksfree.pk

میں ہو رہا ہے۔

یورپ اور شمالی امریکا میں بھی اسلام تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن چکا۔ نومسلموں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے اسلام کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور شعوری طور پر مسلمان ہوئے۔ یہ لوگ مصدقہ کتب کے مطالعے اور اپنے مشاہدے کی بدولت پختہ بنیادوں پر مسلمان بنتے اور بہت باعمل ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کو مختلف غیراسلامی، سماجی اور سیاسی قوتوں سے محفوظ رکھا جائے۔ جہاں ایک طرف نئے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں، وہیں بہت سے افراد سماجی اور معاشی حالات کی بنا پر دور بھی ہو چکے۔

مجھے یاد ہے، جب بہ سلسلہ تعلیم آسٹریلیا جانے کا موقع ملا، تو جس ہوسٹل میں رہائش ملی، اس میں میرے علاوہ کوئی مشرقی طالب علم نہ تھا۔ چونکہ مجھے کوئی جانتا نہیں تھا، اس لیے میری کوشش رہی کہ کسی سے سماجی رابطہ قائم کروں۔ ایک دن ایک کمرے کے باہر ''اسمٰعیل'' لکھا دیکھا۔ فوراً یقین کر لیا کہ یہ مسلمان ہو گا۔ احترام سے سہمتے جھجک دروازے پہ دستک دی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور آواز آئی ''Who is it'' (کون ہے؟)

میں نے دیکھا، تو ایک نیم برہنہ لڑکی نظر آئی۔ میں یکدم شرمندہ ہو گیا۔ سمجھ نہیں آئی کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کروں۔ بہرحال خفت مٹانے کے لیے کہا ''Can I see Ismail'' (کیا میں اسمٰعیل سے مل سکتا ہوں؟)

لڑکی نے دروازہ ذرا زیادہ کھولا اور بستر میں سوئے پڑے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا ''Here he is'' (وہ رہا)۔

اب میں سچے اسلامی جذبے کے ساتھ وہاں گیا تھا، لیکن منظر میری توقعات کے برعکس نکلا۔ میں نے کہا ''Ok talk to you later'' (میں پھر آؤں گا)۔ یہ کہہ کر میں چلا آیا۔

کچھ دن بعد اسمٰعیل مجھے کھانے کے وقت ملا۔ میں نے اس سے دریافت کیا ''Are you Muslim?'' (کیا تم مسلمان ہو؟)

اس نے کہا ''Well, my father is'' (میرے والد مسلمان ہیں)۔

میں نے پوچھا ''آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟''

جواب ملا ''مراکش سے ہوں۔ چھوٹا سا تھا جب میرے والدین آسٹریلیا کی شہریت لے کر یہاں چلے آئے۔'' میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اپنے والدین سے الگ ہو چکا اور اسلام کی کسی تعلیم پر عمل نہیں کرتا۔ مغرب میں ایسے ہزاروں نوجوان غیراسلامی، معاشرتی اور معاشی حالات میں اسلام سے دور ہو رہے ہیں۔ لیکن ہماری گنتی میں وہ بھی مسلمان ہیں۔ یہ ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

سڈنی اولمپکس ۲۰۰۰ء میں مجھے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ میں تب سڈنی یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز کے ہومبش پول پر تعینات تھا۔ اس جگہ مختلف ٹیمیں تیراکی کی مشق کرنے آیا کرتی تھیں۔ ان میں قازقستان کی ٹیم بھی شامل تھی۔ ٹیم کے کپتان کا نام اسگر (اصغر) تھا۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے میں اس کے قریب ہو گیا۔

ایک روز اپنے لیے دوپہر کا کھانا لانے لگا، تو کچھ زیادہ خوراک ساتھ لے لی تاکہ اصغر کو بھی کھانے میں شامل کر سکوں۔ میں نے اصغر سے کہا کہ آپ کو یہاں حلال کھانا ملنے میں دشواری ہوتی ہوگی، اس لیے گھر سے بنا کر لایا ہوں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اصغر نے کہا ''میں حلال

وغیرہ کی پروا نہیں کرتا اور سب کچھ کھا لیتا ہوں۔"

میں نے پوچھا "پورک" بھی کھا لیتے ہو؟"

اس نے بتایا کہ قازقستان میں لوگ زیادہ حلال حرام کا خیال نہیں کرتے۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی مسلمان اپنے بنیادی اعتقادات سے دور ہو چکے۔ وہ مغربی ثقافت کے زیرِ اثر برائے نام مسلمان رہ گئے ہیں۔ لیکن اللہ کی قدرت اور اسلام کے دیرپا اثرات کی بدولت صبح کے بھولے شام کو گھر واپس بھی آ رہے ہیں۔

میں آسٹریلیا کی یونیورسٹی آف نیو انگلینڈ کے ہوسٹل میں رہتا تھا۔ میرے ساتھ والے کمرے میں ایک پادری، فادر فورٹ (Father Forte) رہائش پذیر تھا۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگا "Nadeem. Do you know any Imam?" (ندیم، تم کسی امام کو جانتے ہو؟)

میرے لیے یہ سوال عجیب سا تھا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا، یونیورسٹی سے کچھ کلومیٹر دور ایک گاؤں میں ایک بزرگ قریب المرگ ہے۔ اس کو کسی مسلم امام کی ضرورت ہے۔ میں نے یونیورسٹی کی مسجد میں دوستوں کو بتایا، تو انھوں نے گاؤں جانے کی ہامی بھر لی۔

گاؤں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک پچاسی سالہ بوڑھا جو دیکھنے میں انگریز لگتا تھا، سخت بیمار ہے۔ وہ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ اس کے بیٹے بہو اور پوتے پوتیاں بھی وہاں موجود تھیں۔ اس شخص کا نام مسٹر خان تھا۔ پتا کرنے پر عیاں ہوا کہ وہ ۱۸ سال کا تھا جب صوبہ سرحد سے آسٹریلیا آیا۔ آنے کے بعد کاروبار کیا اور کامیاب تاجر بن گیا۔ آسٹریلیا میں ایک عیسائی گوری سے شادی کی اور بچوں کے نام بھی ایڈم خان اور اینڈریو خان وغیرہ رکھے۔ بچوں کی شادیاں بھی عیسائی عورتوں سے ہوئیں۔ یوں اگلی پوری نسل عیسائی ہو گئی۔ اس دوران خود مسٹر خان بھی اپنا مذہب بھول کر آسٹریلیا کے مغربی رنگ میں رنگ گیا۔

اب وہ بستر مرگ پر پڑا تھا، تو اسے اپنا ماضی یاد آنے لگا۔ اس نے بتایا "میرے تکیے کے نیچے ایک کتاب پڑی ہے۔ اسلام کی یہی واحد نشانی میرے پاس موجود ہے۔" یہ قرآن مجید کا نسخہ تھا جو کسی نہ کسی طرح اس کے پاس محفوظ رہ گیا۔

دوستوں نے کوشش کی کہ وہ کلمہ طیبہ ادا کر سکے لیکن وہ ادا نہ کر سکا۔ ہم نے سوچا کہ اس کے قریب قرآن مجید کی تلاوت با آواز بلند کی جائے، تو شاید زبان سے کلمہ ادا ہو جائے۔ چناں چہ ہم نے پروگرام بنایا کہ روزانہ دو تین ساتھی گاؤں جائیں اور کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر تلاوت کیا کریں۔ شاید اللہ تعالیٰ موت سے قبل اس پر رحم فرما کر ایمان کی موت نصیب فرما دے۔

چناں چہ کچھ دن تک ہم لوگ روزانہ باری باری وہاں جا کر تلاوت کرتے رہے۔ بالآخر ایک روز وہ کلمہ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے چند ہفتوں بعد مسٹر خان فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یوں وہ بھی ہزارہا تارکین وطن کی طرح اپنی نسل کو مغربی معاشرے میں ضم کر کے چل دیا۔

یہ واقعات بیان کرنے کا مقصد یہ ہے: اس انوکھی کیفیت کا جائزہ لیا جائے کہ ایک طرف تو مسلمانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، تو دوسری جانب مغربی ثقافت اور معیشت کے زیرِ اثر بہت سے مسلمان اپنے دین و ایمان سے محروم ہو رہے ہیں۔ اہلِ دانش کو اس مسئلے کا حل سوچنا چاہیے۔

◆◆●

www.pdfbooksfree.pk

ایک حجام نے حضرت جنید بغدادیؒ کو سبق سکھایا

بدی سے محفوظ رکھ کر نیکی کا راستہ دکھلانے والے نصیحت آموز واقعات

پروفیسر خالد پرویز

ایک دفعہ میں مکہ مکرمہ میں تھا تو ایک حجام کی دکان پر اپنے بال کٹوانے گیا۔ میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ لوگ بال کٹوا کر حجام کو اس کی اجرت دے رہے تھے۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا سوچتا رہا کہ اگر بال کٹوائے تو اجرت کے پیسے کہاں سے ادا کروں گا۔ اچانک حجام کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے پوچھا "جناب آپ بھی بال کٹوانے آئے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "جی ہاں! ارادہ تو یہی ہے۔"

حجام نے کہا "جس شخص کے بال کاٹ رہا ہوں۔ اس سے فارغ ہولوں تو پھر آپ کے بال کاٹوں گا۔"

میں نے حجام سے کہا "میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تمہیں میرے بال خدا کے نام پر کاٹنے ہوں گے۔"

حجام نے جیسے ہی خدا کا نام سنا اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسی وقت حجامت کرنا روک دی اور اپنے گاہک سے کہا "باقی بالوں کی کٹائی بعد میں کروں گا۔ پہلے اس شخص کے بال کاٹوں گا جس نے خدا کا نام لیا ہے۔ جب خدا کا نام آگیا تو یہ کام پہلے ہوگا اور دوسرے کام بعد میں۔"

چناں چہ اس نے مجھے بٹھا لیا اور جس شخص کی حجامت کر رہا تھا، اسے کہا کہ وہ ابھی انتظار کرے۔ اس نے انتہائی محبت و شفقت سے میرے بال تراشے۔ اس کے بعد مجھے ایک کاغذ دیا جس میں تھوڑی سی ریزگاری لپٹی تھی۔ حجام نے کہا "میاں! یہ تھوڑے سے پیسے ہیں، انھیں اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کر لینا۔"

میں حجامت بنوا اور حجام سے پیسے لے کر گھر آگیا۔ دل ہی دل میں طے کیا کہ جب بھی رب رحمٰن و رحیم نے مجھے پیسوں سے نوازا، سب سے پہلے اسی حجام کے ساتھ مروت کروں گا۔ کیونکہ اس جیسا نیک دل اور بااخلاق شخص پہلے میں نے نہیں دیکھا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

رب ذوالجلال کا کرنا ایسا ہوا کہ چند ہی دن گزرے تھے، کچھ عقیدت مندوں نے مجھے بصرہ سے اشرفیوں کی ایک تھیلی بھیجی۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر وہ تھیلی لیے فوراً حجام کے پاس گیا اور اسے پیش کی۔ اس نے تھیلی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا "جب تم نے میرے ساتھ اچھا اور پرخلوص برتاؤ کیا تھا، تو میں نے اسی وقت یہ نیت کی تھی کہ جو کچھ مجھے اوّل نصیب ہوا، وہ تمہاری خدمت میں پیش کر دوں گا۔"

حجام کہنے لگا "کس قدر افسوس کی بات ہے! تم نے تو مجھے یہ کہا تھا کہ خدا کے نام پر میری حجامت بنا دو۔ اور اب یہ کیا لے کر آ گئے؟ اور وہ ریزگاری بھی خدا کے نام پر دی تھی۔ تم نے بھلا یہ کہیں دیکھا ہے کہ کوئی شخص اللہ کے نام پر کوئی کام کرے یا کوئی چیز دے اور اس کا بدل وصول کرے؟ جاؤ! یہ تھیلی لے جاؤ اور میری نیکی کو خدا کے حضور قبولیت بخشنے کا موقع دو۔"

حضرت جنید بغدادیؒ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں "میں نے زندگی میں اگر اخلاق کا سبق سیکھا، تو اسی حجام سے سیکھا۔"

ہمسائے کا پرنالہ

ان کے پاس ذاتی گھر نہیں تھا، اس لیے کرائے کے مکان میں رہائش رکھتے۔ مگر کرائے کا مکان بھی کسی نہ کسی وجہ سے اکثر بدلنا پڑتا۔ خدا کی وسیع و عریض زمین میں آج یہاں تو کل وہاں۔ ایک دفعہ ایک جگہ مکان لیا تو ساتھ کا ہمسایہ یہودی تھا۔ وہ اسلام دشمن تھا اور ختم المرسلین ﷺ کے نام لیواؤں کو تنگ کر کے خوشی محسوس کرتا۔ وہ دن اس کے لیے عید کا ہوتا جب کسی سچے اطاعت گزار، اللہ کے پیروکار اور عاشق احمد مختار ﷺ کو ایذا پہنچاتا۔

جب یہودی نے دیکھا کہ ہمسائے میں نیا کرایہ دار آیا ہے، تو اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں۔ جب اسے پتا چلا کہ اس کا نیا ہمسایہ اللہ کا پیارا اور وقت کا ولی ہے، تو اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے سوچا، کون سا ایسا حربہ استعمال کروں کہ یہ مومن پرہیزگار مکان چھوڑ جائے۔ سوچ بچار کے بعد بالآخر اپنے مکان کی چھت پہ ایسا پرنالہ لگوایا جس کا منہ ہمسائے کے صحن میں کھلتا تھا۔

پرنالہ لگوانے کے بعد یہودی روزانہ اپنے نیک اور دیندار ہمسائے کے گھر پرنالے سے نجاست پھینکنے لگا۔ وہ مدت تک انتظار کرتا رہا کہ ہمسایہ کچھ کہے گا، تو پھر اس طرح لڑائی کروں گا اور یوں مالک مکان سے کہہ کر اسے نکلوا دوں گا۔ مگر اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت نہ ہوئی۔

آخرکار یہودی نے تنگ آ کر خود ہی اپنے نیک اور برگزیدہ ہمسائے سے پوچھا "آپ کو میرے پرنالے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

یہ سن کر ہمسایہ مسکرایا اور بولا "تکلیف تو ہوتی ہے مگر میں نے ایک ٹوکری اور جھاڑو کا بندوبست کر لیا ہے۔ جو نجاست آپ کے پرنالے سے میرے گھر گرے، وہ میں روزانہ صاف کر دیتا ہوں۔"

یہودی نے پوچھا "آپ اتنی تکلیف کیوں کرتے ہیں؟ کیا آپ کو غصہ نہیں آتا؟"

نیک دل صاحب ایمان ہمسائے نے جواب دیا "میرا پروردگار ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو غصہ پی جاتے اور دوسروں کو معاف کر دیتے ہیں۔"

یہودی نے جیسے ہی یہ جواب سنا، اس کی کایا پلٹ گئی۔ منہ سے بے اختیار نکلا "اے مالک بن دینار! جو دین ایسی اچھی تعلیم دیتا ہے، اس کو میں اسی لمحے قبول کرتا ہوں۔ رب رحمٰن و رحیم سے اپنے گناہوں کی معافی کا

www.pdfbooksfree.pk

خطا کار ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہوں۔"

ایک انوکھا تحفہ

ایک انسان کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کرنا، ذات پر کیچڑ اچھالنا، بدگمانی کا اظہار کرنا غیبت کہلاتا ہے۔ غیبت ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔ غیبت کرنے والا جھوٹ کی سیاہ مٹی سے ایسا گھروندا تیار کرتا ہے جو وقتی طور پر خوبصورت لگتا اور ٹھوس بھی ہوتا ہے۔ مگر اس کی بنیادیں بدبختی پر استوار ہوتی اور دیواریں بدظنی کی کھوکھلی اینٹوں سے تعمیر کی جاتی ہیں۔ اس لیے سچ کی بارش کا ایک قطرہ ہی انھیں زمین بوس کرنے کو کافی ہوتا ہے۔ غیبت کرنے والے کو سوائے افسوس، پشیمانی اور ندامت کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اسی طرح کا ایک غیبت گو حضرت حسن بصریؒ کے دور میں تھا۔ اس کا ہر لمحہ اور لحظہ دوسروں کی غیبت اور عیب جوئی میں گزرتا۔ سارا دن ایک سے دوسری جگہ پہنچتا۔ ایک کی برائی دوسرے کے پاس اور دوسرے کی تیسرے کے پاس کرتا۔ ایک ساعت ایک مقام پر تو دوسری ساعت دوسرے مقام پر گزارتا۔ جو کوئی سنتا کہ اس نے یہ کچھ کہا ہے تو غم زدہ ہو کر رہ جاتا۔ کچھ لوگ اپنی صفائی بیان کرتے تو کچھ خاموش ہو کر رہ جاتے۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فن میں ماہر ہو چکا تھا۔ ایک وقت آیا کہ اس نے وقت کے ولی حضرت حسن بصریؒ کو بھی نہ چھوڑا اور ان کی غیبت سے اپنے دامن کو آلودہ کر لیا۔ لوگوں نے سنا تو اسے ٹوکا مگر وہ کب رکنے والا تھا۔ کچھ مریدین نے حضرت حسن بصریؒ کو اس کے بارے میں بتایا کہ وہ آپ کے متعلق بدگوئی کرتا پھر رہا ہے۔

ولی اللہ کے ہر کام کا اپنا جدا انداز اور منفرد طریقہ ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے سنا تو فوراً ایک مرید کو آواز دی۔ مرید حاضر خدمت ہوا اور عرض کی "فرمایئے جناب کیا حکم ہے؟"

حضرت حسن بصریؒ نے کہا "یہ لو پیسے، انھیں جیب میں ڈالو اور ابھی اسی وقت بازار جاؤ۔ وہاں سے تازہ و اعلیٰ چھوہاروں کا ایک ٹوکرا خرید لاؤ۔"

مرید دوڑا گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد چھوہاروں کا ٹوکرا لا حاضر کیا۔ حضرت حسن بصریؒ نے چھوہاروں کو ایک طباق میں سجایا اور ایک مرید خاص سے کہا "طباق اس شخص کے پاس لے جاؤ جو ہماری غیبت کرتا پھرتا ہے۔ اسے یہ پیش کرو اور ہماری طرف سے کہو کہ یہ تحفہ حسن بصریؒ نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں آپ کا شکرگزار اور ممنون ہوں، کہ آپ نے میری غیبت کر کے اپنی نیکیوں کو میرے دفتر اعمال میں منتقل کر دیا۔ میں آپ کی یہ عنایت ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ اگرچہ میں آپ کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا تاہم یہ حقیر سا تحفہ قبول فرمایئے۔"

مرید خاص نے حضرت حسن بصریؒ کے حکم کی تعمیل میں آپ کا پیغام اور چھوہاروں سے بھرا طباق غیبت گو تک پہنچایا۔ وہ حضرت بصریؒ کے قول و فعل سے از حد متاثر اور اپنے کیے پر شرمندہ اور نادم ہوا۔ اس نے حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی طلب کی اور غیبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تائب ہو گیا۔

سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۲ میں رب کائنات ارشاد فرماتے ہیں:

"اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچتے رہو، بلاشبہ بعض گمان گناہ ہیں اور جاسوسی بھی نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کیا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ سو اس

www.pdfbooksfree.pk

کو تم نہ پسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔"

کڑوے خربوزے کی مٹھاس

آقا اور غلام کا رشتہ حاکم و محکوم کا ہوتا ہے۔ آقا کی خوشی اور خوشنودی کی خاطر غلام ہر وقت برائے خدمت تیار رہتا ہے۔ مگر بعض غلام ایسے بھی ہیں جو اپنی ظاہری خوبیوں، باطنی خاصیتوں اور عملی خوبصورتیوں کی بدولت آقا کے دل میں ایسا مقام پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ ان کا گرویدہ بن جاتا ہے۔

ایسا ہی غلام ایک بادشاہ کے دربار میں شاہی خدمت پر مامور تھا۔ بادشاہ اپنے غلام کی عقل و دانائی سے از حد متاثر تھا اور اس کا برملا اظہار بھی کرتا۔ بلکہ بعض اوقات ایسے مواقع بھی پیدا ہو جاتے جب بادشاہ اپنے غلام کی تعریف بھرے دربار میں بڑے فخر سے کیا کرتا۔

ایک دفعہ ایک شخص بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ کافی منزلیں طے کر کے بادشاہ سے ملاقات کرنے پہنچا تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے بادشاہ کی خدمت میں بطور تحفہ ایک خربوزہ پیش کیا۔ بادشاہ نے سوغات قبول کی اور اپنے خاص غلام کو آواز دی تاکہ خربوزہ اسے کھلا سکے۔ بادشاہ کا معمول تھا کہ وہ کوئی چیز اپنے خاص غلام کو کھلائے بغیر نہیں کھاتا تھا۔ مگر وہ خاص غلام دربار میں موجود نہیں تھا چنانچہ ایک نوکر دوڑایا گیا کہ وہ شاہی غلام کو بلا لائے۔

بادشاہ کا پیغام ملتے ہی شاہی غلام حاضر خدمت ہوا اور عرض کی "فرمائیے آقا! میرے لائق کوئی خدمت ہے؟"

بادشاہ نے کہا "ادھر میرے قریب آؤ۔"

مقرب غلام آقا کے قریب گیا۔ بادشاہ نے تحفہ میں آیا خربوزہ اٹھایا اور ایک قاش کاٹ کر غلام کو کھانے کے لیے دی۔

غلام نے انتہائی رغبت اور چاہت کے ساتھ وہ قاش کھائی اور الحمدللہ کہا۔ غلام کی پسندیدگی دیکھ کر بادشاہ نے ایک اور قاش کاٹی اور غلام کو دی۔ اس نے اسے پہلے سے بھی زیادہ خوشی اور مسرت کے ساتھ کھایا اور رب کا شکر جبکہ بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح بادشاہ نے منظور نظر غلام کو خربوزے کی ایک ایک قاش کاٹ کر دی جسے وہ مزے لے لے کر کھاتا گیا۔

آخرکار خربوزے کی آخری قاش بچ گئی۔ بادشاہ نے یہ دیکھنے کے لیے کہ جس خربوزے کو غلام اتنی خوشی سے اور شادمانی کے ساتھ کھا رہا ہے، کس قدر عمدہ اور لذیذ ہوگا، آخری قاش منہ میں ڈال لی۔ لیکن چکھتے ہی اگل دیا کیونکہ وہ نہایت تلخ، کڑوی اور بدمزہ تھی۔

بادشاہ نے مقرب غلام سے کہا "مجھے از حد حیرانی ہے کہ تم اتنا کڑوا اور زہر کے مانند خربوزہ کھاتے رہے اور یہ نہ کہا کہ یہ کھانے کے قابل تو کیا چکھنے کے قابل بھی نہیں۔"

گردش زمانہ کے ہاتھوں بنے غلام مشہور زمانہ شخصیت، لقمان نے دست بستہ عرض کی "بادشاہ سلامت! آپ مجھے انتہائی محبت و شفقت کے ساتھ کھلا رہے تھے۔ مجھے شرم محسوس ہوئی کہ آپ کی خوشی کو بدمزگی میں بدل دوں۔ مزید یہ کہ میں نے آپ کے ہاتھوں ہزاروں انتہائی لذیذ اور خوش ذائقہ نعمتیں کھائی ہیں۔ اگر آج ایک تلخ چیز کھانے کو ملی، تو یہ مناسب نہیں سمجھا اس کے کھانے سے انکار کر دوں اور محض خربوزے کی کڑواہٹ کی وجہ سے آپ کے حکم کی بجا آوری کے بجائے حکم عدولی کر دوں۔"

آئیے اپنے آپ سے سوال کیجیے کہ کیا ہم اپنے مالک حقیقی کی ہزاروں نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود کبھی کبھار ہلکی سی کڑواہٹ محسوس کریں، تو شکوہ و شکایت پر تو نہیں اتر آتے؟

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

درد کی شدید لہر نے زور و شور سے بلا گھماتے یاسر کو بے چین کر دیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی کمر اور ریڑھ کی ہڈی کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ کیا ہوا تھا؟ وہ اپنی کراہٹوں پر بند باندھتے پیچھے سہلانے لگا۔ مگر درد کی دوسری لہر نے گویا اسے جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ بلا ہاتھ سے گر گیا۔ بے حد شدید درد وقفے وقفے سے اٹھ رہا تھا۔ جلد ہی اس کی شدت ناقابل برداشت ہو گئی۔

"اے یاسر! ایسے کیوں بیٹھے ہو؟ خیریت کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" امی جان جو گیٹ بند کر کے آ رہی تھیں اسے مٹی پر بیٹھ کر ہائے ہائے کرتا دیکھ گھبرا گئیں۔

"امی میری کمر میں شدید درد ہو رہا ہے۔" یاسر آنسو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"بیٹا یقیناً آپ نے آج اسکول سے پھر الٹا سیدھا کھا لیا ہو گا۔" امی نے جھٹ نتیجہ اخذ کر کے اپنا اندازہ لگایا۔

"امی میں نے کہیں سے کچھ نہیں کھایا۔ آج دوپہر کا کھانا آپ سب کے ساتھ کھایا تھا۔ اور درد بھی پیٹ میں نہیں کمر میں ہو رہا ہے۔" یاسر خفگی سے بولا۔

"یہ منحوس بلا اور گیند بھی بچوں کے لیے بُری ہے۔ اتنا بڑا بلا لے کر کھیلنے سے کمر میں جھٹکا آ گیا ہو گا۔" امی نے فوراً دوسری تشخیص کی۔

"امی! یہ بلا میں نے ابھی اٹھایا ہے۔ بلکہ اس سے کھیلنا شروع بھی نہیں کیا۔ آپ یوں کریں مجھے کوئی دوا لا دیں۔" وہ بولا۔

ملک و قوم کا درد رکھنے والے

بچے نے بزرگوں کو سبق سکھایا

کبھی کبھی بے شمار الفاظ پر عمل کا ایک لمحہ بھاری ہوتا ہے

صائمہ محبوب

www.pdfbooksfree.pk

"ہاں ہاں! دوا لا دوں۔ ارے کیا پتا کہ درد کہاں ہے، کیوں ہے؟ کیسے ہوا ہے فوراً دوا لا کر دے دوں۔"

وہ کچھ لمحے خاموش رہیں، پھر بولیں "تم یوں کرو سیدھے کھڑے ہو تاکہ اندازہ ہو سکے کہیں چک تو نہیں پڑ گئی۔" امی نے پیار سے یاسر کو کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ اس کا درد سے برا حال ہو رہا تھا۔ بمشکل کھڑا ہوا۔ امی نے اسے جھکایا اور پھر سیدھا کر کے تسلی کی کہ کمر میں چک کا کوئی مسئلہ نہیں۔

یاسر کی کمر میں ہنوز شدید تکلیف تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ابو جان، دادا جان اور دادی جان بھی اکٹھے ہو گئے۔ اب چاروں طرف سے تشخیص بھی ہونے لگی اور ٹوٹکے بھی بتائے جانے لگے۔ تمام افراد خانہ اس نکتے پر متفق تھے کہ یاسر کے اسکول کی کینٹین میں غیر معیاری چیزیں ملتی ہیں۔ یہ الگ بات تھی کہ گھر کے چاروں بزرگ ہر روز ایک دوسرے سے چھپ کر یاسر کو جیب خرچ دیا کرتے تھے۔

"امی! چھوڑیں کینٹین کو، کوئی درد کی دوا دیں۔"

یاسر نے خفیف آواز میں کہا مگر چاروں بزرگ اب تک اپنی بحث میں مصروف تھے۔ دادا جان سب کو غیر ذمے دارانہ رویوں پر لیکچر دے رہے تھے اور دادی انھیں دو بدو جواب دینے میں محو تھیں۔ ابو جان یاسر کے کھانے پینے کے طور طریقوں سے نالاں تھے، تو امی سب کے بے جا لاڈ پیار پر! آخر یاسر گھر بھر کا اکلوتا اور لاڈلا بچہ جو تھا۔

دادا جان کو بالآخر یاسر کا خیال آ ہی گیا، بولے "بیگم! اسے میری دواؤں میں سے درد کی گولی دے دو۔"

"ارے کمال کرتے ہیں آپ، بچے کو بزرگ کی دوا کیسے دی جا سکتی ہے؟" دادی جو کالج میں پڑھاتی تھیں، فوراً بولیں۔

"اچھا وہ نہ سہی اپنی دے دو۔" دادا جان اس وقت پوتے کی تکلیف دیکھتے ہوئے صلح کے موڈ میں تھے ورنہ اس بات پر عالمی جنگ شروع ہو چکی ہوتی۔

"ہاں ہاں، آپ تو بزرگ ہیں اور میں بچی کہ میری دوا بچہ کھا کر بھلا چنگا ہو جائے گا۔" دادی خفا ہو گئیں۔

دادا جان صحافی اور استاد تھے۔ دادی کی رائے تھی، ملازمت سے ریٹائرمنٹ پر انھوں نے معروف تجزیہ نگار اور صحافی کے القابات زبردستی نام کے ساتھ لگا لیے۔ ورنہ موصوف گھر کے حالات کا جائزہ لینے سے بھی قاصر تھے۔ ملکی حالات کا تجزیہ کیسے کرتے؟"

"دادی جان! بہت درد ہو رہا ہے۔" یاسر اب پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔

"آپ سب اپنی باتیں چھوڑیں، یاسر کو اسپتال لے چلتے ہیں۔" اب امی پریشان ہو گئیں۔

"بیگم! کوئی درد کی گولی تو دے دو، پھر چلتے ہیں۔" ابو جان پر بھی یاسر کے آنسو خاصا اثر کر رہے تھے۔ امی جلدی سے درد کا سیرپ لے آئیں۔ ابو کمر کی مالش کرنے بام لے آئے تو دادا جان درد ختم کرنے والا چورن۔ دادی دعائیں پڑھ پڑھ کر یاسر پر پھونک رہی تھیں۔ یاسر تو سب کی جان تھا۔

اسے اندر کمرے میں کمبل اوڑھا کر لٹا دیا گیا۔ گھر کے چاروں بزرگ اس کے گرد آن بیٹھے۔ یاسر کو ہلکی سی نیند آ گئی مگر یہ غنودگی تھوڑی دیر کے لیے تھی۔

"امی!" اس کی چیخ نے سب کو ہوشیار کر دیا۔ "امی! درد ہو رہا ہے۔" تھوڑی ہی دیر بعد اسے متلی اور پھر قے آنی شروع ہوئی۔

"ڈاکٹر کو گھر بلا لیتے ہیں۔" دادا جان نے تجویز دی۔

"نہیں اسے اسپتال لے جانا زیادہ بہتر رہے گا۔" دادی نے رائے دی۔ ابو فوراً گاڑی کی چابی لیتے اندر چل دیے۔ یاسر کو امی جان سہارا دے کر باہر لے آئیں۔ ایک سرکاری اسپتال نزدیک ہی واقع تھا۔ وہاں صفائی کی

www.pdfbooksfree.pk

صورت حال خراب تھی مگر ڈاکٹر قابل اور مستعد تھے۔

اسپتال میں خاصا ہجوم تھا۔ بے شمار مریض اور ان کے لواحقین بیٹھے تھے۔ یاسر کو ایک اسٹریچر پر ڈال کے اندر لے جایا گیا۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسوں نے یاسر کو دیکھا۔ فوری ٹیسٹ لیے اور پھر ایک ٹیکا لگا دیا۔ یاسر کو یوں لگا جیسے درد کی لہر میں رفتہ رفتہ کمی ہونے لگی ہے۔ اس پر سکون سا طاری ہونے لگا اور وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ فضا میں دواؤں اور ڈیٹول کی ملی جلی بو رچی بسی تھی۔ سامنے بینچ پر چاروں بزرگ تیمار دار بیٹھے گفتگو میں مصروف تھے۔ موضوع گفتگو اسپتال کی گندگی و غلاظت تھی اور مریضوں کی حالت، ہجوم اور بدحواسی!

دادا جان، معروف تجزیہ کار سب کو اپنا مشاہدہ بتا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ افسوس بھی کرتے جاتے کہ وہ اپنی ڈائری ساتھ لانا بھول گئے۔

ابا جان کے خیال میں اب مزید اس ملک میں رہنا اپنی نئی نسل سے دشمنی کرنا تھا۔ بچوں کی بہترین تربیت اور اچھے مستقبل کے لیے پاکستان جلد از جلد چھوڑنا ضروری ہو چکا۔ یاسر آنکھیں بند کیے سب کی باتیں سن رہا تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی غسل خانے سے آتی ٹپ ٹپ پانی کی آواز اسے بے آرام کر رہی تھی۔

وہ چاروں خراب نلکوں اور پائپوں پر بھی تنقید کر رہے تھے۔ دادا جان مسلسل اپنے حکمرانوں کی بے حسی پر ماتم کناں تھے۔ دادی جان کے دکھی دل سے دعائیں نکل رہی تھیں کہ کاش لوگوں کو صفائی کا احساس ہو جائے۔ وہ صفائی کی اس صورت حال کا ذمے دار ڈاکٹروں کو ٹھہرا رہی تھیں۔ امی کو شکوہ اسپتال کے جمعدار سے تھا۔

یاسر کے لیے جب پانی گرنے کی آواز ناقابل برداشت ہونے لگی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور اپنے بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے بیٹا! کیسے ہو؟ درد تو نہیں ہو رہا۔" انھوں نے یاسر کو کھڑا پایا، تو حیرت سے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"امی!"

"جی بیٹا کیا بات ہے؟" وہ فوراً یاسر کے پاس آ گئیں۔

"امی! پانی ضائع ہو رہا ہے۔ میں نلکا بند کر دوں۔" یہ کہہ کر یاسر آہستہ آہستہ ملحق غسل خانے کی طرف چل دیا۔

چاروں بڑے پھر اپنی علمی اور تجزیاتی گفتگو میں محو ہو گئے۔

"یہ بالکل ٹھیک تھا... فوراً بند ہو گیا۔ درحقیقت قصور نہ تو بے حس حکمرانوں کا تھا، نہ بے خبر ڈاکٹر کا، نہ غیر ذمے دار جمعدار کا۔ قصور ان سب کا تھا جنھوں نے کچھ سنوارنے کی کوششیں ہی نہیں کیں۔

طوفاں سے اک شہر کے در پے ہوں جیسے جاؤ، کچھ تو کرو
کھڑکی کے شکستہ شیشے پہ کاغذ ہی لگاؤ، کچھ تو کرو

یاسر غسل خانے سے باہر آیا، تو بولا "مجھے پانی ضائع ہونے کا خیال تنگ کر رہا تھا۔ اسی لیے نلکا بند کرنے چلا گیا۔"

یہ سن کر چاروں بزرگ خاموش ہو گئے۔ دادا جان نے شرمندہ ہو کر دادی جان کی طرف دیکھا جو فخر سے اپنے پوتے کو دیکھ رہی تھیں۔ "دیکھا میں نہ کہتی تھی صرف ٹی وی چینل پر بیٹھ کر تجزیہ اور تنقید کرنے کے بجائے کچھ عملی کام بھی کیا کریں۔" وہ بولیں۔

"دادو! اب اس قوم کے بچے یہ عملی کام کیا کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔" یاسر دادا جان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے خوشی سے بولا۔ آج اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بے شمار الفاظ پہ عمل کا ایک لمحہ ہمیشہ بھاری ہوتا ہے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

مجھے مشوروں سے بچاؤ!

...ایک مریض کی دہائی

عبدالغفار نوابشاہی

e.net

۲۰۱۴ء کا آخری دن تھا۔ صبح سویرے نماز کی تیاری کے لیے مسواک کی تو کچھ زبان سے ٹکرائی تو معمولی چبھن محسوس ہوئی۔ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد شیشے میں دیکھا تو زبان پر ایک چھالا نظر آیا۔ معمول کے مطابق آٹھ بجے سے پہلے آفس حاضر ہوا۔ نصف دن تک تدریسی خدمات انجام دیتا رہا۔ مگر منہ کے چھالے نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ یوں ڈاکٹر صاحب کے پاس جانا پڑا۔ انھوں نے دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے نسخہ تھما دیا۔

مجھے یقین ہے کہ صحت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا رات سے جو کچھ بھی پیٹ میں ڈالا تھا، ڈاکٹر صاحب کے سامنے اس کی صورت بیان کی اور کافی متاثر ہوا۔ ہمارے نسخے کا انتظار کرنے لگے مگر جیسا دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے اپنے انداز سے یہ تاثر دیتے ہوئے کہ معمولی بات ہے، نسخہ لکھا مگر ساتھ ہی ایک مرتبہ چیک اپ کرانے کا حکم بھی صادر فرمایا۔

میں جامعہ کے احاطے میں واقع ہاسٹل میں اپنے کمرے واپس آیا۔ کچھ دیر بعد درد محسوس ہوا تو بڑھتا ہی چلا گیا۔ اب تو بات کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ دوست احباب خیریت معلوم کرتے، تو انھیں اپنی زبان کی تکلیف سے آگاہ کرتا اور دعا کی درخواست کر کے خاموش ہو جاتا۔ مگر قربان جاؤں کہ ہر دوست مخلص نکلا اور دعا کے ساتھ ایک نسخہ بھی بتاتا۔ ساتھ ساتھ دوا لینے کا مشورہ بھی دیتا۔

یہ دیکھ کر مجھے دو سال پہلے کا ایک قصہ یاد آ گیا۔ میرے ایک دوست نے مجھے فون پر اپنی ناساز طبیعت سے آگاہ کیا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ بولے "حکیم صاحب کے پاس جانا ہے، آپ بھی چلنا۔" مجھے ناگوار گزرا کہ کمال ہے، نیم حکیم تو میں بھی ہوں، کیا میرا اتنا بھی حق نہیں۔ پھر یہ شعر پڑھ کر خود کو تسلی دی:

دوست بے وفا تو وفا کرو، جو اثر نہ ہو تو دعا کرو
نہ چاہو برا کبھو، یہ دوستی کے خلاف ہے

میں دوست کے ساتھ پسندیدہ حکیم کے پاس پہنچا۔ انتظار گاہ میں بیٹھتے ہی دوست ساتھ بیٹھے مریض سے

www.pdfbooksfree.pk

سرگوشی کرنے میں مصروف ہو گئے۔ میں دل ہی دل میں شکر کر رہا تھا کہ میں مریض نہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب کسی کو مرض میں مبتلا دیکھو تو اپنے تندرست ہونے پر شکر کرو۔

کچھ دیر بعد میرے دوست حکیم صاحب سے مل کر باہر نکلے۔ ان کے چہرے پر عجیب تیز مسکراہٹ دیکھ کر وجہ دریافت کی۔ دوست نے بتایا کہ حکیم کے پاس جانے سے پہلے جو صاحب سرگوشی کر رہے تھے، انھوں نے مجھے مرض سے نجات کے لیے کچھ غذائیں استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

میں نے کہا "اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ آپ کو تو ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کہ لائن کے دوران میں آپ کو مفت مشورہ مل گیا۔"

کہنے لگے "مگر بات یہ ہے کہ داخلی اور خارجی حکیم صاحبان کی باتوں میں بڑا تفاوت ہے۔ خارجی حکیم نے جو مشورہ دیا، وہ داخلی حکیم کے بالکل خلاف ہے۔ اب کیا کروں؟"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ نیم حکیم خطرۂ جان، نیم ملا خطرۂ ایمان کا استحضار کرو اور داخلی حکیم کی ہدایت مان لو۔"

یہ ہمارا بڑا المیہ ہے کہ آج قوم کا ہر فرد دینی مسئلہ ہو یا طبی حل بتاتے اور دوا تجویز کرتے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ ایسے ہی میرے پاس بھی شام تک ڈھیر سارے نسخے جمع ہو گئے، مگر درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

خیر رات گزری۔ ۲۰۱۵ء کی پہلی صبح جماعت میں گیا، تو بے اختیار چلنے والی زبان نے بآسانی کچھ کہنے سے معذرت کر دی۔ اپنی ہر بات سفید تختے کی مدد سے طلبہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ جماعتیں لینے کے بعد اپنی رہائش گاہ آیا، تو یکایک میرا خیال سرکار دو عالم ﷺ کے فرمان کی طرف گیا۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں "جو خاموش رہا اس نے نجات پائی۔" حضرت سلیمان علیہ السلام کا فرمان ہے "اگر بات چیت کرنا چاندی ہے، تو خاموش رہنا سونا۔" اگر خاموشی میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں غور و فکر کیا جائے تو کیا کہنے۔

ذرا غور کیجیے کہ آج ہمارا معاشرہ زبان کے غلط اور بے جا استعمال کی وجہ سے کس قدر بے چینی کا شکار ہے۔ زبان سے نکلنے والی کئی باتیں نہ صرف گناہ ہیں بلکہ معاشرے کے بگاڑ کا سبب بھی بنتی ہیں۔ مثلاً جھوٹ، غیبت، بہتان، تمسخر، چغل خوری اور احسان جتلانا۔ یہ وہ چند بدترین گناہ ہیں جو معاشرے کے لیے کسی مہلک بیماری سے کم نہیں۔ ان کی وجہ سے ہمارا اخوت و بھائی چارے والا معاشرہ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔

ان گناہوں کا پہلا نشانہ اپنے ہی لوگ بنتے ہیں۔ مثلاً خدانخواستہ کوئی جھوٹ بولنے کا عادی ہے، تو وہ اسکول میں ہے تو استاد سے جھوٹ بولنے کا، گھر میں ہے تو والدین سے، تاجر ہے تو اپنے گاہک سے جھوٹ بولے گا۔ اسی طرح غیبت بھی اپنے ہی لوگوں کی جاتی ہے۔ یہ سب گناہ زبان ہی سے سرزد ہوتے ہیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ایک شعر ہے ؎

جراحات السنان لها التئام
ولا يلتام ما جرح اللسان

(تیر و تلوار کے زخم بھر جاتے ہیں مگر زبان کے زخم نہیں بھرتے)۔

(مضمون نگار جامعہ دارالعلوم کراچی میں استاد کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں)

www.pdfbooksfree.pk

ہم وطنوں کے لیے منفرد تحفہ

موبائل بیٹری تا دیر چلائیے

بیٹریوں کی بجلی بچانے والے مفت ٹوٹکوں کا بیان

ابوصارم

یہ ۱۹۹۹ء کی بات ہے جب جاپانی کمپنی، این ٹی ٹی ڈوکومو (NTT Docomo) نے دنیا کا پہلا باقاعدہ اسمارٹ فون متعارف کرایا۔ اسمارٹ فون سے مراد ایسا موبائل فون ہے جس میں آپریٹنگ سسٹم موجود ہو مثلاً ونڈوز ۸، اینڈرائڈ۔ گویا یہ چھوٹے سے ایسے کمپیوٹر ہیں جو روزمرہ کے بیشتر کام انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔

اسمارٹ فون عام موبائل سے کچھ مہنگے ہیں لیکن ان کی قیمت بتدریج گھٹ رہی ہے۔ اسی باعث پاکستان میں بھی لوگ کثیر تعداد میں اسمارٹ فون خریدنے لگے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق اب ایک کروڑ سے زائد پاکستانی اسمارٹ فون استعمال کر رہے ہیں۔ جبکہ حالیہ اعدادوشمار کے مطابق ۱۳ کروڑ سے زائد پاکستانی موبائل فون رکھتے ہیں۔

موبائل کے برعکس اسمارٹ فون پروسیسر استعمال کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ بجلی بھی زیادہ کھاتے ہیں۔ اس باعث اسمارٹ فون کی بیٹری چارجنگ کے بعد جلد خرچ ہو جاتی ہے۔ تاہم بعض احتیاطی تدابیر اختیار کر لی جائیں، تو بیٹری کا دورانیہ بڑھ سکتا ہے۔ اہم تدابیر کا بیان درج ذیل ہے:

۱۔ اگر آپ نے اسمارٹ فون استعمال نہیں کرنا، تو اسے بند (Off) کر دیجیے۔ یوں بجلی کی اچھی خاصی بچت ہو جاتی ہے۔

۲۔ جس علاقے میں نیٹ ورک کمپنی کے سگنل نہیں آ رہے یا وہ کمزور ہیں، تو فون بند کر دیجیے۔ وجہ یہ کہ سگنلوں کی تلاش میں فون اپنی بیٹری کی ساری بجلی ضائع کر دیتا ہے۔ لہٰذا فون اسی جگہ چلائیے جہاں طاقتور سگنل آ رہے ہوں۔

۳۔ اسمارٹ موبائل فونوں میں لیتھیم (Lithium) کی بیٹریاں استعمال ہوتی ہیں۔ ایسی بیٹری کی اگر ساری چارجنگ استعمال کر لی جائے اور پھر اسے چارج کیا جائے، تو وہ جلد خراب ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اپنے فون کی بیٹری کی چارجنگ ختم نہ ہونے دیجیے۔

بہتر ہے کہ جب بیٹری کی چارجنگ ۲۰ تا ۳۰ فیصد رہ جائے، تب اسے چارج کر لیں۔ زیادہ جلد اور بار بار چارج کرنے سے بیٹری زیادہ عرصہ نہیں چلتی۔

۴۔ فون میں لرزنے (Vibration) کا بٹن بند ہی رکھیے۔ وائبریشن آن کرنے سے فون بجلی زیادہ کھاتا ہے۔ مزید برآں گھنٹی کی آواز بھی اتنی رکھیں جتنی با آسانی سن سکیں۔

۵۔ کال کا دورانیہ مختصر رکھیے اور ضروری باتیں کیجیے۔ بعض مرد و زن بیٹری ختم ہونے تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں بیٹری جلد خراب ہو جاتی ہے۔

۶۔ فون کی ایسی خصوصیات بند کر دیجیے جو بوقت ضرورت ہی استعمال ہوتی ہیں۔ ان میں بلیو ٹوتھ، وائی فائی، جی پی ایس وغیرہ شامل ہیں۔ اگر ان ایپلی کیشنوں کو چالو رکھا جائے تو وہ مسلسل اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ یوں وہ متواتر بجلی استعمال کرتیں اور بیٹری جلد ختم کر دیتی ہیں۔

۷۔ فون کی روشنی (Brightness) کم رکھیے۔ اسکرین زیادہ روشن رہے تو وہ بھی وافر بجلی کھاتی ہے۔

۸۔ کوشش کیجیے کہ تھری جی استعمال نہ کریں۔ اسے استعمال کرنے سے فون "ڈٹ" کر بجلی کھاتا ہے۔ یا پھر ضرورت کے وقت ہی تھری جی کام میں لائیے۔

۹۔ اسمارٹ فون کے بیک گراؤنڈ یا پس منظر میں حرکت پذیر یا ایسی متحرک تصاویر یا ویڈیو استعمال نہ کیجیے۔ حرکت کرتی تصاویر بیٹری جلد خالی کر ڈالتی ہیں۔

۱۰۔ بہتر یہ ہے کہ بیک گراؤنڈ خالی یا سیاہ رکھیے۔ یوں بیٹری زیادہ دیر زیر استعمال رہتی ہے۔

۱۱۔ یہ یاد رکھیے کہ نئی بیٹری مکمل طور پر چارج کر کے استعمال کیجیے۔ نکل کی بیٹری ۱۴ گھنٹے میں چارج ہوتی ہے۔ جبکہ لیتھیم بیٹری پانچ چھے گھنٹے لگاتی ہے۔ اس سے پہلے فون کہے کہ بیٹری فل ہو چکی، تو اس کی بات پر دھیان نہ دیں۔

۱۲۔ فون کو کبھی دھوپ میں یا گرم جگہ نہیں رکھیے۔ تپش میں بیٹری کی توانائی خارج ہونے لگتی۔ اسی لیے اسے معمول کے درجہ حرارت میں رکھیے۔ اگرچہ چارجنگ کے وقت بیٹری گرم ہو جائے، تو اس کا مطلب ہے کہ چارجر خراب ہو چکا۔ اسے جلد تبدیل کر دیجیے۔

۱۳۔ بیٹری اور فون کے دھاتی مقامات اتصال (Contacts) پر رفتہ رفتہ گرد و میل جم جاتی ہے۔ اس وجہ سے بیٹری اور فون کے درمیان بجلی کی منتقلی صحیح طرح نہیں ہوتی۔ لہٰذا وقتاً فوقتاً روئی سے نرمی کے ساتھ یہ مقامات اتصال صاف کرتے رہیے۔

۱۴۔ بیٹری طویل عرصہ بعد چارج ہو یا جلد گرم ہو جائے، یا پھول جائے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ جواب دے چکی۔ لہٰذا اسے بدل دیجیے۔

۱۵۔ تقریباً سبھی اسمارٹ فونوں میں لوکیشن سروسز (Location Services) موجود ہوتی ہے۔ اس کو بھی بوقت ضرورت ہی استعمال کیجیے۔ ورنہ یہ مسلسل آن رہنے کی صورت میں بیٹری کھائے گا۔

۱۶۔ جدید اسمارٹ فون مختلف ایپلی کیشنوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ کئی ایپلی کیشنیں یا سافٹ ویئر پس منظر میں بھی کام جاری رکھتے ہیں۔ یوں وہ بیٹری ختم کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ لہٰذا جن ایپلی کیشنوں کی ضرورت نہیں، انھیں چالو حالت میں نہ رکھیے۔ آپ بیٹری کی حیرت انگیز بچت پائیں گے۔

۱۸۔ اسمارٹ فون کی کمپنیاں نت نئے سافٹ ویئرز بناتی رہتی ہیں۔ لہٰذا انٹرنیٹ پر ان سے رابطہ رکھیے۔ نو ایجاد سافٹ ویئر ایسی خرابیاں دور کرتے ہیں جو بیٹری سمیت اسمارٹ فون میں پائی جاتی ہیں۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

ایک دکھی دل کی پکار

شاہ رخ خان! اس سے مل لو

گور کنارے بیٹھی ایک
بدقسمت عورت کا الم ناک ماجرا

نیلم احمد بشیر

ان دنوں میں اپنی بچی عنبر کے پاس امریکی ریاست ورجینیا میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ یہ وہ خوبصورت ریاست ہے جہاں ایک زمانے میں کاروں کی نمبر پلیٹوں پہ لکھا ہوتا تھا "ورجینیا از فار لورز" (ورجینیا عاشقوں کے لیے ہے) اب نمبر پلیٹوں پہ یہ لکھا دیکھنے کو نہیں ملتا۔ شاید اس لیے کہ امریکا کے حالات اتنے بدل چکے ہیں کہ ایسے رومانوی خیالات کا ذکر اب نمبر پلیٹوں پہ کرنا مناسب نہیں رہا۔ اب امریکیوں کو دہشت گردی، جنگوں، بیروزگاری اور معاشی بحران جیسے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

ورجینیا امریکی دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی سے جڑی ریاست ہے۔ ایئرپورٹ سے باہر نکلیں تو صاف ستھرے شہر کو دیکھ کر مجھے اس پہ بھی پیار آنے لگتا ہے۔ پرشکوہ عمارات، کشادہ و سرسبز و شاداب باغات اور پہلے سے منظم ہوا والا واشنگٹن ڈی سی وہ خوبصورت شہر ہے جہاں سے عالم دنیا کے کئی ملکوں کے لیے بدصورت فیصلے صادر ہوتے ہیں۔

میری بچی عنبر دارالحکومت کے قریب ہی رہتی ہے۔ وہ ڈی سی کی ایک یونیورسٹی میں ملازمت کرتی ہے۔ اسے اساتذہ اپنی اچھی کارکردگی پہ شاباش اور توصیفی اسناد ملتی ہیں۔ پچھلے دنوں اس کی تنخواہ میں اچھا خاصا اضافہ ہوا تو وہ بہت خوش ہوئی اور مجھے زبردست کھانا کھلایا۔ وہ ہمیشہ مجھ پہ دل کھول کر پیسے خرچ کرتی ہے۔ شام کو ہم ماں بیٹی چہل قدمی کرنے واشنگٹن ڈی سی کے خوبصورت پارکوں میں نکل جاتی ہیں۔ میں اس اونچی شان والے خوبصورت شہر کی سج دھج اور جاہ و جلال دیکھ کر سوچتی ہوں، "کاش میرے ملک کے شہر بھی ایسے ہی پرشکوہ ہوتے۔ کاش ہم نے مشکلوں سازی کی صنعت و حرفت

www.pdfbooksfree.pk

دینے کے بجائے سائنس و ٹیکنالوجی کی محبت کو اپنی منزل بنایا ہوتا۔ ہم پھر اپنا دیس چھوڑ بے وطن ہو کر دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور نہ ہوتے۔

پچھلے چند دنوں سے شہر میں بھارتی فلمی اداکاروں کی ایک تفریحی تقریب کا بہت چرچا تھا۔ ٹی وی پر اشتہار چل رہے تھے۔ انٹرنیٹ پر ٹکٹ بک ہوتے ہر طرف "پروموشن پوسٹرز" لگ گئے۔ مجھے یہ شو کافی پُرکشش دکھائی دیا۔ جی میں آیا، ہم بھی یہ مزے دار شو دیکھیں؟ شبیر نے مجھ سے کہا اور سو سو ڈالر کی دو ٹکٹیں خرید لیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پہ بہت خوش تھی۔ میں نے بہت سال پہلے امریکا میں اسی قسم کا اچھا بھی شو دیکھا تھا۔ تب وہ جوان تھی اور ہم بھی۔ لیکن اب عرصہ دراز سے اس قسم تفریح دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

میں نے بھی یہ سوچ کر خوشی خوشی ہامی بھر لی "اچھا ہے، چلے چلتے ہیں، مزا آئے گا۔" ہم واشنگٹن ڈی سی کے ایم سی آئی سنٹر میں ہونے والے اس شو کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے، بھارتی فلمیں ہم سب کی زندگی کا اہم حصہ بن چکیں۔ ہر گھر میں ذوق شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ بھارت، پاکستان، نیپال، بنگلہ دیش، یورپ، امریکا، جہاں جہاں بھی برصغیر کے لوگ آباد ہیں، یہ فلمیں تفریح کا بڑا ذریعہ ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ مغربی ممالک میں رہنے والے لوگوں کے بچوں کو اردو زبان، تہذیب اور رسم و رواج کی تعلیم دینے میں بھارتی فلموں کا ہاتھ ہے، تو غلط نہ ہوگا۔

کاش ہم نے کشکول سازی کی صنعت کو فروغ دینے کے بجائے سائنس و ٹیکنالوجی کی محبت کو اپنی منزل بنایا ہوتا۔ ہم پھر اپنا دیس چھوڑ بے وطن ہو کر دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور نہ ہوتے۔

آج بھارتی فلمیں بین الاقوامی معیار کے مطابق بنتی اور بین الاقوامی مارکیٹ میں خوب چلتی ہیں۔ بالی وڈ کا ہم پلہ ہالی وڈ سینما بھی دنیا بھر میں اپنے مداح پیدا کر چکا۔ اسی لیے بھارتی اداکاروں کے شو بہت کامیاب رہتے ہیں۔ اس شو کے اہم فنکاروں میں سیف علی خان، پریتی زنٹا، رانی مکھرجی، پریانکا چوپڑہ شامل تھے۔ مگر سب سے زیادہ جس کی خاطر لوگ شو دیکھنے جا رہے تھے، وہ تھا "سپر اسٹار" اداکار شاہ رخ خان!

سالہا سال سے مقبولیت کی سیڑھی پہ چڑھا شاہ رخ آج بھی اپنے مداحوں کے لیے نمبر ون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی اداکاری، شخصیت اور فن نے سبھی کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ ہم ماں بیٹی اور قریبی شہر بالٹی مور میں رہنے والی میری بھابی فرح تینوں شو دیکھنے گھر سے نکل پڑے۔ شبیر کا خیال تھا کہ پارکنگ کے مسئلے کی وجہ سے ہم مقامی ریل سے سفر کریں، تو بہتر ہے۔ یہی سوچ کر ہم اسٹیشن کی طرف چل دیے۔ نیویارک کی نسبت واشنگٹن ڈی سی کی میٹرو ٹرین اور اسٹیشن بہت صاف ستھرے اور خوبصورت لگے۔ اسٹیشن کی گول چھت اور کنکریٹ سے بنے ڈیزائن سراہتے ہم کچھ ہی دیر میں ریل میں سوار ہوئے۔ اس نے ہمیں ایم سی آئی سنٹر کے بالکل قریب اتار دیا۔

چند منٹ چلنے کے بعد ہم لوگ اس بڑے سنٹر تک پہنچ گئے جہاں اکثر نامور امریکی گلوکاروں کے کنسرٹس ہوتے ہیں۔ سڑک پہ ہم جیسے لوگوں کا ہجوم جنھیں امریکا میں "دیسی" کہا جاتا ہے، شو دیکھنے آیا ہوا تھا۔ اچھے اچھے

www.pdfbooksfree.pk

کپڑے پہنے بوڑھے، بچے، فیشن ایبل لڑکے اور لڑکیاں! سبھی کے چہرے ملنے والی تفریح کے خیال سے دمک رہے تھے۔ کوئی کسی کو ہیلو ہائے کہہ کر گلے ملتا، تو کوئی موبائل فون پہ آنے والے دوست کو راستہ سمجھا رہا تھا۔ امریکا میں کہیں بھی آنا جانا ہو، ہدایات کے بغیر کوئی منزل پہ نہیں پہنچ سکتا۔ ہر طرف رنگ برنگے شلوار قمیص، ساڑھیاں، پتلونیں، کڑھائی والے کرتے اور پاجامے پہنے شائقین کھڑے نظر آ رہے تھے۔ گویا خاموش امریکی سنڈے جاندار دیسی اتوار میں تبدیل ہو گیا۔

ہم عمارت کے اندر جانے کا سوچ ہی رہی تھیں کہ یک دم ہماری نظر دو پاکستانی خواتین پر پڑی۔ وہ ہماری طرف آ رہی تھیں۔ ایک نے دوسری کو سہارا دے رکھا تھا جو بڑی مشکل سے چل رہی تھی۔ جیسے ہی وہ ہمارے قریب آئیں، فرح لپک کر ان کی طرف بڑھی۔ سلام کرنے کے بعد کہنے لگی "باجی! یہ سہانہ اور اس کی بھابی ہیں۔" مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ سہانہ بالٹی مور والی؟ اور یہاں؟ وہ اس حالت میں کیسے بستر سے اٹھ کر آ گئی؟ میں حیرت زدہ تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ سہانہ بالٹی مور کی رہائشی تھی۔ فرح اکثر بتایا کرتی کہ وہ سرطان کے آخری مرحلے پہ پہنچ چکی۔ ڈاکٹروں نے مرض کی تشخیص کے بعد اس کے کئی اندرونی اعضا کاٹ ڈالے، مگر سرطان اسے چھوڑنے کو تیار نہیں، سارے جسم میں پھیل چکا۔ اس کا علاج اعلیٰ ترین اسپتالوں میں ہو رہا تھا۔ مگر ڈاکٹر بے بس ہو چکے۔ انھوں نے اسے لاعلاج قرار دے کر گھر بھیج دیا۔

ایک مرحلے پہ انھوں نے اس کا کیس برائے تحقیق کسی بڑے اسپتال کو بھیجنا چاہا، مگر سہانہ اور اس کا شوہر رضامند نہ ہوئے۔ وہ گھر جانا چاہتی تھی کیونکہ وہ چھوٹے چھوٹے بچے اس کی راہ تک رہے تھے۔ اس کی حالت بتدریج خراب ہو رہی تھی۔ کیموتھراپی سے سر کے تمام بال جھڑ چکے تھے مگر سہانہ ناامید نہ تھی۔ ہر وقت اس کے منہ پہ یہی جملہ ہوتا "شاید اللہ تعالیٰ کوئی معجزہ کر دیں، شاید انھیں چار بچوں کی ماں پہ رحم آ جائے۔"

وہ حوصلہ ہارنے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی، ہر وقت زندہ رہنے کی باتیں کیا کرتی۔ فرح نے بتایا تھا، سہانہ زندگی سے بھرپور، شوقین مزاج، ہنسی مذاق کرنے والی ہنگاموں کی دلدادہ تھی۔ اسے اچانک اپنے خوفناک مرض کے بارے میں پتا چلا۔ اب زندگی کے دیے کی لو مدھم ہو چکی تھی۔ عمر کی نقدی ختم ہو رہی تھی مگر حسرتیں تھیں کہ ان کا انبار لگا تھا۔ وہ مشکل سے سانس لیتی۔ پھر بھی گھر میں بچوں کے لیے کھانا بناتی۔ لڑکھڑاتی ٹانگوں سے ان کے چھوٹے موٹے کام کرتی اور کہتی "جتنے دن اپنے بچوں کے کام آ جاؤں اتنا ہی اچھا ہے۔"

بگڑتی حالت کے باعث وہ والدین اور بہن بھائیوں سے ملنے پاکستان جانا چاہتی تھی۔ لیکن گرین کارڈ کے مسئلے نے راستہ روک لیا۔ اور وہ واپس امریکا آنا چاہتی تھی تاکہ زندگی کی باقی ماندہ پونجی اپنے بچوں اور شوہر پہ نچھاور کر دے۔

دوسری طرف اس کے ماں باپ پاکستان میں بے چین تھے، وہ جیتے جی اس سے ملنا چاہتے تھے۔ مگر سر پٹخ رہے تھے کہ امریکن قونصلیٹ سے انھیں ویزا جاری نہیں ہو سکا۔ اب امریکیوں کو مسلمانوں پہ اعتبار نہیں رہا۔ ان کی بھرپور کوشش ہے کہ مسلمانوں کے قدم امریکا کی سرزمین سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے۔

امریکا ایک آکٹوپس کے مانند ہے۔ وہ ہر ایک کو

اپنے خوبصورت، پُرکشش نظام اور معاشی آسودگی میں جکڑ لیتا ہے۔ انسان اس کی گرفت میں پھنس کر پھر کبھی آزاد نہیں ہو پاتا۔

سب دوست احباب سہانہ سے ہنسی خوشی فون پہ بات کرتے، اس کی خیریت پوچھتے۔ وہ اس دن سے ڈرتے جب سہانہ کی جگہ اس کا میاں فون اٹھائے اور کہہ دے کہ اب وہ یہاں نہیں رہتی۔

موت وحشی چڑیل کی طرح موت کے بجز کدے الاؤ کے گرد قہقہے لگاتی ناچتی پھر رہی تھی اور زندگی ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ سہانہ شاید اپنی زندگی کا آخری تماشا دیکھنے آئی تھی کہ ایک پردہ اٹھنے اور دوسرا گرنے والا تھا۔

"تم یہاں کیسے! تمھاری صحت کیسی ہے؟" فرح نے پیار سے اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔

"طبیعت نے تو ٹھیک ہونا نہیں، میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی کچھ پُرلطف وقت گزار لوں!" اپنے گنجے سر پہ دوپٹہ ٹکانے کی کوشش کرتے سہانہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں نے بھی کہا، اگر تمھارا جی چاہ رہا ہے تو دیکھنے چلتے ہیں، ذرا طبیعت ہی بہل جائے گی۔" سہانہ کی بھابی بولی۔ اس نے پیار سے سہانہ کے چہرے پہ گرنے والا دوپٹہ ہٹایا اور ہم دھیرے دھیرے ہال کے اندر پہنچ گئے۔

"کیا تم دیر تک آرام سے بیٹھ سکو گی؟" فرح نے اپنی دوست سے پوچھا۔

"جب تک بیٹھ سکی، بیٹھوں گی، ورنہ اٹھ کر چلی جاؤں گی۔ جانا تو جانا ہی ہے۔" سہانہ کے چہرے پہ تلخ مسکراہٹ کھیلنے لگی اور میرے کلیجے میں ٹیس سی اٹھی۔

ہماری نشستیں قریب ہی تھیں، اس لیے ہم ایک دوسرے کو بآسانی دیکھ سکتے تھے۔ شور اتنا زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ روشنی اور آواز کے رنگ برنگ تماشے دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں مشتاق اور دل بے تاب تھا۔ میں بھی خوش تھی کہ عمر رسیدہ ہو جانے پر بھی موقع کی مناسبت سے بچوں کے ساتھ بچی ہو جاتی ہوں اور بڑوں کے ساتھ بڑی۔ شامل ہو جانے ہی میں عافیت ہے ورنہ وقت کی طرح بچے بھی مجھے پیچھے چھوڑ جائیں اور میں اکیلی کھڑی رہ جاؤں۔

شو شروع ہوا، پردہ اٹھا۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ پہلے اسکرین پہ شو کے لیے تیاری کی ویڈیو دکھائی گئی جس سے لوگ "وارم اپ" ہو گئے اور خوب تالیاں بجیں۔ انسانی جذبات کے حوالے شو کا موضوع تھا۔ لہٰذا جتنے فنکار اسٹیج پہ آتے گئے، ان کے آنے سے پہلے ایک جذبہ کا نام اسکرین پہ ابھرتا اور پھر غائب ہوتا رہا۔

سب سے پہلا فنکار ارجن رام پال آیا جس کے لیے جذبہ رشک (Envy) تجویز ہوا۔ اسے دیکھا تو دلی یقین آ گیا کہ اس کے لیے یہی نام موزوں تھا۔ سبز روشنیوں میں نہائے ہوئے لانبے قد، کسرتی جسم والے نوجوان اداکار کا حسن کسی یونانی دیوتا سے کم نہ تھا۔ حاضرین کی پرزور ستائش نے اس بات کی مکمل گواہی دی۔ ارجن نے چند مقبول فلمی گانوں پر رقص پیش کیا اور تالیوں کی گونج میں اسٹیج سے غائب ہو گیا۔

پردے پہ لکھے ہوئے اگلے جذبے کا نام جوش (Passion) تھا۔ جیسے ہی یہ آئٹم شروع ہوا، سارا منظر گلابی ہو گیا اور مدھر دُھنیں فضا میں تیرنے لگیں۔ حاضرین سمجھ گئے کہ پریتی زنٹا آ رہی ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس بھولی صورت والی اداکارہ کا دل کھول کر استقبال کیا۔ پریتی نے خوبصورت جھلملاتے کپڑوں میں اپنے مشہور

www.pdfbooksfree.pk

گانوں پر ناچ پیش کر کے لوگوں کو دیوانہ بنا دیا۔

میں نے کن انکھیوں سے سہانہ کی طرف دیکھا جو عنقریب جیتے جاگتے انسان سے ایک شبیہ میں تبدیل ہونے والی تھی مگر کائنات کے نظام میں اہمیت رکھتی تھی۔ وہ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان دروازہ نیم وا کیے کھڑی مشتاق آنکھوں سے جاری تماشے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ باغ حیات کی خوشبودار مہکتی روشنیوں سے اپنے لیے نشاط کی چند کلیاں چن کر دامن میں بھر لینا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وقت کے دریا میں بہتا پانی کبھی کسی نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

پھر پست قد والی سانولی سلونی اداکارہ رانی مکھرجی اسٹیج پر آئی۔ کمال فن اور چمکتے ملبوسات کا چمکار دکھا کر حاضرین کو دیوانہ کر دیا۔ لوگ اس کے رقص پر جھوم اٹھے اور خوب تالیاں بجا کر داد دی۔ سب فنکاروں کی رخصتی کے بعد ہال پر چند لمحوں کے لیے مکمل سناٹا چھا گیا۔ سہانہ نے جاتی نے میری طرف دیکھ کر پیار سے پوچھا "کہیں تم تھک گئی ہو گی؟"

"نہیں، جتنی دیر جیو گی جیوں گی۔" سہانہ ہاتھوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی اور اسٹیج پر نگاہیں گاڑ دیں۔ وہ بچہ زندگی کے نشے میں آخری بار جھوم لینے کے خیال سے خوش تھا۔ اندھیرے ہال میں جیسے ہی روشنی پھیل جانے کے بعد پردہ اٹھا نظر آیا، پردے پر چھپے ہی لفظ محبت (Love) لکھا نظر آیا، حاضرین کی آوازیں چیخوں میں تبدیل ہو گئیں کیونکہ انھیں پتا چل گیا کہ اب "ون اینڈ اونلی" شاہ رخ خان آ رہا ہے۔ وہ دیر سے اسی کے منتظر تھے۔

سہانہ کسمسا کر پہلو بدلنے لگی۔ شاہ رخ کو اسٹیج پر اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کیونکہ اسکرین پر خوبصورت دکھنے والا مقناطیسی کشش کا حامل یہ "اسٹار" درمیانی شکل صورت اور قد بت کا مالک تھا۔ مقبولیت میں یقیناً اس کی جاندار اداکاری اور ہر دلعزیز شخصیت کا بھی ہاتھ ہے کیونکہ شاہ رخ جیسی محبت کم ہی فنکاروں کو نصیب ہوتی ہے۔

وہ اپنے فلم بین مداحوں کو ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں سب کچھ خوبصورت اور حسین ہوتا ہے۔ الجھنیں، کلفتیں اور حقیقتوں کی تلخیاں دھواں ہو جاتی ہیں۔ لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر اپنے محبوب اداکار کا سواگت کیا تو اسی لمحے چھت سے چمکتے دل کی شکل والے سرخ غباروں سے منظر مزید رومانوی ہو گیا۔ لڑکے لڑکیاں جوش کے مارے چیخیں مارنے لگے تو شاہ رخ نے مائیک پکڑ لیا اور اپنے مداحوں سے بے تکلف انداز میں باتیں کرنے لگا۔

امریکا ایک آکٹوپس کے مانند ہے۔ وہ ہر ایک کو اپنے خوبصورت، پرکشش نظام اور معاشی آسودگی میں جکڑ لیتا ہے۔ انسان اس کی گرفت میں پھنس کر پھر کبھی آزاد نہیں ہو پاتا۔

باتوں باتوں میں جب کسی بات پر بے ساختہ انداز میں "ماشاءاللہ" کہا تو بہت اچھا لگا۔ وہ حاضرین سے باری باری پوچھتا چلا گیا "ممبئی سے کوئی ہے، یہاں پنجابی کتنے ہیں اور پھر آخر میں کہا، کیا میرے پاکستانی فرینڈز آئے ہوئے ہیں؟" سب پاکستانیوں نے زور شور سے تالیاں پیٹیں جن میں میں بھی شامل تھی۔ اس وقت شاہ رخ مجھے اچھا سا لگا۔ سنا ہے وہ پاکستانیوں سے پیار کرتا ہے اور کرنا بھی چاہیے کیونکہ پاکستانی بھی تو بڑے ذوق شوق سے اس کی فلمیں دیکھتے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

شاہ رخ خان نے حاضرین میں سے ایک لمبے تڑنگے سردار جی کو اسٹیج پر بلایا۔ انھوں نے وفورِ جذبات میں شاہ رخ کو گود میں اٹھا لیا اور پیار سے اس کے ماتھے پہ آئے بالوں سے کھیلنے لگے۔ سارا ہال ہنس ہنس کر دوہرا ہونے لگا۔ لگتا تھا، اس سے ساری دنیا نفرت اور دکھ نام کے کسی جذبے سے آشنا نہیں۔ سہانہ بھی ہنس رہی تھی۔ اسے تب کہاں پتا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں یہ تماشا ختم ہو جائے گا۔ روشنیاں گل ہوں گی اور سب اپنے اپنے گھر لوٹ جائیں گے۔ پس منظر، پیش منظر میں تبدیل ہو گا اور نظامِ کائنات چلتا رہے گا۔

کیا شاہ رخ خان کو دیکھنا سہانہ کی آخری خواہش تھی؟ یہ سوچ کر میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ شاہ رخ خان نے پھر مختلف لوگوں کو اسٹیج پر بلایا، ان سے باتیں کیں اور ڈانس کیا۔ تب میرا شدت سے جی چاہا کہ کسی طرح شاہ رخ خان کو ایک پرچی بھجواؤں جس پہ لکھا ہو "تمھاری ایک پرستار بستر مرگ سے اٹھ کر آج تمھیں دیکھنے اور تمھاری پذیرائی کرنے یہاں آئی ہے۔ یہاں آ کر اس سے ذرا مل لو۔ اس کے ساتھ بات کرو۔ اسے زندگی جینے کی امید دو۔ شاید یوں اس کی زندگی کے گنے چنے حسین لمحوں میں ایک یادگار لمحے کا اضافہ ہو جائے۔"

وقت کی چکی میں پسنے والوں کے لیے تو ایک لمحہ بھی ایک صدی سے زیادہ ہے۔ مگر یہ ایک پاگل خواہش دل میں دبائے بیٹھی رہی۔ آنکھ کے سامنے زندگی سے بھرپور شخصیت والے شاہ رخ خان تک یہ پرچی پہنچانا شاید ناممکن تھا۔ لوگوں کی چیخیں، دیوانگی، تالیاں، سکیورٹی کے لیے لگائے گئے بڑے بڑے آہنی جنگلے اور ہال کا نظم و نسق سنبھالنے والے سکیورٹی گارڈ۔ ان سب سے ہوتے ایک چھوٹی سی پرچی پر لکھا پیغام اتنے بڑے فنکار تک کیسے پہنچتا؟

تھوڑی ہی دیر میں منتظمین نے شاہ رخ خان کو چاروں والے حفاظتی اہلکار ہٹا کر حاضرین سے بالکل قریب سے گزرنے کا موقع دیا۔ لوگوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر خوشی کا اظہار کیا۔ سہانہ بھی تڑپ کر ہاتھوں سے تالی بجاتی مسکرا رہی تھی۔ شاہ رخ لوگوں کے قریب آتا، ہاتھ ملاتا، پیار برساتا آہستہ آہستہ واپس چلا گیا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ بجھتے ہوئے چراغوں میں کتنی چمکدار جوت جگا گیا ہے۔ اسے تو بس یہ پتا تھا کہ اپنے چاہنے والوں کو خوش کرنا اس کا دل لبھاتا ہے۔ اس لیے وہ دوبارہ اسٹیج پر نمودار ہوا اور اپنے سب ساتھی فنکاروں کے ساتھ مل کر رقص کیا اور داد لیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

پاکستان ساختہ روبوٹ

پشاور انسٹی ٹیوٹ آف فزکس اینڈ الیکٹرانکس کے طالب علم سلیمان نے اپنی نوعیت کا پہلا بم ڈسپوزل روبوٹ تیار کر لیا ہے، جو پندرہ میٹر کے فاصلے سے ۲۷ کلوگرام سے بارودی مواد کی پہچان سمیت اسے ناکارہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سلیمان کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ روبوٹ اپنے ایم ایس سی کے فائنل پروجیکٹ کے لیے تیار کیا ہے۔ روبوٹ بنانے کا آئیڈیا ہالی وڈ کی فلم "ہرٹ لاکر" دیکھ کر آیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پروٹوٹائپ روبوٹ ہے جو ٹینک کی طرح چلے گا۔ یہی وجہ ہے کہ روبوٹ آفت زدہ علاقوں اور دشوار گزار سڑکوں میں بھی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ روبوٹ ایک لاکھ روپے کی لاگت میں تیار ہوا ہے اور حکومتی اداروں اور انڈسٹری کا تعاون حاصل ہو، تو وہ اپنی ایجاد کو مزید بہتر بنا کر دنیا بھر میں متعارف کرائیں گے جس سے دنیا بھر میں پاکستان کا نام روشن ہو گا۔

(خشال فاطمہ، گگو منڈی ضلع وہاڑی)

www.pdfbooksfree.pk

اس کے مزیدار چٹکلوں اور شوخ گفتگو سے ہال میں خوشی کی سطح انتہا کو چھونے لگی۔ میرا جی چاہا گلا پھاڑ کر چیخوں اور کہوں، "شاہ رخ اس لڑکی کو مل لو وہ جا رہی ہے، تمہیں وہ پھر کبھی نظر نہ آئے گی کل پتا نہیں وہ ہو نہ ہو۔" مگر ہیجانی شور میں میری آواز کیسے سنائی دیتی، اس لیے خاموش رہی۔ اسٹیج پہ تھرکتی زندگی حاضرین کی رگوں میں بہتے خون کی قوت بڑھا رہی تھی۔ مگر موت بھی ایک نشست پہ بیٹھی کسی کے ختم ہونے والے سانسوں کی ریزہ کاری گن رہی تھی۔ "ارے کوئی ہے جو شاہ رخ کو جا کے بتائے؟" میرے دل نے پھر چیخ ماری۔

تین گھنٹوں بعد شو اختتام پذیر ہوا۔ سب ہال سے باہر نکلنے لگے۔ سہانہ کی بھابی نے اسے تھام رکھا تھا کہ ہجوم میں ٹھوکر نہ لگ جائے۔

"برا حال ہے، چلا بھی نہیں جا رہا، لیکن کم از کم میں نے شو تو دیکھ لیا نا، بہت مزا آیا۔" سہانہ بولی۔ اس کی مردہ آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

"کئی بار پوچھا، چلنا ہے؟ مگر تو یہ کریزی ہے، یہ شاہ رخ خان کو چھوڑ کر کہاں جانے والی تھی۔" یہ کہتے ہوئے سہانہ کی بھابی نے پیار سے اس کا بازو تھپتھپایا۔ میری نم آنکھیں بھابی کی نم آنکھوں سے ٹکرائیں اور پھر یوں پیچھے ہٹ گئیں جیسے ہم اپنے زندہ ہونے پہ شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔ آخر زندگی پر صرف ہمارا ہی حق کیوں تھا؟

سہانہ شاہ رخ سے نہیں مل سکی اور زندگی سہانہ کو؟ لیکن تعلق رکھنے کے لیے کیا کسی کا دوسرے سے ملنا ضروری ہے؟ ایک ہی کہکشاں کے سیارے اپنے اپنے مدار میں تیرتے اور ایک دوسرے سے فاصلے رکھتے ہیں، مگر ان کا تعلق تو پھر بھی رہتا ہے۔ ہم سب بھی کائنات کی حسین گھیری کے ناچتے جھولوں میں اترتے لگتے ہیں۔ آفاق کی اس کاریگر شیشہ گری کے بائیسکوپ میں جڑے شیشوں میں قید۔ یہ دنیا ایک تماشا گاہ ہے جہاں پردہ گرتا پھر اٹھتا ہے۔ کردار آتے اور پھر غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ شو تو چلتے رہنا ہے۔

جنم اور مرن کھلے سمندر میں تیرنے والی دو کشتیوں کا نام ہے۔ ہم خوشی مناتے ہیں جب جنم کشتی اپنے سفر کا آغاز کرے۔ اس سے بے نیاز کہ راستے میں اسے کئی طوفانوں، جھکڑوں اور ہچکولوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہم سوگ مناتے ہیں جب یہ کشتی کنارے لگے حالانکہ ہمیں اس وقت خوش ہونا چاہیے کہ کٹھن سفر ختم ہوا۔ مسافر نے منزل کو پا لیا اور اب اس کے نصیب میں آرام ہی آرام ہے۔

وقت کی پونجی سے جیب خالی ہو رہی ہو، تو ایک لمحہ بھی ایک صدی کے برابر ہے۔ مگر میں اپنی پاگل خواہش دل میں دبائے بیٹھی رہی۔

میں سہانہ کے لیے سوگوار نہیں، وہ جہاں ہوگی، توکل چمن کی لالہ و گل میں نمایاں ہوگی۔ باغ حیات میں چلتی باد صبا مرولی جب کسی ننھے منے کے رخسار پہ بوسہ دے، تو شاید وہ بھی اسی طرح پیار سے مغلوب ہو کر خوشی سے تالیاں بجائے گا جیسے اس روز سہانہ ٹی وی کے اسم کی آئی ہال میں جا رہی تھی۔ پھر بھی نجانے کیوں میری آنکھوں کے کونے میں ایک آنسو آتے، تو اٹک سا جاتا ہے۔ دل میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ اگر کسی دن شاہ رخ خان کو دل کے اس پھول کے متعلق پتا چلا، تو اسے کیسا لگے گا؟.... یا سوچے گا وہ اس بے انت کہانی کے بارے میں؟

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

کیرئیر راہنمائی

جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے ایکسپورٹر بننے کا خواب حقیقت میں بدلیے

ایک عام پاکستانی کو بھی کامیاب ایکسپورٹر بنا دینے والے قیمتی مشورے

حبیب طارق

میں وقت سے تحریر ملاقات کر رہے تھے میں مجھے علی کا فون آیا۔ کہنے لگا "حبیب بھائی پیشگی معذرت کہ میں آپ کے گھر تھوڑا وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے پہنچ گیا۔ دراصل پہلی نشست کی دلچسپ رہی تھی کہ مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں پہلے ہی چلا آیا۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں، مجھے خوشی ہوئی کہ تم اس موضوع میں دلچسپی لے رہے ہو۔ جیسا کہ فیصلہ ہوا تھا آج ہماری نشست ایکسپورٹ پر اثرات کے موضوع پر ہے۔ میں نے تمہارے جیسے عام لوگ والے ہر منصوبے سوچ رکھے ہیں جن پر عمل کر کے تم پاکستانی کامیاب ایکسپورٹرز کی طرح اپنی قسمت کو چار چاند لگ سکتے ہو۔ پھر تم جس لڑکی کو پسند کرتے ہو اس کے گھر والے بھی تمہارے گرویدہ ہو جائیں گے۔"

گھر پہنچ کر میں نے کپڑے بدلے اور علی کو لے قریبی ریستوران پہنچ گیا۔ نشستوں پر بیٹھتے ہی ہماری

www.pdfbooksfree.pk

گفتگو ہونے لگی جو کھانا آنے کے بعد بھی جاری رہی۔ میں کہنے لگا "خطیب بھائی سب سے پہلے تو مجھے یہ بتایئے کہ ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کرنے سے پہلے فزیبلٹی رپورٹ کیسے بنائی جائے؟ اس میں تو ہمارا مقابلہ بین الاقوامی کمپنیوں سے ہوتا ہے اور مقامی مارکیٹ کے برعکس ہمارے حریف مختلف ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تناظر میں ہم مختلف ممالک کی کمپنیوں کی معلومات کے معیار اور قیمتوں کو کیسے جانیں؟ میں تو پاکستان بیٹھا ہوں۔ مجھے علم نہیں کہ دوسرے ممالک کی ایکسپورٹ کمپنیوں کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ ان سے مقابلے کے لیے کیا حکمت عملی اپنائی جاتی ہے؟ غیر ملکی کمپنیاں ہم سے آگے ہیں اور ہم یوں مار کھا جائیں گے۔ مجھے یہ بھی بتایئے کہ پاکستان سے کیا کیا چیزیں ایکسپورٹ کی جا سکتی ہیں؟"

میں نے تفصیل سے بتانا شروع کیا "پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار قدرتی وسائل سے نوازا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم کیسے اپنی زرخیز مٹی کا صحیح استعمال کریں۔ پاکستان سے کئی اشیا برآمد کی جا سکتی ہیں۔ ہم مرغیاں ذبح کرتے اور گوشت کاٹ کر ان کی انتڑیاں وغیرہ کاٹنے کے بعد کوڑے میں پھینک دیتے ہیں، وہ بھی بین الاقوامی مارکیٹ میں فروخت ہوتی ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۱۲ء میں پاکستان سے ۱۵ ارب روپے مالیت کی انتڑیاں برآمد ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ پاکستان سے مرغی کے پنجے بھی ایکسپورٹ ہوتے ہیں۔

"کئی پاکستانی ... کر رہے ہیں۔ وہ صرف ان چھوٹی اشیا کی برآمد سے اپنا کاروبار شروع کر سکتے ہیں۔ میں نے ... ایک ... ان لوگوں ... کی ضرورت تھی۔ کراچی کے ایک کاروباری نے وہاں سے ایکسپورٹ کرنا شروع کی اور راتوں رات کروڑ پتی بن گیا۔"

... نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا "یعنی حد ہے! پاکستان سے اچھوتی چیزیں ایکسپورٹ ہو رہی ہیں اور کاروبار کے بہترین مواقع موجود ہیں اور ہمیں پتا ہی نہیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "پاکستان سے ایسی عجیب اشیا ایکسپورٹ ہو رہی ہیں جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اور لوگ ان کے ذریعے خوب کما رہے ہیں۔ میرا ایک دوست بیرون ممالک جانے والے گوشت کی پڑتال کرنے والے ادارے میں کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ایک شخص اس سے چین گدھے کی کھالیں ایکسپورٹ کرنے کے لیے سرٹیفکیٹ لینے آتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ چین میں جس پارٹی کو میں گدھے کی کھالیں بھجواتا ہوں، وہ مجھے نقد ادائیگی کرتی ہے۔ اس کھال سے کئی دواؤں کا خام مال بنتا ہے اور یہ مختلف بیماریوں میں استعمال ہوتی ہیں۔

"مقامی تجزیہ کاروں کی رپورٹ ... معلومات (ہیومن ہیئرز) پاکستان سے ایکسپورٹ کرنے کے لیے تیار ... ہیں۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں بھارت اور چین اس وقت ہیومن ہیئرز کی برآمدات سے سرگرم ہیں۔ بھارت انھیں فروخت کر کے ۲۳۵ ارب روپے سالانہ کماتا ہے۔ بھارت اور ہماری ثقافت ملتی جلتی ہے۔ جب بھارت اپنے ہیومن ہیئرز کی اشیا فروخت کر کے اربوں روپے کما سکتا ہے تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟"

"ضروری نہیں کہ صرف قدرتی اشیا برآمد کی جائیں۔ ... سے تیار کردہ اشیا بھی برآمد کی جا سکتی ہیں۔ ان اشیا میں ایسی کئی شامل ہیں جن کے کاروبار میں ۵۰ فیصد زیادہ سرمایہ کاری کرنے سے زیادہ منافع کما سکتے ہیں۔ اس قسم کی اشیا میں اچار

www.pdfbooksfree.pk

ایکسپورٹ کے فوائد

برآمدات کا کاروبار ذاتی لحاظ سے مفید ہے اور قومی اعتبار سے بھی۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ آپ کی آمدن ڈالر یا یورو میں ہوتی ہے۔ جب وہ پاکستانی کرنسی میں تبدیل ہو تو کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ مزید براں کاروبار بڑھانے کے لیے آپ کو دنیا بھر کی مارکیٹیں مل جاتی ہیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ کرنسی کی قدر کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا جب قدر گرے، تو ایکسپورٹر کا منافع بڑھ جاتا ہے۔ قومی لحاظ سے برآمدات کا فائدہ یہ ہے کہ جب ایکسپورٹ بڑھے، تو قومی خزانے میں زرمبادلہ کا اضافہ ہوتا ہے۔ یوں معیشت مضبوط ہوتی ہے اور ادائیگیوں کا توازن بہتر ہو جاتا ہے۔

پتنگیاں، چمڑا، سبزی، پھل وغیرہ شامل ہیں۔ ان ملکوں میں جہاں ہماری اشیا کی سب سے زیادہ تعداد میں کھپت ہیں، مثلاً مشرق وسطیٰ وغیرہ، وہاں ان کی اشیا کی بہت طلب ہے۔

اب آتے ہیں اس سوال کی جانب کہ ایکسپورٹ شروع کرنے سے پہلے کون سی معلومات [illegible] کی جائیں۔ سب سے پہلے تو اس امر پر غور فرمائیے کہ پاکستان سے کیا کیا شے ایکسپورٹ ہوتی ہے۔ [illegible] شے یا اشیا [illegible] ہیں۔ [illegible] کہ تم ایک شے کی برآمد میں منافع کی شرح [illegible] ان اشیا کی فہرست بنا [illegible] کاروبار [illegible] ہو گا۔ یہ ایسی شے یا اشیا کا انتخاب [illegible] منافع ہو اور مقابلہ بھی [illegible] ہو۔ اس سلسلے میں [illegible] سے مدد لی جاتی ہے۔

آج کل سب سے اہم [illegible] انٹرنیٹ موجود ہے۔ انٹرنیٹ سے کاروبار کرنا اتنا آسان ہو گیا ہے جتنا پہلے کبھی نہ تھا۔ [illegible] ایکسپورٹ کے کاروبار سے [illegible] ہے۔ اگر تم انٹرنیٹ اور [illegible] کا استعمال [illegible] برآمدات سے متعلق [illegible] معلومات حاصل کر [illegible] کی خاطر [illegible] پڑتی تھی۔

[illegible] سے پہلے [illegible] شے یا اشیا کی [illegible] کی تحریر [illegible] چاہتے ہو، پاکستان سے وہ کتنی مقدار میں ایکسپورٹ ہوتی ہیں۔ اس شے کی ایکسپورٹ بڑھ رہی ہے یا کم ہوئی۔ اگر بڑھ رہی ہے، تو انتخاب [illegible] ہے۔ دوسرے یہ تلاش کیجیے کہ اس شے کے سب سے بڑے خریدار کون سے ممالک ہیں۔

اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ پاکستان سے جو اشیا ایکسپورٹ ہوتی ہیں، ان کا معیار کیا ہے اور ان کی قیمت کس [illegible] فروخت [illegible]۔ مزید براں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ دیگر ممالک کی [illegible] شے کس قیمت پر فروخت کرتی ہیں۔ اس [illegible] کا حل [illegible] ایک [illegible] شے سب سے زیادہ [illegible] ایکسپورٹ [illegible]، تو وہاں آپ کا کوئی جاننے والا رہتا ہے، [illegible] کی [illegible] کا نمونہ [illegible] کے پاس [illegible] مطلوبہ شے کی تکنیکی خصوصیات حاصل [illegible] اور [illegible] شے کی قیمت بھی جان لے۔

[illegible] آج کل [illegible] ادارے انٹرنیٹ [illegible] انجام دیتے ہیں۔ آپ [illegible] اور [illegible] اس شے سے [illegible] ایکسپورٹ [illegible] کی [illegible] سے [illegible] خصوصیات [illegible] کا [illegible] آپ [illegible] ان سے

www.pdfbooksfree.pk

شے کے نمونے بھی منگوا لو تاکہ آپ کو ان کے معیار کا اندازہ بھی ہو جائے۔"

علی نے پوچھا "خطیب بھائی! مجھے ان کمپنیوں کا کیسے پتا لگے گا جن سے میں نے ریٹ لینا ہے؟"

میں نے جواب دیا "اس کا بہت آسان حل ہے لیکن اکثر پاکستانی اسے نہیں جانتے۔ دنیا کے کاروبار میں ہر سیکٹر یا شعبے کی کاروباری کمپنیوں کی اپنی تنظیمیں ہیں جو ویب سائٹس بھی رکھتی ہیں۔ ان تنظیموں کی ویب سائٹس پر جا کر تم سب ایکسپورٹروں کے نام و پتے حاصل کر لو۔ ویب سائٹس پر ان کے فون نمبر، ڈاک پتا اور ای میل سب کچھ درج ہوتا ہے۔ یہی اصول اس وقت بھی لاگو ہو گا جب تم اپنی شے کی مارکیٹ کے لیے امپورٹر کمپنیوں سے رابطہ کرو گے۔ امپورٹروں کی تنظیمیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ ان تنظیموں کی ویب سائٹس پر تمام رکن کمپنیوں کا سارا ڈیٹا موجود ہے۔"

علی نے اب اگلا سوال پوچھا "خطیب بھائی! ابھی آپ نے ایکسپورٹ والی اشیا کی مارکیٹ کا ذکر کیا۔ ہم ایکسپورٹ کا جو بھی کام شروع کریں، اس میں اپنی شے یا اشیا کی مارکیٹنگ کیسے کی جاتی ہے؟"

میں نے بتایا "اس مقصد کے لیے تمھیں چار نکات پر عمل کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ تمہارے ممکنہ خریدار ممالک کون کون سے ہیں۔ اس سلسلے میں تمھیں انٹرنیٹ اور اعداد و شمار سے مدد ملے گی۔ سب سے پہلے تو گوگل سرچ کے ذریعے یہ تلاش کرو کہ تمہاری شے کے دنیا میں سب سے بڑے امپورٹر ممالک کون سے ہیں اور پاکستان سے وہ شے سب سے زیادہ کن ملکوں کو ایکسپورٹ کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں ان ممالک کی متعلقہ تنظیموں کی ویب سائٹس سرچ کرو۔

"اگر انگریزی میں تمھیں مطلوبہ ویب سائٹ نہیں ملتی تو گوگل ٹرانسلیٹ کے ذریعے شے کے الفاظ اس ملک کی زبان میں ترجمہ کر کے پھر سرچ کرو۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ بے شمار ممالک جن کی مادری زبان انگریزی نہیں خصوصاً یورپی ممالک، ان کی ویب سائٹس انگریزی میں نہیں ہوتیں۔ انگریزی زبان میں سرچ کرتے وقت بھی مختلف متعلقہ الفاظ استعمال کرو۔ مثلاً اگر تم نے برطانیہ کی الماریوں سے متعلق (ایک قسم کا کپ بورڈ) بنانے والی کمپنیوں کی تنظیم کو سرچ کرنا ہے تو ٹائپ کرو: کچن کیبنٹ امپورٹرز ایسوسی ایشن یو کے انگلینڈ۔ اگر اس سے مطلوبہ ویب سائٹ نہیں ملتی تو ٹائپ کرو ایسوسی ایشن آف کچن کیبنٹ امپورٹرز ایسوسی ایشن انگلینڈ یو کے۔ دراصل یہ ہے کہ مختلف الفاظ لکھنے پر گوگل مختلف نتائج دکھاتا ہے۔ مطلوبہ نتائج تک پہنچنے کے لیے آپ کو مختلف الفاظ لکھ کر سرچ کرنی پڑتی ہے۔

"بہرحال تمہاری مطلوبہ شے کے جو پانچ، چھے بڑے امپورٹر ممالک ہیں، وہ اور جن میں پاکستان سے شے بڑی تعداد میں فروخت ہوتی ہے، وہاں کی تنظیموں کی ویب سائٹس سے امپورٹر کمپنیوں کی ویب سائٹس سے پتے نکال کے ان کی فہرست بنا لو۔ اس میں ان کے نمبر، ای میل، ڈاک پتا وغیرہ بھی لکھ شامل کر لو۔ اس کے بعد اپنی ایک ویب سائٹ بنواؤ۔ کاروباری ویب سائٹ زیادہ مہنگی نہیں بنتی۔ پاکستان میں کوئی بھی آئی ٹی کمپنی آپ کو پانچ ہزار روپے میں آپ کے کاروباری نام کی ایک اچھی ویب سائٹ بنا دے گی۔

اس ویب سائٹ میں اپنے دفتر، فیکٹری یا اس فیکٹری کی جس سے آپ نے مال لینا ہے، کم از کم تین چار تصویریں ڈالو۔ یہ بہت ضروری ہے تاکہ دوسروں پر اچھا

www.pdfbooksfree.pk

ظاہر ہو سکے کہ یہ کمپنی سنجیدہ اور پروفیشنل انداز میں کام کر رہی ہے۔ غرض اپنے ممکنہ گاہکوں کے سامنے دفتر کی عمدہ تصویر پیش کرو۔ ممکن ہو تو اپنے دفتر یا فیکٹری کی تین چار منٹ دورانیے پر مشتمل ایک مختصر سی وڈیو بھی ڈال دو۔

"آج کل دنیا میں اربوں کھربوں روپے کی تجارت ایسی ہی ویب سائٹس کے ذریعے ہو رہی ہے جنھیں ہم "بی ٹو بی" یعنی بزنس ٹو بزنس ویب سائٹس کہتے ہیں۔ ان ویب سائٹس پر آپ اپنا اکاؤنٹ بناتے ہو۔ اس کے بعد دلچسپی رکھنے والی کمپنیاں آپ سے پہلے متعلقہ شے یا اشیا کی قیمت معلوم کرتی ہیں۔ انھیں آپ کا ریٹ پسند آ جائے، تو وہ آپ سے نمونے منگواتی ہیں۔ وہ پسند آ جائیں، تب آپ کو آرڈر دیتی ہیں۔ اس طرح کی سب سے بڑی ایک چینی کمپنی "علی بابا (alibaba.com)" کا ہے۔ اس کے ذریعے ہر مہینے کھربوں روپے کا کاروبار ہوتا ہے۔

"علی بابا ڈاٹ کام اور اس طرح کی دوسری بزنس ٹو بزنس ویب سائٹس پر اپنی کمپنی کا اکاؤنٹ بناؤ اور اس پر کمپنی کی متعلقہ معلومات اور تصویریں اپ لوڈ کرو۔ علی بابا اور اس طرح کی دوسری ویب سائٹس پر ہر مہینے "آر ایف کیو" (quotations for request) یعنی تمہاری متعلقہ شے خریدنے کے سلسلے میں قیمت معلوم کرنے کی غرض سے مختلف کمپنیاں اکثر درخواستیں دیتی ہیں۔ ان درخواستوں کا فوری جواب دیتے رہو۔ اگر تم نے ۵۰ کمپنیوں کو جواب دیا، تو ان میں سے دس تم سے نمونے منگوائیں گی۔ ان میں سے ایک دو نے بھی آرڈر دے دیا، تو تمہارا کام چل نکلے گا۔ اس کے علاوہ یہ سرچ کرو کہ تمہاری شے خریدنے والے ممالک میں کون سی بزنس ٹو بزنس ویب سائٹس زیادہ مقبول ہیں۔ علی بابا کے علاوہ ان پر بھی اکاؤنٹ لازمی بناؤ اور انھیں مستقل چیک کرتے رہو۔

"اگلا اہم کام یہ کرو کہ علی بابا پر اپنے اکاؤنٹ کی تصدیق (verify) کراؤ۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ آپ کے پاس اپنے اکاؤنٹ کی تصدیق کروانے کی آپشن ہوتی ہے۔ اگر آپ اس پہ کلک کر کے دی گئی ہدایات پر عمل کریں، تو علی بابا کا نمائندہ آپ سے ملنے آ جائے گا۔ وہ آپ کی کمپنی کی قانونی دستاویزات اور آپ کی فیکٹری یا دفتر دیکھے گا۔ اگر وہ مطمئن ہو گیا، تو آپ کی کمپنی کو علی بابا ویب سائٹ پر تصدیق شدہ (verified) کا درجہ مل جائے گا۔

Alibaba.com
Global trade starts here.™

"اس عمل کا سب سے بڑا اور اہم فائدہ یہ ہے کہ آپ کی کمپنی کی خریدار کے سامنے ساکھ بنے گی کہ یہ واقعی ایک باقاعدہ کمپنی ہے، کوئی گھر میں بیٹھ کر تنہا کوئی فراڈ نہیں کر رہا۔ پھر کوئی بھی غیر ملکی کمپنی آپ سے معاہدہ کرتے ہوئے نہیں گھبرائے گی، اسے آپ اور آپ کی کمپنی پر اعتبار ہو گا۔

"اب آتے ہیں کمپنیوں سے ملنے والے اس ڈیٹا کی طرف جو تم نے اکٹھا کیا۔ سب سے پہلے ان غیر ملکی کمپنیوں کو اچھی سی ای میل بنا کر بھیجو۔ اس میں اپنی کمپنی کا تعارف، متعلقہ شے یا مصنوعات کے والے سرٹیفکیٹ، اپنی ویب سائٹ، ڈاک کا پتا وغیرہ سب معلومات شامل ہوں۔ ایک پروفیشنل کاروباری ای میل کیسے لکھی جاتی

www.pdfbooksfree.pk

ہے تم انٹرنیٹ سے سرچ کرکے دیکھ سکتے ہو۔

"دوسرے تمھاری شے کے امپورٹرز ممالک میں اگر کوئی تمہارا دوست، رشتے دار یا کوئی جاننے والا ہے، تو اس سے بات کرکے یہ معاہدہ کرو کہ تم وہاں ہماری کمپنی کے نمائندے بن کر کام کرو۔ جو آرڈر تم لاؤ گے، اس پر ہم تمھیں ۵ فیصد یا ۱۰ فیصد یا جتنی بھی آپس میں طے ہو، اتنا کمیشن دیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے، کسی غیرملکی کمپنی کو بھی ہمارے نمائندے سے ملاقات کی ضرورت پیش آئے، تو تم ہمارے نمائندے کے طور پر ان سے ملاقات کرآؤ۔ ہم اس کے عوض تمھیں ایک یا دو فیصد اس آرڈر کی فروخت میں سے حصہ یا ایک مخصوص فیس دیں گے۔

"تیسرا طریقہ جو سب سے بہتر ہے، وہ یہ ہے کہ اگر آپ دو حصے دار ہیں، تو کم از کم پہلا آرڈر ملنے تک ایک حصے دار اسی ملک میں قیام کرے۔ وہاں سے آرڈر لے کر ہی وہ پاکستان کی راہ دیکھے۔ جو خرچہ ہوگا، اس کو آپ فزیبلٹی رپورٹ بناتے وقت اپنے اخراجات میں شامل کرلیں۔

"امپورٹ کے کاروبار میں مددگار بننے والا چوتھا اور سب سے اہم طریقہ ہے کاروباری نمائشوں میں شرکت۔ دنیا بھر میں ہر سال مختلف ممالک میں کاروباری نمائشیں لگتی ہیں۔ وہاں مختلف ملکوں کی کمپنیاں اپنے اسٹال لگاتی ہیں۔ اسی طرح کئی ملکوں کے خریدار ان نمائشوں میں شرکت کرتے ہیں۔ اس سے انھیں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ تمام کمپنیوں کی مصنوعات ایک ہی جگہ مل جاتی ہیں۔ یوں مختلف کمپنیوں کی اشیا دیکھنے سے ان کی قیمتوں اور معیار کا بہتر اندازہ اور تقابل ہو جاتا ہے۔

اسٹال لگانے والی کمپنی کو یہ فائدہ ملتا ہے کہ ایک تو عالمی مارکیٹ میں بطور بڑی کمپنی اس کا نام آتا ہے جس پر اعتبار کرنا ممکن ہے۔ دوسرے کمپنی کو نئے گاہک ملتے ہیں۔ تمہارے کاروباری شعبے کی جو عالمی نمائشیں منعقد ہوتی ہیں، خصوصاً ان ملکوں میں جہاں تمھاری شے سب سے زیادہ امپورٹ ہو، ان میں لازمی شرکت کرو تاکہ تمھیں نئے آرڈر ملیں اور عالمی مارکیٹ میں کمپنی کی ساکھ بھی بنے۔

"پانچواں طریقہ یہ ہے کہ آپ ان ممالک میں اپنے کمیشن ایجنٹ تعینات کرو۔ یہ لوگ بھی آپ کو انٹرنیٹ کے ذریعے مل جائیں گے۔ جس طرح ہمارے او ایل ایکس ڈاٹ کام (olx.com.pk) اور روزی پی کے (Rozi.pk) ہیں، اسی طرح ان کے ہاں بھی ملازمین ڈھونڈ کر دینے والی ویب سائٹس ہیں جو انٹرنیٹ پر سرچ کرنے سے مل جاتی ہیں۔ لیکن یاد رہے، کمیشن ایجنٹ کے ذریعے پہلے رقم منگوائیں اور پھر مال بھجوائیں۔ یا پھر مال بھیجنے سے پہلے کمپنی کی اچھی طرح تصدیق کرلیں کہ وہ قابلِ اعتبار ہے تاکہ مالی نقصان کا اندیشہ نہ رہے۔

"چھٹا طریقہ ہے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال۔ جو کمپنیاں آپ کی ای میل کا جواب دیں، ان کے متعلقہ منیجر کا موبائل نمبر لے کر ان کے ساتھ مسلسل واٹس ایپ (whatsapp) اور سکائپ (skype) کے ذریعے رابطے میں رہیں۔ آج کل ہر ایک کے پاس موبائل فون ہے۔ آپ متعلقہ غیرملکی کمپنی سے بہتر اور فوری رابطہ کرنے کے علاوہ دیرپا تعلقات بھی استوار کر سکتے ہیں۔ تمھیں یہ بات بتانا اس لیے ضروری ہوں گا کہ وہ تب کام آتا ہے جب ہم نے عوامی سطح پر کوئی چیز بیچنی ہو۔ چونکہ تمہاری مارکیٹنگ مخصوص کمپنیوں تک محدود ہو گی۔ لہٰذا تمھیں یہ بات اس معاملے میں اتنا کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔

"ساتواں طریقہ یہ ہے کہ تمھیں اپنی کمپنی کی تشہیر

www.pdfbooksfree.pk

اشیا روانہ کرو جن پر کمپنی کا نام کندہ ہو۔ مثلاً اگر آپ کی شے یا مصنوعہ کے خریدار یورپی ہیں، تو انھیں کرسمس کے موقع پر آپ اپنی کمپنی کے کیلنڈر، گھڑیاں، جیبی ویسٹ یا پاکستان کے ہینڈی کرافٹس سے بنی اشیا مثلاً ٹیبل لیمپ وغیرہ بھیج سکتے ہیں۔ یہ بہت اچھا اور اہم مارکیٹنگ گر ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک تو آپ کی کمپنی پر اعتبار قائم ہوتا ہے کہ یہ سنجیدہ طور پر کاروبار کرنا چاہتی ہے۔ دوسرا یہ کہ کمپنی کی تشہیری مصنوعات خریدار کمپنی کے منیجر یا مالک کے کمرے میں مسلسل لگی رہتی ہے۔ لہٰذا جب اس نے آرڈر دینا ہو، تو آپ کی کمپنی سے کوٹیشن اور نمونے ضرور لے گا۔"

میں نے پھر "کنکشن" [illegible] ہوتے ہوئے کہا "لیکن ان تمام تشہیری طریقوں کا تبھی فائدہ ہوگا، اگر آپ کی کمپنی کی بنی مصنوعہ یا برآمد ہونے والی شے کی قیمت اور معیار اچھا ہو۔ آپ جتنی مرضی تشہیر کرلیں، اگر آپ کی مصنوعات کا ریٹ اور معیار اچھا نہیں، تو شاید کوئی ایک بار تو مال خرید لے لیکن اگلی بار کبھی نہیں خریدے گا۔"

"طیب بھائی، ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کرتے ہوئے مجھے کیا ریٹ دینا چاہیے اور میں یہ کیسے یقینی حاصل کروں کہ میری مصنوعہ کا معیار ان کے معیار کا مقابلہ کرسکتا ہے؟" میں نے سنجیدہ ہو کر سوال پوچھا۔

میں نے کہا "دیکھو کاروبار کے شروع میں آپ گاہک بناتے اور پھر انھی سے ساری عمر کمائی کرتے ہیں۔ اس لیے شروع میں آپ کی توجہ منافع کمانے پر کم اور گاہک بنانے پر زیادہ ہونی چاہیے۔ ایک بار جب کوئی گاہک بن جائے اور آپ سے دو تین بار مال منگوا لے تو پھر اس کا کسی دوسرے کے پاس جانا قدرے مشکل ہوگا۔ امپورٹرز اچھی کمپنی کو کبھی نہیں چھوڑتے کیونکہ انھیں آپ اور آپ کی مصنوعات/اشیا پر اعتبار ہوتا ہے۔ کاروبار کے شروع میں آپ اپنی شے/مصنوعہ کی قیمت مارکیٹ میں مروج ریٹ سے کم از کم ۱۰ تا ۲۰ فیصد کم رکھو۔ اگر آپ کی ایکسپورٹ مصنوعہ اس قسم کی ہے جس میں منافع کم ہے، تو بھی کم از کم ۵ تا ۱۰ فیصد تک مارکیٹ ریٹ سے نیچے آنا ہی ٹھیک ہوگی۔

"جب تم کاروبار شروع کرتے ہوئے مختلف ممالک کی امپورٹرز کمپنیوں سے ریٹ لو گے، تو تمھیں معلوم ہوگا کہ ان کے ریٹ ایک مخصوص رینج میں ہوں گے مثلاً ۲ سے ۳ ڈالر تک۔ جس کمپنی کا تمھیں کم سے کم ریٹ ملے، اس سے بھی ۱۵ تا ۲۰ فیصد نیچے اپنی مصنوعہ کی قیمت رکھو تو بہتر ہوگا۔

QUALITY MANAGEMENT SYSTEM
ISO 9001:2008
CERTIFIED

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ کل کو ایک دو سال بعد تم اپنا ریٹ بڑھا دو اور کم از کم مارکیٹ ریٹ کے قریب لے آؤ، تب بھی امپورٹر کمپنی کہیں نہیں جائے گی کیونکہ اسے علم ہوگا، اب بھی سب سے سستا ریٹ تم سے ہی مل رہا ہے اور ساتھ میں معیار بھی مناسب ہے۔

"کاروبار کے حوالے سے ایک مشہور پنجابی مثل ہے: پہلے سال کھتی، دوسرے سال چتی، تیجے سال ہتی۔ مطلب یہ کہ جب آپ کاروبار شروع کرتے ہیں، تو پہلے سال نقصان ہوتا ہے، دوسرے سال آپ نہ نفع نہ نقصان کی حالت پر آجاتے ہیں اور تیسرے سال سے آپ کو

www.pdfbooksfree.pk

منافع ملنا شروع ہوتا ہے۔ یہ صرف کہاوت ہی نہیں بلکہ حقیقت عملی بھی ہے۔ پہلے سال آپ اپنا منافع بالکل کم رکھیں اور گاہک بنائیں۔ دوسرے سال آپ تھوڑا بہتر منافع لینا شروع کریں اور تیسرے سال آپ مارکیٹ کے برابر آجائیں۔

کاروبار میں قیمت کے بعد شے کے معیار کو اہمیت حاصل ہے۔ یاد رکھو، بین الاقوامی مارکیٹ میں عمدہ معیار کے بغیر آپ کچھ نہیں بیچ سکتے۔ غیر معیاری چیز فروخت کر کے آپ اپنا اور اپنے ملک کا نام بدنام کرو گے۔ یوں دوسرے کئی ایکسپورٹروں کے لیے بھی رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

کسی شے کا معیار پرکھنے اور جانچنے کے لیے پہلا حل تو وہی ہے جس کا میں نے پچھلی ملاقات میں ذکر کیا تھا۔ وہ یہ کہ تم جس شے کو ایکسپورٹ کرنا چاہتے ہو، اس سے متعلقہ کسی کمپنی میں انٹرن شپ کرو اور بلاسلسلہ کاروبار ساری تکنیکی چیزیں سیکھو۔ تم ابھی تعلیم پا کر فارغ ہوئے ہو، کوئی بھی کمپنی ڈھونڈ کے اس میں انٹرن شپ کی درخواست دے دو۔

پھر جن کمپنیوں میں وہ گے تو کوئی نہ کوئی کمپنی تو رکھ ہی لے گی۔ تم ان کے لیے مفت میں کام کرو گے تو وہ بھی چاہیں گے کہ انھیں کوئی ایسا بندہ مل جائے۔ اب کمپنی میں اپنی مرضی کے شعبے میں کام کرنا اور سیکھنا تمہاری اپنی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ تم اپنے دوست احباب سے بھی اس سلسلے میں مدد لے سکتے ہو۔

"دوسرا حل سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہے کہ دوسری دنیا میں کسی کمپنی کی مصنوعات کا عمدہ معیار جانچنے کے لیے دیکھا جاتا ہے کہ اس نے کتنے بین الاقوامی سرٹیفکیٹس حاصل کر رکھے ہیں۔ گویا وہ عالمی سطح پر آپ کی مصنوعہ کے معیار کی پہچان بنتے ہیں۔ ان سرٹیفکیٹس میں آئی ایس او ۹۰۰۰، آئی ایس او ۹۰۰۱، ہیسپ (Haccp) اور اسی نوعیت کے دیگر سرٹیفکیٹس شامل ہیں۔ اگر آپ کی کمپنی یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لے تو اس کے بہترین معیار پر عالمی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ تب امپورٹر آپ کی مصنوعہ کے معیار پر اعتبار کرتا ہے۔

"ان سرٹیفکیٹس کو کیسے حاصل کیا جائے؟ ان کا طریقہ کار اور دوسری تفصیلات ان سرٹیفکیٹس کو جاری کرنے والی عالمی کمپنیوں کی ویب سائٹوں پر موجود ہیں۔ ان کی شاخیں پاکستان میں بھی ہیں۔ ان کی ویب سائٹ سے پاکستان کی شاخ کا فون نمبر لو اور کال کر کے مطلوبہ معلومات حاصل کر لو۔ مختلف مصنوعات پر مختلف قسم کے کوالٹی سرٹیفکیٹس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان کمپنیوں کی ویب سائٹ پر جاؤ اور ان سے فون پہ بات کر کے دیکھ لو کہ تمہاری مصنوعہ پر کس قسم کے سرٹیفکیٹ کا اطلاق ہو گا۔"

اب میں نے سوال پوچھا "طیب بھائی، یہ بتائیے کہ ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کرتے ہوئے کون سے سرکاری لائسنس اور دستاویزات درکار ہوں گی؟ میں کئی بار پڑھ چکا ہوں کہ حکومت پاکستان نے برآمدات کا طریق کار سہل بنانے کی خاطر زیادہ مراعات دینے کا اعلان کیا ہے۔"

میں نے کہا "کاروبار کے آغاز میں کچھ زیادہ سرکاری دستاویزات درکار نہیں ہوتیں۔ اوّل تمھیں اپنی کمپنی رجسٹر کروانی پڑے گی اور اس کا "این ٹی این" یعنی نیشنل ٹیکس نمبر اور "ایس ٹی این" یعنی سیلز ٹیکس نمبر بنوانا پڑے گا۔ فیڈرل بورڈ آف ریونیو یعنی ایف بی آر کی ویب سائٹ www.fbr.gov.pk پر جا کر تم باآسانی اپنا نیشنل ٹیکس نمبر لے سکتے ہو۔ حکومت پاکستان نے اس عمل کو اتنا آسان کر دیا ہے کہ اب تمھیں کسی

www.pdfbooksfree.pk

وکیل کی بھی ضرورت نہیں۔ پھر بھی تم کوئی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو تو کسی اکاؤنٹنٹ یا وکیل کے پاس چلے جاؤ۔ وہ تمہاری کمپنی رجسٹر کروا کے تمھیں این ٹی این بھی دے دے گا۔

"دوسرے تمھیں کسٹم ہاؤس میں اپنی کمپنی کی بطور ایکسپورٹر رجسٹریشن کرانی ہوگی۔ جب بھی تم باہر بھجوانے کے لیے مال تیار کرو گے، تمہارا کلیئرنگ ایجنٹ تمہاری رجسٹریشن کروا دے گا۔ اس کے علاوہ ایکسپورٹ کے لیے تمھیں جو دستاویزات درکار ہوں گی، ان میں تمہاری انوائس یعنی ایکسپورٹر کمپنی کے نام رسید، بل آف لیڈنگ (bill of lading) اور پیکنگ لسٹ شامل ہیں جو تمہاری شپنگ کمپنی دے گی اور وہ تمہارے غیرملکی خریدار کی شپنگ کمپنی کو دے گی۔

DS-CONCEPT
Intelligent Trade Finance

پیکنگ لسٹ ایک دستاویز ہے جس میں لکھا ہوتا ہے کہ سامان کیسے پیک ہوا یعنی مال کے کل کتنے کارٹن ہیں، ایک کارٹن میں کتنے پیکٹ ہیں اور ایک پیکٹ میں آپ کی مصنوعات کے کتنے یونٹ ہیں۔ اسی طرح بل آف لیڈنگ وہ دستاویز ہے جو بندرگاہ یا ہوائی اڈے پر سامان کلیئر کراتے ہوئے آپ کا شپنگ ایجنٹ بطور قانونی دستاویز دوسری کمپنی کے شپمنٹ ایجنٹ کے حوالے کرتا ہے۔ بل آف لیڈنگ کے بغیر سامان بندرگاہ سے نکل نہیں سکتا اور دوسرے ملک کی بندرگاہ پر پہنچ کر کلیئر نہیں ہوتا۔ ان دستاویزات کے نمونے تم انٹرنیٹ پر ان کے ناموں سے سرچ کر کے دیکھ سکتے ہو تاکہ انھی نمونوں کی بنیاد پر اپنی مصنوعات کے لیے یہ دستاویزات تیار کر سکو۔"

میں اگلا سوال کرنے ہی لگا تھا کہ اس نے کہا "مجھے علم ہے کہ تم کیا پوچھنے لگے ہو۔ تم جاننا چاہتے ہو کہ ہماری مصنوعات خریدنے والی غیرملکی کمپنی ہمیں رقم (Payment) کیسے بھیجے گی اور یہ کہ ہمیں اس کی رقم نقد ملنی چاہیے؟ اگر نہیں، تو پھر دوسرا طریقہ کیا ہے؟"

میں ہنسنے لگا "ارے واہ، آپ تو اب میرے دل کی باتیں بھی جاننے لگے ہیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "جب تم اتنی لگن سے بات سنو گے، تو تمہارے دل کی بات، تو میں جان ہی لوں گا۔ بہرحال اصل موضوع کی طرف آؤ۔ اصولی طور پر تو تمھیں کوئی بار نقد رقم ہی منگوانی چاہیے۔ یہ تم "ٹی ٹی" (TT) کے ذریعے منگوا سکتے ہو جو کسی بھی ملک سے منگوائی جا سکتی ہے۔ لیکن ہر کمپنی ایسا نہیں کرتی اور نہ ہی ہر بار ایسا ہوگا۔

"غیرملکی کمپنیوں سے رقوم منگوانے کے دو تین طریقے ہیں۔ ایک کو ہم "ایل سی" (L/C) یعنی لیٹر آف کریڈٹ کہتے ہیں۔ اس طریقہ کار میں آپ بینک کو کہتے ہیں کہ فلاں غیرملکی کمپنی نے مجھے رقم بھجوانی ہے اور اس سلسلے میں وہ اپنے ملک کے فلاں بینک میں ایل سی کھلوانا چاہتی ہے۔ آپ کا بینک پھر اس کمپنی کے بینک سے تمام تفصیلات لیتا ہے۔ پھر آپ کی ایل سی کی درخواست منظور کر کے آپ کو کہہ دیتا ہے کہ آپ رقم منگوا لیں۔ ادائیگی کی اس صورت میں بینک آپ کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر غیرملکی کمپنی آپ کو رقم ادا نہیں کرتی تو اس صورت میں بینک آپ کو روپے ادا کرتا ہے۔

رقم کی ادائیگی کے دوسرے طریقے کو "ڈی سی"

www.pdfbooksfree.pk

(D.C) کہتے ہیں یعنی دستاویزات کے بدلے نقد رقم۔
اس میں یہ ہوتا ہے کہ اپنا امپورٹ شدہ مال کلیئر کروانے کے لیے آپ کو بل آف لیڈنگ، اصل انوائس اور پیکنگ لسٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ یہ دستاویزات اپنے بینک میں جمع کرواتے ہیں۔ وہ انھیں غیرملکی کمپنی کے بینک کو بھیجتا ہے۔ وہ غیرملکی بینک اپنے ملک کی کمپنی کو تبھی مال دیتا ہے جب وہ انھیں نقد رقم دیتی ہے۔ لیکن اگر غیرملکی کمپنی آپ کی دستاویزات نہ لینے آئے، تو اس صورت میں بینک آپ کی رقم لوٹانے کا ذمے دار نہیں ہوتا۔"

اب میں نے لقمہ دیا: "صاحب بھائی، امپورٹ کا کاروبار شروع کرتے وقت کسی سرکاری ایجنسی سے بھی مدد مل سکتی ہے؟"

میں نے جواب دیا: "تم نے اچھا اور بروقت سوال پوچھا۔ مدد بالکل مل سکتی ہے، لیکن افسوس پاکستان میں یہ رقم تمھیں نجی شعبے ہی سے ملے گی۔ دنیا میں ہر ملک نے اپنا امپورٹ ایکسپورٹ بینک بنا رکھا ہے۔ وہ امپورٹ کا کاروبار کرنے والوں کو آسان شرائط پر قرضے دیتا ہے۔ افسوس پاکستان میں ایسے ہی ایک بینک کی حتمی منظوری ہونے کے باوجود اس کا دور دور تک نام و نشان نہیں۔ بہرحال ڈی ایس کونسیپٹ (ds concept) نامی بین الاقوامی کمپنی کی ایک شاخ کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں کھلی ہے۔ اس کی ویب سائٹ کا نام ہے:

www.ds-concept.net.pk

یہ کمپنی آپ کو امپورٹ کا کاروبار کرنے کے لیے مخصوص شرائط پر سرمایہ فراہم کرتی ہے بشرطیکہ آپ کے پاس آرڈر ہو۔

"عام طور پر غیرملکی کمپنی جب آپ سے مال خریدے، تو وہ آپ کو سامان کی تیاری کے لیے ۳۰ سے ۹۰ دنوں کا وقت دیتی ہے۔ اگر آپ نے اس کمپنی کے ساتھ یہ طے کیا کہ رقم دستاویزات کے بدلے ملتی ہے، تو وہ آپ کو ۹۰ دن بعد ہی ملے گی جبکہ آرڈر تیار کرنے کے لیے آپ کو ابھی روپے چاہئیں۔

اگر آپ سرمایہ فراہم کرنے والی کمپنی کو اپنے آرڈر کی دستاویزات دے دیں، تو وہ آپ کو نقد رقم دیتی ہے۔ اس رقم سے پھر اپنا آرڈر تیار کرانا ممکن ہوتا ہے۔ جب آپ کا بل خریدار کمپنی ادا کرے گی، تو اسے سرمایہ کار کمپنی رقم لے گی اور اپنی فیس رکھ کر باقی رقم آپ کو دے گی۔

سرمایہ کار کمپنی سے مدد لینے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ اپنے نیٹ ورک کے ذریعے آپ کی خریدار کمپنی کی صلاحیت بھی جانچتی ہے کہ آیا وہ پیسے بھی دے گی یا نہیں اور اس حوالے سے اس کی تاریخ کیسی ہے۔ ڈی ایس کے علاوہ یہ کمپنی بقیہ ادائیگی کے طریق کار پر بھی کام کرتی ہے جس کی تفصیلات تم اس کی ویب سائٹ سے جان سکتے ہو۔"

ہم باتوں باتوں میں ایک گھنٹہ گزار چکے تھے اور پتا بھی نہیں چلا۔ علی نے حیران ہو کر کہا: "اتنی زیادہ [illegible] تو میں نے آج تک نہیں حاصل کی۔"

میں نے اسے بتایا کہ جتنے انہماک سے تم نے باتیں سنی ہیں، اس میں غرق ہو کر انسان کی دوسرے کاموں پر توجہ نہیں رہتی۔ اگر تم اسی انہماک سے کاروبار پر محنت کرنے لگے، تو ان شاء اللہ کامیاب ہو گے۔ چلو پشاوری قہوہ پیتے ہیں، وہ ہاضمے کے لیے اکسیر ہوتا ہے۔ میں وہاں تمھیں بتاؤں گا کہ جانوروں کی انتڑیاں برآمد کر کے منافع بخش کاروبار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

معرکہ کارگل کا دلیر مجاہد

جس نے بے سروسامانی کے باوجود برف پوش وادیوں میں طاقتور عدو کو ننگی کا ناچ نچا دیا

ثنا زینب

"میرے جوانو! آج ہم جس مشن کے لیے روانہ ہونے والے ہیں، اس میں کامیابی پانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ہمیں دلیری و جرأت سے یہ مشن کامیاب بنانا ہے تاکہ کشمیر کی مقبوضہ وادی میں مسلمان بہنوں، ماؤں اور بچوں کی بے حرمتی کرنے والی بھارتی فوج کو ایسا سبق سکھایا جائے کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے۔"

لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن نے یہ الفاظ اپنی کمپنی سے خطاب کرتے ہوئے اس وقت کہے جب وہ ان کی زیر قیادت کارگل کے محاذ پر جانے لگی۔ یہ ولولہ انگیز خطاب سننے کے بعد کمپنی کے افسروں اور جوانوں میں جہاد کا جذبہ دیدنی تھا۔ تمام نے یک آواز ہو کر کہا "سر! آپ نے جو مشن ہمارے سپرد کیا، ہمیں پیچھے نہیں پائیں گے۔ آپ کے ساتھ رہیں گے اور آپ کے ساتھ ہی شہید ہوں گے۔"

www.pdfbooksfree.pk

اس پر لیفٹیننٹ فیصل ضیا کی گرجدار آواز پھر گونجی "آج سے نہ میں آپ کا افسر اور نہ آپ میرے ماتحت، ہم سب برابر ہیں۔ اکٹھے جئیں گے اور اکٹھے ہی شہید ہوں گے۔"

یہ سنتے ہی فضا اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ سرفروشوں کا یہ قافلہ ۲ جولائی ۱۹۹۹ء کو گلگت روانہ ہوا۔ یونٹ ۲۴ این ایل آئی کے باقی افسر اور جوان بھی ہمراہ تھے۔ عام طور پر جب کوئی یونٹ سرد علاقوں میں تعینات ہو تو اسے پہلے تین ماہ گلگت چھاؤنی میں رکھا جاتا ہے تاکہ جوان مقامی موسم سے مانوس ہو جائیں۔ اکثر اوقات بلند برفانی پہاڑی سلسلوں میں پہنچ کر جوان بے شمار جسمانی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آکسیجن کی قلت کے باعث انسانی پھیپھڑے پھٹ جاتے ہیں اور دشمن سے نبرد آزما ہونے کے بجائے موذی بیماریوں ہی سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

لیکن ۲۴ این ایل آئی یونٹ کو صرف ایک دن کا قیام دے کر کارگل کی ۱۸ ہزار فٹ بلند چوٹیوں پر جنگ کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس سے جوانوں کی صحت پر برا اثر پڑا۔ لیکن دفاع وطن کی پکار پر سبھی جوانوں نے اپنی ہمت اور حوصلے سے موذی صعوبتوں کو مات دے دی۔ انھوں نے برفانی گھاٹیوں اور برف پوش بلند ترین پہاڑی سلسلوں کو عبور کرنے کا آغاز کیا۔ تقریباً چار دن میں پیدل ہی طے کر کے یہ یونٹ کے جوان اور افسر دنیا کی مشکل ترین بلندی پر پہنچے ہیں۔ جہاں قدم قدم پر سانس بحال کرنے کی کوشش سے رکنا پڑتا۔ ان غیور جوانوں کی منزل وہ بلند اور دشوار ترین چوٹیاں تھیں جہاں سے کارگل اور سیاچن جانے والی واحد سڑک گزرتی ہے۔ عسکری لحاظ سے اس سڑک پر قبضہ بہت ضروری تھا تاکہ دشمن کی شہ رگ کاٹ کر اسے کشمیر سے بھاگنے پر مجبور کیا جا سکے۔

دوران مسافت ایک مقام ایسا آیا جہاں برف پوش پہاڑی بالکل عمودی تھی۔ آسمان سے چھوتی چوٹی کو عبور کرنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ کمانڈنگ آفیسر کے مطابق یہ کام کمانڈوز ہی انجام دے سکتے تھے کہ وہ چوٹی پر پہنچ کر رسی کے ذریعے جوانوں کو پہاڑی کی بلندی پر چڑھاتے۔ سبھی جوان طویل مسافت پیدل طے کرنے اور سرد ترین موسم میں چلتے چلتے نڈھال ہو چکے تھے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ عمودی پہاڑی پر چڑھ سکیں۔

اسی اثنا میں لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن نے کمانڈنگ آفیسر سے کہا "سر! کمانڈوز بلوانے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و حمایت سے میں یہ معرکہ سر کر کے دکھاتا ہوں۔" نوجوان کے چہرے پر تھکاوٹ اور بے آرامی کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن آنکھوں میں بلا کی چمک دیکھ کر محسوس ہوتا کہ یہی وہ جوان یہ مشکل کام کر سکتا ہے۔ کمانڈنگ آفیسر نے اسے سمجھایا کہ عمودی برف پوش پہاڑی پر چڑھنا آسان کام نہیں۔ پھر تم ابھی پاکستان ملٹری اکیڈمی سے فارغ ہوئے ہو۔ پیشہ ورانہ تربیت سے بھی نہیں گزرے۔ افسر کی کاغذی ورق ۲ ماہ سے ملتوی ہے۔ کارگل کی دشوار گزار وادیوں نے اسے پکارا ہے۔

لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن نے کمانڈنگ آفیسر کو کہا "میں کئی بار ان بلند ترین چوٹیوں کو عبور کر چکا ہوں۔ مجھے رسی کے ساتھ ان چوٹیوں پر چڑھنا انتہائی مشکل ہے لیکن جناب، میں نے زندگی میں کبھی ہار نہیں مانی۔ میرے اٹھتے قدم ہمیشہ آگے ہی بڑھتے ہیں، کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ پھر مجھے ایک غازی کا بیٹا ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔"

دراصل فیصل ضیا گھمن بچپن سے عسکری ناول بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ اسی شوق کی بدولت اس نے کئی مرتبہ

اپنے والد سے ذہانت بھی کمائی۔ لیکن عسکری ناولوں نے اس کے اندر ایسا معرکہ آرا انسان پیدا کر دیا جو مشکل سے مشکل جنگی مہم سر کرنے کے لیے ہمہ وقت خود کو تیار پاتا۔ اب بھی وہ خود کو جنگی ناول کا کردار ہی محسوس کرتا۔

آخر کمانڈنگ افسر نے اجازت دے دی۔ وہ ایک حوالدار کے ساتھ عمودی برف پوش پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ یونٹ کے سبھی افسر اور جوان فیصل کی ہمت و جذبے کو دل ہی دل میں خراج تحسین پیش کرنے لگے۔ انھوں نے اس کی کامیابی کے لیے دعا بھی مانگی۔ کئی گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد لیفٹیننٹ فیصل حوالدار سمیت اس عمودی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھنے میں کامیاب رہا۔ اس پر وہ بلاشبہ مبارک باد کے مستحق تھے۔ یونٹ کا ہر شخص ان کی جرأت اور بہادری کی تعریف کر رہا تھا۔

بی کمپنی کے وہ جوان پھولے نہ سماتے جنھیں لیفٹیننٹ فیصل کی سرپرستی حاصل تھی۔ اب چوٹی سے رسے نیچے پھینکے گئے۔ تمام جوانوں نے باری باری پہاڑی چوٹی پر گرم کمروں میں نرم و گداز بستروں پر سونے والے مجاہدوں کے لیے آرام کرنے اور سونے کو یہاں برف کا بستر بچھا تھا۔ سخت سرد موسم اور برفانی طوفان ان کے ارادے پست کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن شیر دل جوان وطن کی خاطر سبھی دکھ و مصیبتیں جھیلنے پر آمادہ تھے۔

۱۹ جولائی ۱۹۹۹ء کو یونٹ کی تین کمپنیاں مقررہ جگہ پہنچ گئیں۔ لیفٹیننٹ فیصل بی کمپنی کے دس جوانوں سمیت اپنی یونٹ سے تین سو گز دور جانب مشرق اس مقام پر مورچہ زن ہوئے جہاں کارگل سے سیاچن جانے والی واحد سڑک گزرتی تھی۔ معرکہ کارگل میں بھارتی فوج کو اس لیے زبردست جانی نقصان اٹھانا پڑا کہ وہ پستی میں تھے۔ بلند چوٹیوں پر بیٹھے مجاہدین انھیں اوپر ہی سے دیکھ کر گولیوں سے بھون دیتے۔ مزید برآں سیاچن میں ہزارہا بھارتی فوجی محصور تھے۔ پاک فوج کے جوانوں نے ان کی خوراک اور اسلحے کی رسد روک دی۔ اگر ۵ جولائی کو واشنگٹن میں نواز کلنٹن جنگ بندی معاہدہ نہ ہوتا اور پاکستانی فوج محاصرہ جاری رکھتی تو سیاچن پر ہزارہا بھارتی فوجی اپنی موت آپ مر جاتے۔

کارگل لیہہ روڈ سے کچھ ہی فاصلے پر ارشد نامی پوسٹ پر لیفٹیننٹ فیصل دس جوانوں سمیت دشمن کے انتظار میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ یاد رہے، کارگل کی ان وادیوں میں بھارتی بوفرز توپوں نے اتنی شدید گولہ باری کی تھی کہ ان کے دہانے ناقابل استعمال ہو گئے۔ بعد میں بھارت کو وہ دہانے سوئٹزرلینڈ سے منگوانے پڑے۔ پورے علاقے میں بھارتی ہیلی کاپٹر اور جنگی جہاز مسلسل بمباری کر رہے تھے۔ وہ پاکستانی ٹھکانوں پر نہ صرف میزائلوں سے حملہ کرتے بلکہ پوزیشن بتا کر بھارتی توپ خانے سے فائر کراتے۔ ان ہیلی کاپٹروں سے زہریلی گیس کے بم بھی گرائے گئے۔ لیکن پاکستانی مجاہدوں اور کشمیری مجاہدین کو اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید و حمایت حاصل تھی۔ اس لیے گیس بم اور میزائل کارگر ثابت نہ ہوئے۔ بلکہ ہوا کے جھونکے رخ بدل دیتے تو کئی بار ان گیسی میزائلوں نے بھارتی فوجیوں ہی کو نشانہ بنایا۔

۱۶ جولائی کی شام بھارتی فوج نے ارشد پوسٹ پر زبردست حملہ کر دیا۔ تین گھنٹے تک جاری رہنے والی جنگ کے دوران بی کمپنی کے دو جوان شہید ہو گئے۔ بھارت کے درجنوں فوجی جہنم واصل ہوئے۔ سفید برف سے ڈھکی برفانی ڈھلوانیں بھارتی فوجیوں کے خون سے سرخ ہو گئیں۔ حملہ تو پسپا ہو گیا لیکن رات کے سناٹے میں زخمی انسانوں کی آہ و بکا سنائی دیتی رہی۔

www.pdfbooksfree.pk

۱۷ر جولائی کا سورج طلوع ہوا تو برفانی پہاڑیاں سرخ دکھائی دیں۔ ای کمپنی کے باقی ماندہ آٹھ جوان مستعدی سے اپنی پوسٹ پر دشمن کا انتظار کرتے رہے لیکن بھارتیوں کو دوبارہ حملے کی ہمت نہ ہوئی۔

۱۹ر جولائی کو بھارتی فوج نے ارشد پوسٹ پر ایک کمپنی کی نفری سے حملہ کیا جسے لیفٹیننٹ فیصل کی زیرِقیادت پاک فوج کے غیور جوانوں نے روک لیا۔ دشمن کو بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچا کر پسپا ہونا پڑا۔ اسی رات کارگل لیہ روڈ پر بھارتی فوج کا ٹرکوں پر مشتمل قافلہ نظر آیا۔ یہ قافلہ سیاچن میں تعینات بھارتی فوج کے لیے خوراک لے کر جا رہا تھا۔ لیفٹیننٹ فیصل نے توپوں سے نشانے لگوا کر بھارتی فوج کا پورا قافلہ راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ فیصل ضیا کے کامیاب جنگی معرکوں کی خبریں کمانڈنگ افسر تک مسلسل پہنچ رہی تھیں۔ وہ فیصل کو ہر معرکے کے بعد وائرلیس پر شاباش دیتے۔

۲۲ اور ۲۳ر جولائی کی رات دشمن نے ایک بٹالین نفری کے ساتھ ارشد پوسٹ پر پھر چاروں طرف سے گھیرا ڈال کر حملہ کیا۔ بھارتی میجر نے وہی مائیکروفون پر ارشد پوسٹ پر تعینات پاک فوج کے جوانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "تمھیں گھیرا ڈال لیا گیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ ہتھیار ڈال دیں۔ بھارتی فوج ان کو زندگی کی ضمانت دیتی ہے۔"

یہ اعلان سن کر لیفٹیننٹ فیصل ضیا نے بلند آواز میں کہا کہ میں اپنے جوانوں کے ساتھ ارشد پوسٹ پر موجود ہوں۔ اگر ہمت ہے تو آگے بڑھو۔ مسلمان ہتھیار ڈالنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔ شہادت کی موت ہی ہماری زندگی کا بہترین سرمایہ ہے۔"

فیصل کا جواب سن کر بھارتی میجر ششدر رہ گیا کہ بارہ سو بھارتی سپاہیوں کی موجودگی میں جو ہر قسم کے جدید اسلحے سے لیس تھے، پاک فوج کا یہ کتنا دلیر افسر ہے کہ گھیرے میں آنے کے باوجود مقابلے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ ۴ گھنٹے تک ارشد پوسٹ پر بھارتی فوج چاروں طرف سے گولہ باری کرتی رہی۔ لیکن فیصل کی قیادت میں مجاہدوں نے مردانہ وار مقابلہ کر کے حملہ پسپا کر دیا اور بھارتیوں کو ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ چناںچہ نفری سمیت بھارتی میجر اپنے زخم چاٹتا واپس لوٹ گیا۔

"میں اپنے جوانوں کے ساتھ ارشد پوسٹ پر موجود ہوں۔ اگر ہمت ہے تو آگے بڑھو۔ مسلمان ہتھیار ڈالنے کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔ شہادت کی موت ہی ہماری زندگی کا بہترین سرمایہ ہے۔"

بھارتی فوج کی اندھا دھند گولہ باری سے برفانی پہاڑیوں پر پگھلی برف زہریلی ہو گئی۔ پیاس بجھانے کے لیے جب برف پگھلائی جاتی، تو زہریلا پانی پینے والوں کو خونی پیچش لگ جاتے۔ فیصل سمیت ہی کمپنی کے تمام جوان پیچش ہونے سے انتہائی لاغر اور کمزور ہونے لگے۔ پھر بھی ان کی جرأت اور بہادری کے باعث دشمن ارشد پوسٹ پر قبضہ کرنے میں ناکام رہا۔

بھارتی فوج کا رخ پھر ارشد پوسٹ سے چند سو گز دور واقع ایک اور پاکستانی چوکی کی طرف ہو گیا۔ وہاں کیپٹن کھوسہ مٹھی بھر جوانوں کے ساتھ تعینات تھے۔ بھارتی فوج کا دباؤ اس چوکی پر مسلسل بڑھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر لیفٹیننٹ فیصل اور کیپٹن شاہد، کیپٹن کھوسہ کی مدد کے لیے نیچے اترے۔ دشمن مسلسل گولہ باری کر رہا تھا۔ بھارتی فوج کی بھاری نفری اس پاکستانی چوکی کو گھیرے میں لیے زبردست فائرنگ کر رہی تھی۔ اب اس جنگی معرکے میں

www.pdfbooksfree.pk

لیفٹیننٹ فیصل اور کیپٹن شاہد بھی شریک ہو گئے کیونکہ دونوں تجربہ کار افسر بھارتی حربوں کو اپنی حکمت سے کئی مرتبہ ناکام بنا چکے تھے۔ انھیں بھارتی فوج سے نمٹنے کا خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔

لیکن جونہی لیفٹیننٹ فیصل وہاں پہنچے، ان کے ماتھے کو چیرتی ایک گولی جسم میں پیوست ہو گئی۔ عزم و ہمت کے پیکر کا لہو برفانی چوٹیوں پر بہنے لگا۔ چند لمحوں بعد ہی انھوں نے جام شہادت نوش کر لیا جس کے لیے وہ پاک فوج میں شامل ہوئے تھے۔ یہ ۲۳ جولائی کی شب تھی جب فیصل ضیا نے شہادت کو گلے لگایا۔ آہستہ آہستہ ارشد یوسف کے دیگر جوان بھی اپنے قائد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شہید ہو گئے۔

اس طرح انھوں نے یوں عہد پورا کر دکھایا جو محاذ جنگ پر روانہ ہونے سے قبل اپنے قائد اور راہنما لیفٹیننٹ فیصل گھمن کے ساتھ کیا تھا۔ ارشد یوسف (لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن کی شہادت کے بعد فیصل ضیا [illegible]) پر دشمن نے قبضہ کر لیا۔ دشمن کے زیر قبضہ علاقے سے شہیدوں کی میتیں واپس لانا مشکل مرحلہ تھا۔ اس سلسلے میں کئی جانبازانہ آپریشن کیے گئے۔ جس میں میجر سمیت کئی جوان زخمی ہوئے۔ تب کہیں جا کر لیفٹیننٹ فیصل ضیا سمیت شہدا کی میتیں گھر واپس لائی جا سکیں۔

٭٭٭

۲۳ جولائی ۱۹۹۹ء کو نماز مغرب کی ادائیگی کے دوران فون کی گھنٹی بجی جس کا لاشعور میں پہلے سے انتظار تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد لیفٹیننٹ فیصل ضیا کے والد گرامی، میجر ضیا قادر گھمن نے فون کا ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب ایف ایف ۳۳ کے کرنل مجاہد بول رہے تھے۔ انھوں نے نہایت ضبط و تحمل سے بتایا کہ لیفٹیننٹ فیصل ضیا کو گولی لگ گئی ہے۔ وہ زخمی حالت میں ہیں۔ ڈاکٹر ان کی مکمل دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ فیصل کے بارے میں وقتاً فوقتاً آپ کو اطلاع دی جاتی رہے گی۔ جونہی فون بند ہوا، باپ کو بیٹے کی شہادت کا یقین ہو گیا۔ کارگل جانے سے پہلے ہی میجر ضیا قادر نے نمازوں کے بعد جب بھی اپنے بیٹے کا تصور کیا، وہ انھیں سبز ہلالی پرچم میں لپٹا چارپائی پر لیٹا دکھائی دیا۔

والد کی بے قراری میں اضافہ ہوا تو انھوں نے ایک عزیز کو فون کیا جو ان دنوں سکردو ہی میں تعینات تھے اور کہا کہ آپ سکردو کے فوجی اسپتال میں جا کر پتا لگائیے، فیصل واقعی وہاں موجود ہے اور کس حالت میں ہے۔ دس منٹ بعد دوبارہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سکردو سے میجر صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ ضیا قادر گھمن کو بتانے لگے کہ یونٹ میں شہدا کی جو فہرست آئی ہے، اس میں لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن کا نام بھی درج ہے۔ یہ کہتے ہی ان کی زبان سے "انا للہ وانا الیہ راجعون" نکلا اور فون بند ہو گیا۔

اسی روز لیفٹیننٹ فیصل ضیا کی خبر پورے شہر میں پھیل گئی۔ ہزارہا لوگ شہید کے آبائی گھر کے باہر جمع ہو گئے۔ ہر شخص شہادت کا ورد کر رہا تھا۔ لوگ جب بلند آواز میں کلمہ پڑھتے، تو محسوس ہوتا جیسے آج شہید کے گھر اللہ کی رحمتیں نازل ہو رہی ہیں اور جمع ہونے والے انسان نہیں فرشتے ہیں جو شہادت کی گواہی دینے زمین پر اترے ہیں۔

۲۸ جولائی ۱۹۹۹ء کی دوپہر جب سبز ہلالی پرچم میں لپٹا شہید کا جسد خاکی گھر پہنچا، تو شدت جذبات سے ماں کی حالت غیر ہو گئی۔ بھائی تابوت سے لپٹ لپٹ جاتے۔ شہید کے والد نے کسی حد تک خود کو سنبھالے رکھا۔ شہادت کے پانچ روز بعد بھی لیفٹیننٹ فیصل ضیا کی نعش تروتازہ تھی۔ جسم اتنا نرم جیسے زندہ انسان کا۔ ماتھے پر جہاں

www.pdfbooksfree.pk

کوئی گلی تھی۔ پانچ دن بعد بھی زخم سے خون قطروں کی صورت رس رہا تھا۔

جب شہید کا جسد خاکی تدفین کے لیے آبائی قبرستان لے جایا گیا، تو وہاں بادلوں کا ایک ٹکڑا قبرستان پر سایہ کرنے ٹھہرا رہا۔ تدفین کے بعد سب لوگ واپس چلے گئے۔ دوسری صبح محسوس ہوا کہ قبر پر کتبہ ٹیڑھا لگا ہے۔ شہید کے والد کی اجازت سے جب کتبے والی جگہ کھودی گئی تو وہاں سے سیمنٹ کا ایسا ٹکڑا ملا جس پر کلمہ طیبہ "لا الٰہ الا اللہ" کندہ نظر آیا۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی عظیم تخلیق کار نے کلمہ طیبہ کا یہ نقش نہایت محنت اور خوبصورتی سے تراشا ہے۔ یہ ٹکڑا آج بھی شہید کے گھر فریم میں محفوظ ہے۔ اسے دیکھ کر شہید کے والد کو یقین ہو گیا کہ بیٹے کی قربانی اللہ تعالیٰ نے قبول کر لی۔ قرآن مجید میں آیا ہے، بے شک اسلام کی سربلندی اور دفاع وطن کے لیے جان کی قربانی دینے والا شہید زندہ ہوتا ہے اگرچہ ہمیں اس کی زندگی کا شعور نہیں۔ فیصل کی شہادت نے یہ سچ کر دکھایا۔

حالات زندگی

لیفٹیننٹ فیصل ضیا گھمن ۷ مئی ۱۹۷۸ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد میجر ضیا قادر تعینات تھے۔ ابتدائی تعلیم مختلف شہروں میں پائی۔ میٹرک کا امتحان ایف جی پبلک اسکول [illegible] سے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ایف ایس سی گورنمنٹ ڈگری کالج گوجرانوالہ سے کیا۔ ایف ایس سی کے بعد ۱۹۹۵ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی چلے گئے۔ ۱۹۹۸ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی سے ابتدائی تربیت مکمل کی۔ بعدازاں شہید نے والد کی یونٹ ایف ایف ۳۳ کو منتخب کیا۔ یونٹ میں انھوں نے محنت اور جدوجہد سے اپنا لوہا منوایا۔ وہ باپ کی حمایت لیے آگے نہیں بڑھنا چاہتا تھا بلکہ آزمائش اور امتحان کی ہر کسوٹی میں ثابت

کارگل کی جنگ

یہ مئی ۱۹۹۹ء کی بات ہے جب کشمیری مجاہدین نے مقبوضہ کشمیر میں کارگل سیکٹر کی پہاڑیوں پر قبضہ کیا۔ مدعا بھارتی فوج کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا تھا۔ یوں اس معرکے کا آغاز ہوا جو "کارگل جنگ" کہلایا۔ کشمیری مجاہدین کی مدد کے لیے بعدازاں پاک فوج کو بھی جنگ میں شامل ہونا پڑا۔ یہ جنگ جولائی تک جاری رہی۔ بھارتی فوج نے عددی برتری اور جدید ترین اسلحے سے فائدہ اٹھا کر پھر کارگل کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔

کارگل جانے والی پاک فوج کے دستوں میں لیفٹیننٹ فیصل ضیا کی یونٹ بھی شامل تھی۔ آپ نے معرکہ کارگل میں جام شہادت نوش کیا۔ زیرِنظر مضمون ان کی شہادت کے فوراً بعد لکھا گیا تھا۔ اب شہید کے والد میجر (ر) ضیا قادر بھی وفات پا کر رب کریم کی بارگاہ میں حاضر ہو چکے۔

[illegible]

شہید کے والد میجر ضیا قادر گھمن کہتے ہیں، چونکہ میں خود فوج میں تھا اس لیے فیصل سمیت میرے تینوں بیٹوں کی تربیت بھی عسکری ماحول میں ہوئی۔ فیصل کو بچپن ہی سے فوج میں جانے کا بے حد شوق تھا۔ میں جب گھر آ کر وردی اتارتا تو فیصل میرے فوجی بوٹ پہن کر گھر میں گھومتا پھرتا۔ وہ بہت بہادر، خوددار اور منکسار تھا۔ لیکن اس کی تخلیقی ذوق اسلامی، عسکری اور تاریخ کی کتابوں سے تھی۔ وہ مطالعے کا اس حد تک شوقین تھا کہ مجھ سے کئی مرتبہ ڈانٹ کھائی۔ میری تمنا تھی کہ وہ زیادہ وقت درسی

www.pdfbooksfree.pk

کتابوں کے مطالعے میں گزارے۔ لیکن جب بھی سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے ایک ہی جواب دیا "ابا جان آپ کو اچھے نتائج چاہئیں، وہ آپ کو مل جائیں گے۔ آپ مجھ سے مطالعے کا شوق نہ چھینیے۔"

کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا کہ کسی وجہ سے وہ کوئی نہ کوئی جنگی ناول لیے غسل خانے چلا جاتا۔ کافی دیر تک نہ نکلتا تو والدہ کو فکر لاحق ہوتی۔ وہ چھڑی پکڑے جنگی آواز میں فیصل کو نکلنے کا کہتی۔ جب وہ نکلتا تو پسینے سے شرابور ہوتا۔ نکلتے ہی والدہ سے کہتا کہ تھوڑا سا ناول رہ گیا تھا، وہ بھی پڑھ لینے دیتیں۔ نسیم حجازی کے ناول، فیصل ضیا گھمن شہید کے پسندیدہ ناول نگار تھے۔ ان کے تمام ناول اور کردار اسے ازبر ہو گئے تھے۔ وہ چھوٹے بھائیوں سے ناولوں کے کرداروں کی جرأت و بہادری پر اکثر بحث کرتا۔

حضرت خالد بن ولید، طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم اس کے پسندیدہ مسلمان جرنیل تھے۔ وہ اکثر کہتا کہ جب بھی قدرت نے موقع دیا، تو میں بھی ان کی طرح کے بڑے کارنامے انجام دوں گا۔ اس کی آنکھوں میں خاص چمک تھی۔ وہ نہ صرف اچھا قاری بلکہ بہترین لکھاری بھی تھا۔ اپنی ڈائری باقاعدہ لکھتا جس میں دوران تربیت کے واقعات تفصیل سے درج کرتا۔

شہید کے والد بتاتے ہیں کہ فیصل عام بچوں کی طرح بھارتی فلموں اور گانوں کا شوقین نہیں تھا بلکہ فارغ وقت مطالعے ہی میں گزارتا۔ ایک ذمے دار بیٹا تھا۔ اس کے ذمے جو کام لگایا جاتا، وہ نہایت خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا۔ وہ میرا بیٹا تھا اور دوست بھی۔ فوج میں شمولیت کے بعد ذمے داری کا احساس اس کی شخصیت کا خاصہ رہا۔ فیصل کو سفارش سخت ناپسند تھی۔ وجہ یہ کہ اس سے حق دار کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اسکول سے لے کر فوج میں جانے تک ہر امتحان کا سامنا فیصل نے از خود کیا اور کسی جگہ میری سفارش نہیں لی۔ فوجیوں کی زندگی حق تلفی اور ناانصافی ختم کرنے کے لیے ہی وقف ہے۔ فوج میں اگر کوئی سفارش کا سہارا لے، تو وہ اپنے عظیم مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔

میجر ضیا قادر بتاتے ہیں "میں گزشتہ ۲۳ سال سے سگریٹ پینے کے باعث سگریٹ نوشی کا عادی ہو چکا تھا۔ لیکن فیصل نے یہ کہہ کر میرے سگریٹ چھڑوا دیے "ابو جی تمباکو نوشی اچھی بات نہیں۔" میں نے پھر آج تک سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا حالانکہ میں بیٹے فیصل کا کہا ٹال بھی سکتا تھا۔ لیکن جانے بیٹے کی نصیحت میں کیا مصلحت پنہاں تھی کہ میں اس سے صرف نظر نہیں کر سکا۔ میرا بیٹا بہت ذہین تھا، ہمیشہ ہر امتحان میں اول آتا۔ شہادت کا جام پی کر بھی اس نے عسکری امتحان میں اول پوزیشن لی جس پر باپ کو فخر ہے۔"

شہید کی والدہ کا کہنا ہے "بے شک شہادت عظیم اعزاز ہے جو ہمیں فیصل کی بدولت حاصل ہوا۔ میں جب فیصل شہید کی تصویر پہ نگاہ ڈالوں، تو اس کی آنکھیں اور ہونٹ ہلتے محسوس ہوتے ہیں۔ شاید وہ مجھے یہ کہتا ہے کہ امی جان! میں جنت میں بہت خوش و خرم ہوں اور مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں۔ اس کی جدائی ناقابل برداشت ہے۔ لیکن یہ سوچ کر مجھے تسلی ہوتی ہے کہ بیٹے نے بھی کشمیری مسلمان بہنوں اور ماؤں کی آبرو بچانے کے لیے اپنی جان دی۔ میرے خاندان کے کئی لوگ فوج میں موجود ہیں۔ لیکن گھمن خاندان کا یہ پہلا شہید ہے جسے ستارۂ جرأت کے اعزاز سے نوازا گیا۔" یہ نشانِ حیدر کے بعد سب سے بڑا فوجی اعزاز تصور کیا جاتا ہے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

جن دنوں صوبہ بہار میں زلزلہ آیا، میں آسام کی ایک غیر معروف ریاست میں بحیثیت انجینئر ملازم تھا۔ زلزلے کے بعد امدادی کام شروع ہوا تو میں نے بھی ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ ریاست کا وزیر بارسوخ شخص تھا۔ اس کے ساتھ میرے اچھے مراسم تھے۔ چناں چہ مجھے ملازمت مل گئی۔ میرا کام تسلی بخش تھا۔ جلد ہی مجھے ایگزیکٹو انجینئر بنا کر موتی ہاری بھیج دیا گیا۔

اس جگہ پہلی مرتبہ قدرت کی تباہ کاریاں دیکھنے کا موقع ملا۔ دفتر میری کوٹھی کے قریب ہی تھا۔ دفتر کی عمارت ابھی زیرِ تعمیر تھی۔ تین چار کمرے ہمارے تصرف میں تھے۔ سوائے میرے کمرے کے باقی کمروں میں سفیدی بھی نہ ہوئی تھی۔ فرش کی بھدی اینٹیں چھپانے کے لیے دری بچھا دی گئی۔ میرے کمرے میں دو بڑی کھڑکیاں اور دروازے تھے۔ ایک دروازہ بڑے کمرے میں کھلتا جہاں کلرک کام کرتے تھے۔ اس وقت چپراسی کے علاوہ عملے میں آٹھ کے قریب دیگر ملازمین بھی شامل تھے۔

جب بااصول اور عزت دار نے کیا

ایک روپے کا سوال

انسان دوستی اور لافانی محبت کے خمیر سے گندھی طرح دار کہانی

دلونت سنگھ

www.pdfbooksfree.pk

زلزلے نے جہاں ایک طرف خاندان کے خاندان تباہ اور بدحال کر دیے، وہاں بیکاروں کے لیے روزی کے دروازے بھی کھول دیے۔ کئی اشخاص کے لیے یہ سانحہ دولت و شادمانی کا مژدہ لایا۔ جب شام کو ہم لوگ سیر کرنے نکلتے، تو جگہ جگہ دھرتی ماتا کو زخم کی طرح منہ کھولے پاتے۔ بچے حیرت سے ان اتھاہ دراڑوں میں جھانکتے۔

سردیوں کی ایک صبح میں دفتر پہنچا، تو رگھو ناتھ نے کاغذوں کا بڑا سا پلندا میرے سامنے رکھ دیا۔ پچھلی شام میں دورے سے واپس آیا تھا۔ تین چار دن کے کاغذات جمع ہو گئے تھے۔ پہلے رگھو ناتھ کاغذات رکھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلا جاتا تھا، لیکن آج وہ ہاتھ مسلتا میری میز کے قریب ہی کھڑا رہا۔ یہ سوچ کر کہ شاید وہ مجھے کچھ کہنا چاہتا ہے، میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔

پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے، چپراسی خبر لایا کہ پنڈت دیوی دیال اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ میں اس چاپلوس شخص سے ملنا نہیں چاہتا تھا، لیکن میری غیر حاضری میں وہ کئی مرتبہ چکر لگا چکا تھا۔ بچوں کے لیے پھل اور مٹھائی بھی دے گیا تھا۔ میں نے بلوایا، اس پر رگھو ناتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

دیوی دیال سینما کے "پاس" لایا تھا۔ وہ شہر کا متمول رئیس تھا۔ اس کے باوجود وہ میری اتنی چاپلوسی کر رہا تھا کہ جی چاہا، دھکے دے کر باہر نکلوا دوں۔ میری بے اعتنائی خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے دور از کار اشاروں سے اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ٹھیکیداروں سے اس کے بھٹے کی اینٹوں کی سفارش کروں۔

صاحبِ تحریر

ہندوستان کے جن غیر مسلم قلم کاروں نے اردو افسانہ کو پروان چڑھایا، ان میں بلونت سنگھ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ آپ ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۶ء میں چل بسے۔ آپ نے پنجاب کے رسوم و رواج، روایات اور معاشرتی زندگی کو نہایت خوبی سے اپنے افسانوں میں موضوع بنایا۔ وہ انسانی نفسیات کی مختلف کیفیات کو افسانوں میں چابک دستی سے بیان کرتے تھے۔ خود داران کے فن کا نمائندہ افسانہ ہے۔

میرا دھیان رگھو ناتھ کی طرف تھا۔ وہ ہمارے عملے میں سب سے معتبر شخص تھا بلکہ دوسرے تو سب نوجوان تھے۔ وہ بی اے پاس اسٹینوگرافر، نشست و برخاست میں حد درجہ مہذب، بات چیت میں ہوشیار۔ مجھے رگھو ناتھ پر بڑا بھروسا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر رک رک کر دھیمی آواز میں بات کرتا۔ اسے دیکھ کر لگتا کہ وہ ایک ذمے دار شخص ہے۔ اسی وجہ سے اسے کام بھی زیادہ کرنا پڑتا۔

ملازمت کے لیے وہ براہ راست مجھے ملنے آیا تھا۔ اس دن دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد قیلولے کے لیے پلنگ پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ نوکر نے رگھو ناتھ کا ملاقاتی کارڈ لا کر دیا۔ میں نے اس کی بے وقت آمد کو محسوس کیا۔ نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ ملازمت لینے آئے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ دفتر میں ملیں۔

اتفاق کی بات اس وقت میں ڈرائنگ روم میں ایک

www.pdfbooksfree.pk

کتاب لینے گیا۔ سونے سے پہلے کسی رسالے یا کتاب کی ورق گردانی کرنا میری عادت سی ہو گئی تھی۔ کھڑکی میں سے مجھے رگھوناتھ واپس جاتا دکھائی دیا۔ کھدر کا، نیل لگا ہوا پاجامہ، انگلش ٹویڈ کا پرانا گرم کوٹ اور سر پر کالے رنگ کی گول ٹوپی۔ ٹخنے کے قریب اس کے پاجامے میں ابھار سا پیدا ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر خیال آیا، بے چارا بوڑھا شخص ہے، اس کو بلا لینا چاہیے۔ چناں چہ نوکر بھیج کر بلوا لیا۔

جب اس کے چہرے خصوصاً نیچے کو لٹکتی سفید مونچھوں پر نگاہ ڈالی، تو مجھے اپنا جواب یاد کر کے افسوس ہوا۔ اس نے آتے ہی بے موقع آمد پر معذرت چاہی۔ وہ میرا زیادہ وقت خراب نہیں کرے گا۔ وہ نوکری کے لیے آیا تھا اور ٹائپ کرنا جانتا تھا۔ ہر قسم کی کارروائی نیز دفتری خط کتابت میں اس کا ذاتی تجربہ تھا۔

میں نے اسے شام تک بٹھائے رکھا۔ وہ اسی جگہ کا باشندہ تھا۔ میں اس سے مختلف باتیں پوچھتا اور اس کے چشم دید واقعات کے حالات بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ باتوں باتوں میں، میں نے اس کے ذاتی حالات بھی معلوم کر لیے۔ پہلے وہ متمول شخص تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ سب سے بڑا لڑکا ڈاکٹری کا امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت کرنے لگا۔ اس کے ملازم ہو جانے پر گھر والوں کو کچھ تسلی ہوئی۔ کیونکہ اس کی کمائی کا بیشتر حصہ بیٹوں کی تعلیم اور لڑکیوں کی شادیوں پر خرچ ہو چکا تھا۔

لیکن جب برے دن آتے ہیں تو آنکھ جھپکنے میں تقدیر کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ پھر ایسا قہر ہر طرف تباہ ہوا۔ لڑکے چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے تھے۔ شادی شدہ لڑکیاں بھی والدین کو ملنے آئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا، قدرت نے یہ سازش کر رکھی تھی کہ گھر کے سب افراد کو یکجا کر کے کچل دیا جائے۔ قدرت کی ستم ظریفی، اب گھر میں رگھوناتھ کی نیم پاگل بیوی، بیوہ بہن اور اس کا تین سالہ پوتا رہ گئے تھے۔ صرف بڑا لڑکا بچا، لیکن وہ بھی دق میں مبتلا ہو کر گھر پہنچا۔ باپ نے رہی سہی پونجی اس پر خرچ کر دی، لیکن موت کے چنگل سے نہ بچا سکا۔ اس کی آپ بیتی سن کر میرا دل بھر آیا۔

شام کی چائے کے بعد جب وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا "رگھوناتھ جی اتنے مصائب جھیلنے کے بعد بھی آپ کا حوصلہ اور ثابت قدمی دیکھ کر میں آپ کی بہت عزت کرنے لگا ہوں۔"

وہ اپنی چھڑی سے زمین کریدنے لگا۔ "نوازش ہے جناب کی۔ قدرت سے موت کے بعد مجھ سے ٹکرانے سے گھبراتے ہوئے بولا۔ "لیکن میرا حافظہ کچھ کمزور ہو گیا ہے۔ میں بھول جاتا ہوں کئی باتیں۔"

وہ رخصت ہوا، تو میں دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

میری سفارش پر وہ دفتر میں ہیڈ کلرک مقرر ہو گیا۔ اس کی موجودگی میرے لیے اطمینان کا باعث تھی۔ مجھے تسلی اس بات کی تھی کہ دفتر میں کم از کم ایک ذمے دار شخص موجود ہے۔ چونکہ میں خود محنتی اور ذمے دار شخص ہوں، اس لیے اس قسم کے اشخاص پا کر ہمیشہ خوشی محسوس کرتا ہوں۔ غیر ذمے دار کلرکوں کا مجھے بہت تلخ تجربہ تھا۔ کئی بار مجھے رگھوناتھ سے مشورہ بھی لینا پڑا۔ بارہا ایسا ہوا کہ ضروری کام پڑنے پر میں اطمینان کے ساتھ دورے پر چلا جاتا۔ میری غیر حاضری میں دفتر کے کام میں گڑبڑ نہ ہوتی۔

رگھوناتھ کی بعض حرکتوں سے میرا دل بہت متاثر ہوتا۔ مثلاً اس کے کوٹ کا کالر گردن کے قریب پھٹ گیا تھا۔ وہ قمیص کا کالر اس پر چڑھا کر چھپائے رکھتا۔ کبھی

www.pdfbooksfree.pk

ایسا بھی ہوتا کہ فائل لیے میرے کمرے کی طرف بڑھتا۔ پردے کے قریب پہنچ کر ایک دم رک جاتا۔ مجھے معلوم ہو جاتا کہ اس وقت وہ کوٹ کے کالر پر قمیص کا کالر چڑھا رہا ہے۔ کبھی کبھی بوسیدہ کف کوٹ سے باہر نکل آتے۔ وہ زخم چھپاتے کبوتر کی طرح انگلیوں سے کف کو کوٹ کے بازو کے اندر کر دیتا۔ ہر چند وہ یہ حرکتیں اس انداز سے کرتا کہ مجھے پتا نہ چلے، لیکن میری تجسس نگاہوں سے کوئی حرکت پوشیدہ نہ تھی۔

دیوی دیال باتیں کیے جا رہا تھا لیکن میرا دھیان دوسری طرف تھا۔ بیان چاہے جس قدر جلد ہو۔ کاش میں نے اس کو ٹالا۔ پھر تھوڑی دیر تک رگھوناتھ کا منتظر رہا لیکن وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ دو تین مرتبہ بنا چاہا کہ چپراسی سے پانی منگوا کر پیا۔ کھڑکی سے آتے جاتے مجھے لیے ٹہلتا رہا تاکہ رگھوناتھ کو معلوم ہو جائے، میں اتنا مصروف بھی نہیں، وہ چاہے تو آ کر مجھ سے بات کرے۔ اس کے بعد کچھ دیر کاغذات دیکھتا رہا۔ کھانا بھی دفتر ہی میں منگوایا لیکن وہ نہ آیا۔

شام کو دفتر کا وقت ختم ہو جانے پر عملہ میری روانگی کا منتظر تھا۔ میں نے چپراسی کی زبانی کہلوا دیا کہ وہ میرا انتظار نہ کریں۔ کھڑکی میں سے ان لوگوں کو ٹولی ٹولی اکٹھوں کی شکل میں گیٹ کے قریب سے ہو کر جاتے دیکھتا رہا۔ وہ اسکول کے لڑکوں کی طرح ایک دوسرے پر چھینٹے چھٹے جا رہے تھے لیکن ان میں رگھوناتھ شامل نہ تھا۔ چپراسی نے بتایا کہ وہ ابھی کام کر رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد رگھوناتھ اندر آیا۔ میں نے قلم ایک طرف رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا "کیا آپ کا کام ختم نہیں ہوا؟ آج آپ نے دوپہر کے وقت بھی آرام نہیں فرمایا۔ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیے...“

میں جواب میں ہنس پڑا۔ معمول کی نسبت زیادہ بے تکلفانہ انداز میں بولا: ”آپ بزرگ ہیں، خدمت کرنا تو ہمارا فرض ہے۔ آپ ابھی تک گھر کیوں نہیں گئے؟ اگر کچھ کام باقی رہ گیا ہو تو کل کر لیجیے۔“

”جی بس اب چلا جاؤں گا۔ آپ، کیا آپ ابھی تشریف رکھیں گے؟“

”جی ہاں میں ایک صاحب کا منتظر ہوں۔“

رگھوناتھ ادھر ادھر بے معنی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا ”آپ باہر لان میں بیٹھنا پسند کریں گے؟ کہیے تو کرسیاں نکلوا دوں۔“

میں رگھوناتھ سے روبرو زیادہ افسرانہ شان کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ کچھ اس لیے اور کچھ اپنی عمر کے تفاوت سے گھبرا کر وہ کبھی کبھی بے پروا ہو کر مجھ سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

”نہیں رگھوناتھ جی، میں ذرا یہ کاغذات دیکھوں گا۔“

قیافے سے معلوم ہوتا تھا، وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کچھ تذبذب میں تھا۔ وہ دفتر کی ناکافی عمارت، فرنیچر، تنخواہوں، ایک حد سے زیادہ رشوت خور اور سیٹھ کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے کچھ کہنے کے انداز سے میری طرف دیکھا۔ میں ہمہ تن گوش تھا۔ ”اچھا تو اگر آپ اجازت دیں تو میں جا سکتا ہوں۔“

میں مایوس سا ہو گیا۔ ”ضرور، ضرور۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔

اس نے کھانس کر چھتری اٹھائی، ٹوپی درست کرتے ہوئے وہ رک رک کر دروازے کی طرف بڑھا۔

”رگھوناتھ جی!“

”جی“ وہ واپس چلا آیا اور میرے سامنے میز کے قریب کھڑا ہو گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ ”کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟“

وہ خاموش کھڑا رہا، پھر یونہی کمرے کے کونے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے لبوں سے مبہم سی آواز نکلی۔

”جی ہاں۔“

”میں... میں...“ اس نے اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی۔ ”مجھے...“

وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ”رگھوناتھ جی آپ کرسی پر تشریف رکھیے۔ کوئی حرج نہیں، تشریف رکھیے۔“

وہ بیٹھ گیا۔ مجھے منتظر پا کر وہ آہستہ سے بولا ”میں بہت شرمسار ہوں۔“

میں کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ ”رگھوناتھ جی! آج تو آپ نے تکلف کی حد کر دی... کہیے۔“

انگلی سے فرش بجاتے ہوئے وہ بڑی جرأت سے کام لے کر بولا ”مجھے ایک روپیہ درکار ہے...“

”ایک روپیہ؟“ میں نے حیرت سے نسبتاً بلند آواز میں پوچھا۔

اس نے پھر میری طرف اچٹتی نظر سے دیکھا۔ شاید وہ میرے چہرے پر اپنی بات کا ردعمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔

اس نے دھیمی آواز میں کہا ”شاید آپ کو یاد ہو۔ آپ نے مجھ سے ایک روپیہ لیا تھا۔ یہ تین سوا تین مہینے پہلے کی بات ہے...“

”ایک روپیہ؟... وہ کب؟“ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ میرے چہرے پر غور و خوض کے آثار دیکھ کر اس نے پھر کہا ”اس دن بینک کا چپراسی آیا تھا۔ آپ کے پاس دس سے کم کا نوٹ نہیں تھا۔ آپ نے پھر مجھ سے ایک روپیہ لیا تھا۔ یہ بھی ہدایت کی تھی کہ اگر آپ کو یاد نہ رہے تو میں آپ کو یاد دلا کر روپیہ واپس لے لوں۔“ وہ پھیکی ہنسی ہنسا۔ ”اور میں نے جواب میں کہا تھا کہ ایک روپیہ بھی کوئی بڑی رقم تھی جو میں یاد دلاتا پھروں... سچ پوچھیے تو میں بھول چکا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں، میرا حافظہ کمزور ہو چکا... لیکن کل شام مجھے نہ معلوم کس طرح یہ بات یاد آ گئی۔ مجھے امید ہے آپ بھولے نہیں ہوں گے۔“

مجھے یاد آ گیا۔ رگھوناتھ پر مجھے بے اعتمادی نہیں تھی۔ افسوس اس امر کا تھا کہ میں روپیہ واپس کرنا بھول گیا، اور روپیہ... لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے واپس کر دیا تھا۔ اسی دن شام کو یقیناً میں نے واپس کر دیا تھا۔

رگھوناتھ اس جرأت کے لیے معذرت کرتا رہا۔ میں نے چپکے سے اپنی نوٹ بک نکالی۔ لکھا تھا، اکتوبر کی سات تاریخ کو رگھوناتھ سے ایک روپیہ لیا گیا۔ میں نے یادداشت کے لیے نوٹ بک پر لکھ لیا تھا۔ اسی شام کو روپیہ واپس کرنے کے بعد میں نے اس کے آگے اندراج میں نوٹ لکھ دیا۔

میں اسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں ایسا غیر ذمے دار اور بے اصول شخص نہیں کہ اس کا روپیہ لے کر بھول جاتا۔ ”رگھوناتھ جی! میں نے وہ روپیہ...“

”میں پھر دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں۔ باور فرمائیے، شرم کے مارے میری نظر نہیں اٹھتی... ضرورت ہی کچھ ایسی آن پڑی ورنہ میں ایک روپیہ کے لیے تقاضا نہ کرتا۔“

میں خاموش ہو گیا۔ رگھوناتھ پانی پانی ہوا جاتا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

بارگاہِ ایزدی میں مناجات

تیرے در پہ جب کوئی بھولا بھٹکا بندہ آتا ہے
فضل و کرم تیرا ہی اس کو سیدھی راہ دکھلاتا ہے

خالق کا مخلوق سے اپنی رشتہ بڑا پرانا ہے
پالن ہار ہے خلقت کا وہ سارے جگ کا داتا ہے

تجھ کو اپنے دل کا سارا حال سناتے رہتے ہیں
تیرے وہ بندے کہ جن کا تجھ سے سچا ناتا ہے

غم کے اندھیاروں کے اندر رستہ جب کھو جاتا ہے
بھولے بھٹکے راہی کو پھر منزل تو دکھلاتا ہے

دنیا کے آلام کے ہاتھوں جو کوئی ہمت ہار گیا
لطف و کرم تیرا ہی مولا اس کی آس بندھاتا ہے

لے لیتی ہے رحمت تیری اس کو اپنے ہاتھوں میں
جو کوئی تیری یاد میں چپکے چپکے نیر بہاتا ہے

جل تھل کر دیتی ہے تیری رحمت دنیا والوں کو
نیلی چھت کی چھتری سے جب اپنا مینہ برساتا ہے

یوں تو تیری قربت سے محروم کوئی انسان نہیں
ڈھونڈنے والا سچے دل سے تجھ کو آخر پاتا ہے

خادم بھی رہتا ہے ہر دم طالب تیری بخشش کا
ورنہ بے حد وزنی اس کی بدعملی کا کھاتا ہے

(خادم بلا غوری، اسلام آباد)

اس کی نظریں فرش پر گڑی ہوئی تھیں جیسے وہ مارے ندامت کے زمین میں سما جانا چاہتا ہو۔

"نہیں نہیں رکھو تم جی، معمولی بات ہے۔" یہ کہہ کر میں مسکرایا اور کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گیا۔ "شرمندہ تو میں ہوں۔ معافی کا طلب گار تو مجھے ہونا چاہیے۔"

شکر گزاری کے آنسو اس کی آنکھوں میں چھلکنے لگے۔ "آپ سے کیا چھپانا، کل سے روٹی نہیں پکی۔ آٹا ختم ہے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی میری عادت نہیں۔ بس یہی تھی اصل بات، ورنہ ایک روپیہ کی حیثیت کیا، میں ہرگز آپ کو اس کی یاد نہ دلاتا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ کو کتنے روپوں کی ضرورت ہے؟ میرا مطلب ہے تنخواہ ملنے پر واپس دے دیجیے گا۔"

اس کے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے۔ "میں نے آپ کو گھر کی حالت اس لیے بتائی کہ آپ ایک روپیہ کے لیے تقاضا کرنے پر مجھے اوچھا اور ہیچ نہ سمجھ لیں۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جو میں عمر بھر نہیں بھلا سکتا۔ "میں ایک با اصول اور عزت دار شخص ہوں۔ اگرچہ یہ گستاخی ہے کہ آپ مجھ پر عنایت فرمانا چاہیں اور میں انکار کروں۔ لیکن میں نے آج تک کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا نہ ایک کوڑی کا قرضہ ادھار منظور کیا۔ اس لیے آخری عمر میں بھی اپنے اصول سے گرنا نہیں چاہتا۔"

میں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اٹھا کر اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ وہ پھر پیشانی سے پسینا پونچھتا ہوا لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل گیا۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

سائنس و ٹیکنالوجی کی مدد سے

انسان ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے؟

ان نرالے انسانوں کی تحیر خیز کہانی جو سائنسی تجربوں کے سہارے لافانی حیات کا خزانہ پانے نکلے ہیں

سید عاصم محمود

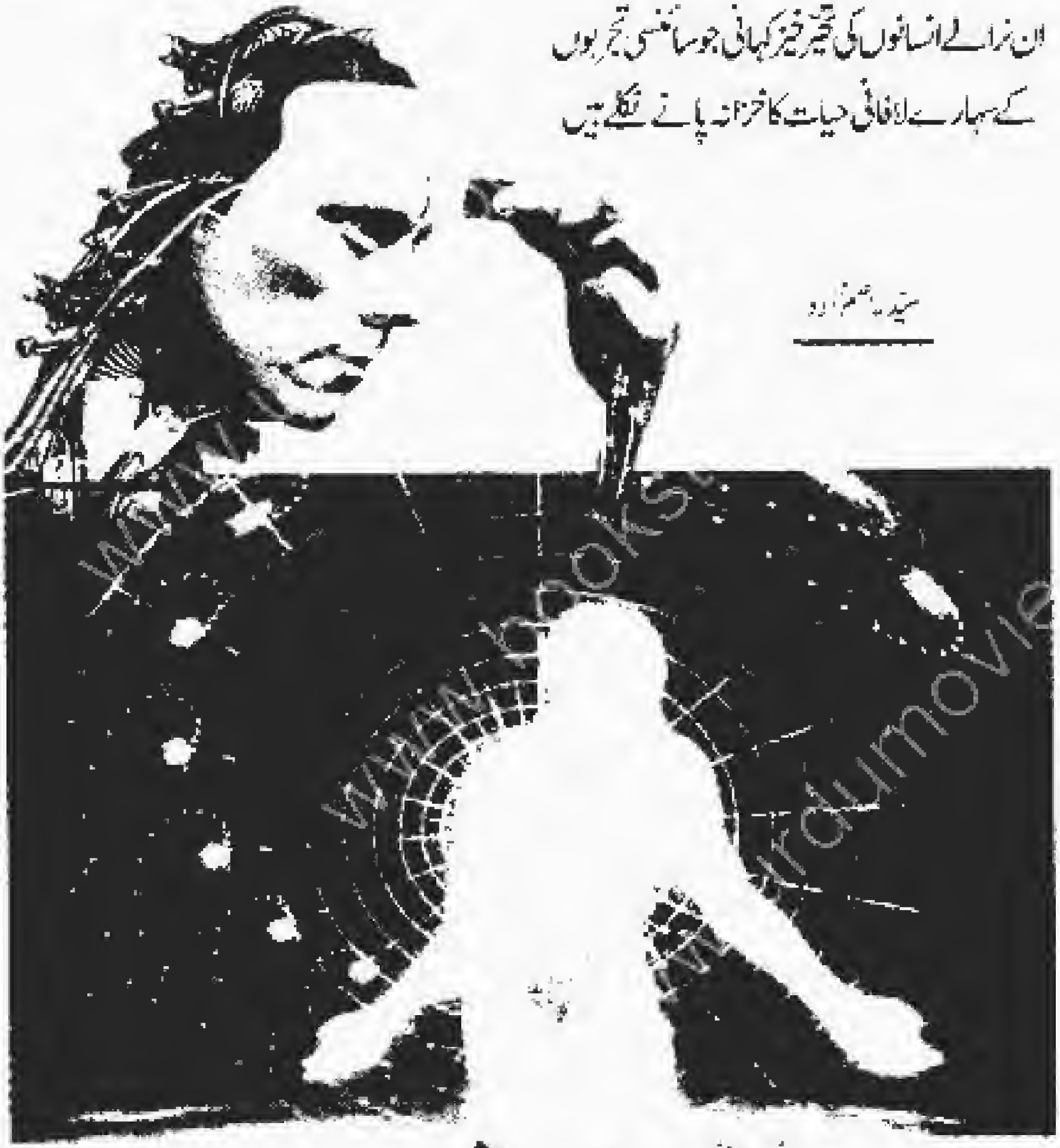

روایت ہے، یونانی سپہ سالار اسکندر اعظم ہمیشہ کی زندگی پانا چاہتا تھا۔ چناں چہ وہ ''آب حیات'' کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، یعنی ایسا پانی جسے پی کر وہ ہمیشہ کی زندگی پا سکے۔ دوران سفر اسے حضرت خضرؑ مل گئے۔ لہٰذا وہ اکٹھے سفر

www.pdfbooksfree.pk

کرنے لگے۔ چلتے چلتے وہ بحر ظلمات پہنچے جہاں سورج کی روشنی کا کوئی گزر نہ تھا۔

سکندر اعظم تو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگا، لیکن حضرت خضرؑ اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائی کے باعث آب حیات تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ انھوں نے پھر آب حیات نوش کیا اور ہمیشہ کی زندگی پائی۔ گویا اب حضرت خضرؑ تاقیامت زندہ رہیں گے۔

یہ تو صدیوں پرانی روایت تھی۔ مگر دور جدید کا انسان بذریعہ سائنس ہمیشہ کی زندگی پالینے کے لیے بھرپور جدوجہد کر رہا ہے۔ بعض سائنس دانوں کی کوشش ہے کہ وہ ایسی کمپیوٹرائز مشینیں ایجاد کر لیں جس میں انسانی روح سما سکے۔ دیگر ماہرین طب ایسی ادویہ بنانا چاہتے ہیں جو انسان کی عمر زیادہ سے زیادہ بڑھا سکیں۔ اس جدوجہد میں اب محققوں کو نامی گرامی اور امیر شخصیات کی مدد حاصل ہو رہی ہے۔

بڑھاپا ختم کرنے والی ادویہ کی تیاری جاری ہے

مثال کے طور پر امریکی کمپنی، پے پال (Pay pal) کے شریک بانی، کھرب پتی پیٹر تھیل کو لیجیے۔ وہ کم از کم ۱۲۰ سال تک زندہ رہنا چاہتا ہے۔ مگر دیگر سب پتی افراد کے مقابلے میں اس کی تمنا تو کچھ بھی نہیں۔ روسی ارب پتی کا ''گلوبل ۲۰۴۵'' دمتری اتسکوف ایک ہزار سال تک زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے۔ مشہور امریکی سافٹ ویئر کمپنی اوریکل کے شریک بانی، لیری ایلیسن کو یقین ہے کہ مستقبل میں انسان لافانی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ گوگل کا شریک بانی، سرگئی برن بھی ''موت سے دو دو ہاتھ'' کرنے کی آرزو رکھتا ہے۔

دنیا کی امیر ترین ہستیوں میں شامل یہ شخصیات مذاق نہیں کر رہیں اور نہ ہی ان کی باتیں مضحکہ خیز ہیں۔ وجہ یہی کہ کئی ماہرین طب ایسی تحقیقات میں محو ہیں جو مستقبل میں زندگی اور موت کے معنی ہی بدل ڈالیں گی۔

لافانی حیات کی تلاش

ہزارہا سال قبل جب باشعور انسان کا ارتقا ہوا اور وہ عقل و تدبر پا کر آدمی بنا، تو اس کے سامنے ایک اہم مسئلہ یہ بھی تھا: ہمیشہ کی زندگی کیونکر پائی جائے۔ وہ کون سا طریقہ ہے کہ انسانوں کو موت نہ آئے اور انھیں لافانی حیات مل جائے۔

تاریخ افشا کرتی ہے کہ مختلف چینی ریاستیں فتح کر کے مملکت چین کی بنیاد رکھنے والا پہلا بادشاہ، قن شی ہوانگ بھی ہمیشہ کی زندگی چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے حکیموں و وزیروں کو ''آب حیات'' ڈھونڈنے کا حکم دیا۔

اس زمانے میں پارہ (Mercury) دریافت ہوا، تو اسے جادوئی مادہ سمجھا گیا۔ چنانچہ حکیموں نے پارے سے گولیاں بنائیں اور چینی بادشاہ کو یہ کہہ کر کھلا دیں کہ ان کے ذریعے وہ لافانی انسان بن جائے گا۔ مگر ۲۱۰ قبل مسیح کو قن شی صرف پچاس سال کی عمر میں عالم بالا جا پہنچا۔ یوں وہ لافانی حیات پانے کی تمنا کا پہلا مشہور شکار بنا۔

www.pdfbooksfree.pk

رفتہ رفتہ انسان ترقی کے مدارج طے کرنے لگا، مگر ہمیشہ کی زندگی پانے کا خیال اس کے دامن سے وابستہ رہا۔ کیتھولک عیسائیوں کا ۲۱۳ واں پوپ، انوسینٹ ہشتم بھی لافانی حیات کا طلبگار تھا۔ اس نے ایک یہودی ڈاکٹر، گیاکوموزی سان سے مشورہ کیا۔

ڈاکٹر گیاکومو نے اسے مشورہ دیا کہ وہ تین نو دس سالہ لڑکوں کا خون پیے۔ یوں ان لڑکوں کی جوانی اس میں منتقل ہو جائے گی۔ وہ جوان تو کیا ہوتا، انسانی خون نے اس کے جسم میں زہریلے اثرات پیدا کر ڈالے۔ چناں چہ ۲۵/ جولائی ۱۴۹۲ء کو وہ چل بسا۔

۱۸۶۸ء میں امریکا میں حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ ریاست کنٹکی کے ایک سیاست داں، لیونارڈ جونز نے امریکی صدارتی انتخابات میں حصہ لیا۔ جونز نے انتخابی مہم اس نکتے پر چلائی کہ وہ عبادت کرنے اور بھوکا رہ کر ہمیشہ کی زندگی پا چکا۔ اگر امریکی عوام نے اسے صدر منتخب کیا، تو وہ لافانی حیات پانے کے گر انھیں بھی بتا دے گا۔ افسوس کہ امریکیوں نے اسے منتخب نہیں کیا اور اگلے ہی سال بیچارا نمونیے سے چل بسا۔

چوہوں کے تجربے سے جادوئی پروٹین جی ڈی ایف دریافت ہوا

ان لرزہ خیز تاریخی حقائق کے باوجود دورِ جدید کے بعض کھرب پتی ہمیشہ کی زندگی پا کر ہر قیمت پر اپنے خوابوں کی تکمیل چاہتے ہیں۔ اسی لیے پیٹر تھیل نے حال ہی میں ایک غیر منافع بخش تحقیقی ادارے، میتھوسلا (Methuselah) فاؤنڈیشن کو ۳۵ کروڑ روپے (۳۵ لاکھ ڈالر) کی خطیر رقم عطیہ کی۔ اس امریکی ادارے سے منسلک سائنس داں ایسی ادویہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جو بڑھاپا پیدا کرنے والی سات جسمانی وجوہ کا خاتمہ کر سکیں۔ یہ وجوہ درج ذیل ہیں:

خلیوں کی کمی، خلیوں کا حد سے زیادہ تقسیم ہونا (Excessive Cell division)، خلیوں کا بے وقت مر جانا، خلیوں میں کوڑا کرکٹ بھرنا، خلیوں کے باہر فضلہ جمع ہونا، مائٹو کونڈریا (Mitochondria) یعنی خلیے کے بجلی گھر میں تبدیلیاں اور خلیوں کے سالمات (Molecules) میں بڑھتا تال میل۔

میتھوسلا فاؤنڈیشن کے محققوں اور دیگر ماہرینِ طب کا خیال ہے کہ انسانی جسم ایک مشین کی طرح ہے۔ لہٰذا وہ ایک ڈھانچا رکھتا ہے تاکہ روزمرہ کے تمام فعل بخوبی انجام دے سکے۔ جب اس ڈھانچے کے کل پرزے استعمال سے ناکارہ ہو جائیں، تو وہ بکھر جاتا ہے۔ گویا موت انسان کو آن دبوچتی ہے۔ لیکن ادویہ کی مدد سے خلوی و سالماتی سطح پر اس ڈھانچے کی مرمت کر دی جائے، تو وہ پھر صحیح طرح کام کرنے لگے گا۔ گویا انسان کو نئی زندگی مل جائے گی۔

لیکن سرگئی برن کے کالیکو (Calico) کمپنی منصوبے کے سامنے میتھوسلا فاؤنڈیشن کی تحقیق معمولی دکھائی دیتی ہے۔ یہ کمپنی ادویہ ساز امریکی ادارے، ایب وائی (Abbvie) کے تعاون سے "بڑھاپا روک دوا"

www.pdfbooksfree.pk

بنا چکی ہے۔ اور مرکی مذکورہ منصوبے پر آٹھ ارب روپے (اسی ملین ڈالر) خرچ کرنے کو تیار ہے۔

گوگل کے مالکان اپنے منصوبے بہت خفیہ رکھتے ہیں۔ تاہم امریکی میڈیا میں چھپنے والی خبروں سے پتا چلا ہے کہ کالیکو کے سائنس دان فوکس او تھری (FoxO3) نامی جین جیسا اثر رکھنے والی دوا ایجاد کرنا چاہتے ہیں۔ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ جن انسانوں میں درج بالا جین ہوتا ہے وہ سو برس تک جیتے ہیں۔ گویا فوکس او تھری کا اثر رکھنے والی دوا سے ہر انسان اپنی عمر بڑھا سکے گا۔

امریکا اور یورپ میں کئی ادارے انسان کو لافانی بنانے والے منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں امریکی ادارے "ایلیسن فاؤنڈیشن فار میڈیکل ریسرچ" کو نمایاں اداروں میں ممتاز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۹۷ء میں امریکی سرمایہ دار لیری ایلیسن نے قائم کیا تھا۔

۲۰۱۳ء سے ایلیسن فاؤنڈیشن ہر سال ان محققوں میں بذریعہ "ایلیسن ایوارڈ" سالانہ لاکھوں ڈالر تقسیم کرتی ہے جو بڑھاپا روکنے والی ادویہ پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ مزید ادارہ ایک اور ادارے، ایلیسن میڈیکل فاؤنڈیشن سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ دونوں ادارے ان سائنس دانوں کو بھی لاکھوں کی امداد دیتے ہیں جو موت کو شکست دینے والی ادویہ تیار کرنے کے خواہاں ہیں۔

ایک انوکھا تجربہ

۱۹۵۶ء میں ایک امریکی سائنس دان، کلائیو میکے نے کارنیل یونیورسٹی کی لیبارٹری میں خاص قسم کا تجربہ کیا۔ اس نے دو چوہے لیے اور انھیں بذریعہ آپریشن پہلو کی جانب سے باہم سی دیا۔ وہ جڑواں بن گئے۔ یوں ان دونوں چوہوں میں خون کا نظام مشترک ہو جاتا تھا۔

اس تجربے کی خاصیت یہ تھی کہ ایک چوہا تو نوجوان، چونچال اور چست و چالاک تھا۔ جبکہ دوسرا بوڑھا ہو چکا تھا اور مرنے کے قریب تھا۔ لیکن جب ان دونوں کا دوران خون مشترک ہوا، بوڑھے چوہے میں حیرت انگیز تبدیلیاں آنے لگیں۔ حال یہ تھا کہ جسم دوبارہ ہو گیا اور وہ نوجوان دکھائی دینے لگا۔ دوسری طرف نوجوان چوہے پر بڑھاپا چھا گیا۔

تجربی ڈش پر ... بننے والا انسانی کان

۱۹۵۶ء میں سائنس دان خون کی کیمیائی ہیئت کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ کلائیو میکے کا تجربہ حیرت افزا تھا مگر وہ نہیں جان سکا کہ بوڑھا چوہا کیونکر جوان ہوا۔ اس لیے مکی نے حراروں (کیلوریز) کی تحقیق پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ اسی تحقیق سے دریافت ہوا کہ جاندار کم حرارے کھائے تو اس کی عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ تاہم خون کا تجربہ بھلا دیا گیا۔

ادھر کئی سال بعد ۲۰۰۲ء میں ہارورڈ یونیورسٹی کی ایک محقق، ایمی ویجرز نے کلائیو میکے کے تجربے کی بابت پڑھا۔ ایمی بھی بڑھاپا روک ٹیکنالوجی پر تحقیق کر رہی تھی۔ اس

www.pdfbooksfree.pk

نے فیصلہ کیا۔ وہ بھی متوازی تحقیق کا تجربہ دہرا کر دیکھیں کہ کیا نتیجہ پھر وہی نکلتا ہے۔

ایمی ویگرز نے بھی نوجوان اور بوڑھے چوہوں کو پہلو سے سی دیا۔ یوں ان کا بھی دوران خون یکساں ہو گیا۔ اس تجربے کے ذریعے بھی بوڑھا چوہا چند ہی دنوں میں نوجوان بن گیا، جبکہ نوجوان چوہے پہ بڑھاپا چھانے لگا۔ ایمی نے چوہوں کے خون پر تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ جان سکے، کیا شے بوڑھے چوہے کو نوجوانی کا تحفہ عطا کرتی ہے۔

مختلف چوہوں پر تجربات کرنے کے بعد آخر ایمی نے ان کے خون میں "جی ڈی ایف ۱۱" (GDF-11) نامی پروٹین دریافت کیا۔ یہی پروٹین بوڑھے چوہے کو جوان بنا ڈالتا تھا۔ مزید تحقیق نے انکشاف کیا کہ یہ پروٹین بنیادی (Stem) خلیوں کو متحرک کرتا ہے۔

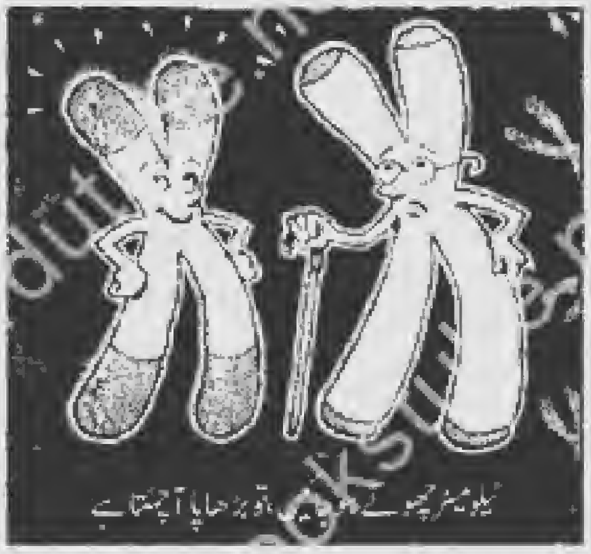

دنیا کے ہر جاندار میں بنیادی خلیے ہی بافتوں (ٹشوز) کی مرمت کرتے ہیں۔ ایمی کو تحقیق سے پتا چلا کہ رفتہ رفتہ جاندار پر بڑھاپا چھائے، تو اس چوہے میں جی ڈی ایف ۱۱ کی مقدار گھٹتی جاتی ہے۔ تب بنیادی خلیے بھی عمر رسیدہ ہو کر اپنا کام درست طریقے سے انجام نہیں دے پاتے۔ یوں بافتوں کی ٹوٹ پھوٹ اور مرمت نہ ہونے کے باعث جاندار میں بڑھاپے کا آغاز ہو جاتا ہے۔

ایمی ویگرز نے تحقیق جاری رکھی اور نت نئے انکشافات سامنے آتے گئے۔ معلوم ہوا کہ انسانی خون میں بھی جی ڈی ایف ۱۱ پروٹین ایک جین کی صورت پایا جاتا ہے۔ اور یہ کہ ایک بچہ یا انسان چاہے کتنا ہی بوڑھا ہو جائے، اس میں بنیادی خلیے موجود رہتے ہیں۔ گو جی ڈی ایف ۱۱ کی مقدار کم ہونے کے باعث وہ تقریباً بے اثر ہو جاتے ہیں۔

لیکن نوجوان خون جی ڈی ایف ۱۱ کی بھاری مقدار رکھتا ہے۔ اسی لیے جب بوڑھے چوہوں کو نوجوان خون ملا، تو جی ڈی ایف ۱۱ کی بھاری مقدار پا کر ان کے بنیادی خلیے دوبارہ متحرک ہو گئے۔ وہ پھر بافتوں کی مرمت کرنے لگے اور انھیں دوبارہ "جوان" بنا دیا۔ جب اعضا کی بافتیں جوان ہو گئیں، تو چوہوں میں خود بخود شباب عود کر آیا اور وہ بڑھاپے کے دور سے نکل آئے۔ جی ڈی ایف ۱۱ کے کرشماتی کردار پر مزید تحقیق جاری ہے۔

۲۰۰۵ء میں امریکا کا مشہور سائنس دان، ڈاکٹر رونالڈ ڈی پنہو بھی بوڑھے چوہوں پہ تجربات کرنے لگا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کن طریقوں سے ان کا بڑھاپا روکنا ممکن ہے۔ ڈاکٹر رونالڈ کی دلچسپی کا مرکز ٹیلو میئر (Telomere) تھے۔ یہ ہر ڈی این اے کے اختتامی سرے ہیں، جیسے تسمے کے سروں پر پلاسٹک باندھ کر انھیں بند کر دیا جاتا ہے۔

انسانوں اور جانوروں کے جسم میں ایک خامرہ (Enzyme)، ٹیلومیریز (Telomerase) ٹیلومیروں کو صحت مند اور پائیدار رکھتا ہے۔ یوں ہر ڈی این اے انسانی بدن میں بخوبی اپنی ذمے داریاں انجام دیتا

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ لیکن بوڑھا ہونے پر جسم میں ٹیلومیری کی مقدار گھٹ جاتی ہے۔ تب ٹیلومیرز بھی چھوٹے ہونے لگتے ہیں اور یوں ڈی این اے اپنا کام صحیح طرح نہیں کر پاتے۔ اسی خرابی سے بڑھاپے کی ظاہری خصوصیات جنم لیتی ہیں اور ڈاکٹر رونالڈ ڈی پنہو اس کی وجہ جاننا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر رونالڈ نے اپنی ٹیم کے ساتھ جینیاتی طور پر ایک چوہیا پیدا کی جس میں ٹیلومیری خامروں کو حسب منشا بے حس یا سرگرم کرنا ممکن تھا۔ جب چوہیا نوجوان ہوئی، تو ایک دن ڈاکٹر رونالڈ نے اس کے بدن میں موجود سبھی ٹیلومیری خامروں کو بے حرکت کر دیا۔

جب ٹیلومیریوں کو اپنی خوراک نہیں ملی، تو وہ ناکارہ ہونے لگے۔ ان کی خرابی نے دیکھتے ہی دیکھتے چوہیا کو نوجوانی ہی میں بوڑھا کر دیا۔ اس کے بال جھڑ گئے، کھال لٹک گئی، دماغ سوکھ گیا اور ہڈیاں کمزور ہو گئیں۔ غرض وہ گور کنارے جا پہنچی۔

جب چوہیا مرنے کے قریب تھی، تو ڈاکٹر رونالڈ نے اس کے ٹیلومیری خامروں کو دوبارہ سرگرم کر دیا۔ بعدازاں جو کرشمہ ظہور پذیر ہوا، اس نے سبھی کو ششدر کر ڈالا۔ چوہیا کے مرجھائے اعضا پھر تندرست و توانا ہونے لگے۔ دماغ کی جسامت بڑھ گئی۔ بال بڑھے اور چمک دار ہو گئے۔ غرض بڑھاپے کی تمام نشانیاں دور ہو گئیں۔ گویا جانور کے جسم میں ٹیلومیری خامروں نے آب حیات جیسا کام کر دکھایا۔

سائنس داں اب جی ڈی ایف ۱۱ اور ٹیلومیری، دونوں پر مزید تحقیق کر رہے ہیں۔ وہ اب انسانوں پر تجربات کر کے ان کے کمالات دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ یہ دونوں انسان کی عمر میں خاطر خواہ اضافہ کر دیں گے اور مستقبل کا انسان بیمار ہوئے بغیر طویل عرصہ زندہ رہ سکے گا۔

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسانوں میں غیر فطری طور پر جی ڈی ایف ۱۱ اور ٹیلومیری کی مقدار بڑھانے کی سعی ہوئی، تو وہ غیر معمولی امراض میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ تاہم ڈاکٹر رونالڈ اور دیگر ماہرین طب نے ان خدشات کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔

دیمتری اِتسکوف اپنے [illegible] کے ساتھ

قابل ذکر بات یہ ہے کہ کامیاب تجربات نے ثابت کر دیا، سائنسی طور پر انسان کی عمر بڑھانا ممکن ہے۔ یہ اضافہ دو تین عشروں سے لے کر چند صدیوں تک محیط ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ماہرین طب کے جوش و جذبے میں اضافہ کر چکی۔ دوسری طرف طویل عمر کا خیال فلسفیوں کو دنگ کر دیتا ہے۔ ایک برطانوی فلسفی، مائیکل اسمتھ کا کہنا ہے:

"اگر انسان ۸۰ یا ۹۰ سال کے بجائے ۴۰۰ سو برس تک زندہ رہنے لگا، تو زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب آ جائے گا۔ تب ہمیں زندگی سے لے کر موت تک..... ہر شے کی نئے سرے سے تعریف کرنا ہو گی۔"

ایک تصور یہ ہے کہ اگر سائنس دانوں نے انسان کو دوبارہ نوجوان بنانے کا طبی طریقہ دریافت کر لیا، تو پھر کیا ہو گا؟ تب ہر انسان جیسے ہی بڑھاپے کی سرحد پر پہنچا، وہ

www.pdfbooksfree.pk

بھی نہ بیٹھے گی جس سے دوبارہ وہ جوان ہو جائے گا۔ گویا اسے ایک طرح سے ہمیشہ زندہ رہنے کا لائسنس مل سکتا ہے۔ تب ہی تو کہا جاتا ہے کہ یہ دماغی شریان پھٹنے ہی سے وہ بہ مشکل موت کے منہ میں پہنچے گا۔

آج بعض لوگ یہ تمنا رکھتے ہیں کہ اپنے جسم میں قوت اور چستی دونوں قسم کے بڑھ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر جب کوئی کا قتل ہو تو پتا چلے گا کہ انسانی جسم میں ... اب ہر کوئی نہ صرف معاشرے میں بیمار اور بوڑھے نظر نہیں آئیں گے۔ شادیاں بھی سو سال میں ہوں گی۔ غرض انسانی عمر میں اضافے کی قیمت بھی معاشرے کو چکانی پڑے گی۔

ایسے اور ترقی کی وجہ سے مستقبل میں انسان کو پھر بھی نہیں رہے گی کہ اس کا خراب دل، گردے یا جگر اسے قبر میں دھکیل دے گا۔ وجہ یہ ہے کہ ایک طرف لیبارٹریوں میں نامیاتی مادوں کے ذریعے انسانی اعضا "اگائے" جا رہے ہیں، تو دوسری سمت تھری ڈی پرنٹر میں جگر اور گردے تیار ہونے لگے ہیں۔ ماہرین کا تیسرا گروہ بنیادی خلیوں سے انسانی اعضا تیار کرنے میں لگا ہے۔ غرض مستقبل قریب میں فاضل اعضا کی اتنی کثرت ہو گی کہ جس کسی کا عضو خراب ہوا، وہ بازار سے نیا خرید لے گا۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ موت کو دور رکھنے کے لیے مستقبل کے انسان کو بہت پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ کبھی وہ اپنا جگر بدلوائے گا، تو کبھی گردہ! پھر اس پر یہ خطرہ بھی منڈلاتا رہے گا کہ اگر دماغ چل بسا، تو وہ جوان ہوتے ہوئے بھی ... سو سالہ دل جواب دے گیا تو قصہ تمام!

روسی ارب پتی دیمتری اتسکوف سائنس دان جسم کا جھنجھٹ ہی ختم کرنا چاہتے ہیں تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ یعنی جسمانی جھمیلے سے وابستہ ساری

غزل

تیری باتیں تیرے دن رات تو کچھ اور کہتے ہیں
میرے ہمدم ترے حالات تو کچھ اور کہتے ہیں

ہمارے ساتھ رہنے کی تیری حسرت بجا لیکن
تیرے یہ خوبصورت ہاتھ تو کچھ اور کہتے ہیں

میں کیوں اخبار کی خبروں کو اب سچ مان لوں صاحب
میرے شہروں کے سب حالات تو کچھ اور کہتے ہیں

میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اب بات کر ظالم
تیرے ٹھہرے ہوئے لمحات تو کچھ اور کہتے ہیں

جو دن میں فاش کرتا ہے یہ روز شیخ صاحب کا
مگر پھر رات کو وہ بات تو کچھ اور کہتے ہیں

تیرے وعدوں کو میں اب کس طرح سچ مان لوں جاناں!
تیری باتیں، تیرے جذبات تو کچھ اور کہتے ہیں

بظاہر خوش نظر آتے ہیں یہ سب لوگ جو حسنین
مگر کچھ غم زدہ لمحات تو کچھ اور کہتے ہیں

(حسنین اقبال منہاس، سبی، بلوچستان)

پریشانیاں ہی ختم ہو جائیں گی۔ اس ضمن میں سب سے اہم منصوبہ "۲۰۴۵ انیشیٹو" (2045 Initiative) ہے جسے ایک روسی ارب پتی، دیمتری اتسکوف کی مالی مدد حاصل ہے۔

۲۰۴۵ انیشیٹو کی بنیاد چار سال قبل رکھی گئی اور اس منصوبے سے ماہرین کی متاثر کن تعداد منسلک ہو چکی۔ یہ ماہرین روبوٹکس اور دیگر جدید ترین سائنسی شعبوں سے

www.pdfbooksfree.pk

تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی منزل یہ ہے کہ 2045ء تک انسانی دماغ کو گوشت پوست والے ڈھانچے سے نکال کر روبوٹ یا ہولوگرافک پیکر میں منتقل کر دیا جائے۔

درج بالا منصوبہ بظاہر کسی دیوانے کی بڑ لگتی ہے، مگر یہ اتنی بھی مضحکہ خیز نہیں۔ منصوبے کے پہلے مرحلے میں ماہرین ”مشینی انسانی ڈھانچہ“ (Artificial humanoid body) بنانا چاہتے ہیں جسے ”اوتار“ کہا جائے گا۔ ساتھ ہی ”ایڈوانسڈ برین کمپیوٹر انٹرفیس سسٹم“ بھی ایجاد کیا جائے گا۔ مدعا یہ ہے کہ انسانی دماغ اس انسانی ڈھانچے میں نصب ہو کر اس سے روزمرہ کے سارے کام کرا سکے۔

منصوبے کے دوسرے مرحلے میں ماہرین مصنوعی دماغ بنانا چاہتے ہیں۔ اس میں انسان کا شعور منتقل ہو گا۔ یوں مصنوعی دماغ کی ایجاد کے بعد انسان حقیقی طور پر ہمیشہ زندہ رہ سکے گا۔ اور یہ حیرت انگیز منزل زیادہ دور نہیں لگتی۔

دنیائے کمپیوٹر کی ٹیکنالوجی امریکی کمپنی انٹل 2018ء تک ”ایگزاسکیل“ (Exascale) کمپیوٹر تیار کرنا چاہتی ہے۔ ایسی کمپیوٹر مشین جو انسانی دماغ جتنی رفتار سے کام کر سکے گی۔ یاد رہے، ہمارا دماغ ”فی سیکنڈ دو کروڑ ارب کیلکولیشنز“ کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے، اتنی زیادہ کیلکولیشن کرنے کے لیے انتہائی ترقی یافتہ جدید ترین کمپیوٹر تخلیق کرنا پڑے گا۔

ایک اہم سوال

سائنس کی بے پناہ ترقی دیکھتے ہوئے یقینی لگتا ہے کہ پچاس، سو، دو سو سال بعد انسان کسی نہ کسی ذریعے سے زندہ جاوید صورت اختیار کر لے۔ تاہم یہ پریشان کن سوال اپنی جگہ رہے گا: ”کیا ہم واقعی لافانی ہونا چاہتے ہیں؟ اگر ہاں تو کیوں؟“

اس سوال کا جواب مشہور فلسفی چھوئی یوں دیتا ہے: ”میں جوا کھیلتا، ویڈیو گیمیں کھیلتا، نت نئے بازی آزماتا اور یوں اس سے دل بہلاتا ہوں۔ لیکن میں ہر مشغلہ آزمانا چاہتا ہوں۔ اسی لیے مجھے کم از کم دس ہزار سال کی زندگی درکار ہے۔ یوں میں اپنی ساری آرزوئیں اور تمنائیں پوری کر سکوں گا۔“

جیمی الیگزینڈر کا نقطہ نظر جدا ہے۔ وہ بڑھاپے سے وابستہ اذیت دہ بیماریوں سے خوف کھاتا ہے جو بالآخر موت پر منتج ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے: ”میری ماں سرطان کے باعث چل بسی تھی۔ میں نے رفتہ رفتہ ان کا جسم گھلتے اور موت کی طرف بڑھتے دیکھا۔ یہ ایک ہولناک تجربہ تھا جس سے میں دوبارہ نہیں گزرنا چاہتا۔“

اخلاقیات اور مذاہب کے ماہرین سائنس دانوں کی کوششوں کو مختلف نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے، جدید انسان اس لیے اپنی عمر بڑھانا چاہتا ہے تاکہ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے لیے اسے مزید وقت مل جائے۔ حالانکہ انسان کو جتنی بھی عمر ملے، اس کا مقصد زندگی یہ ہونا چاہیے کہ وہ اسے پاکیزگی اور نیکیوں میں گزارے۔

انسان نے عمر خضر پالی، تو مستقبل کے انسانوں کو ایک اور مسئلے سے پالا پڑے گا۔ وہ یہ کہ جب کسی کو موت نہیں آئی، تو کرہ ارض پر اربوں انسان آباد ہو جائیں گے۔ تب ان کی خوراک، رہائش، لباس وغیرہ کا بندوبست کیسے ہو گا؟ کیا ارضی وسائل ان اربوں انسانوں کی ضروریات پوری کر سکیں گے؟ یہ شاید تب انسان کے لیے سب سے اہم سوال بن جائے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

ایک انمول واقعے نے جنم دیا

من کا بوجھ

اپنی مدد آپ کے سنہرے اصول کی
سچائی عیاں کرتی چشم کشا داستان

جاوید بسام

انسان کا ذہن بسا اوقات نمایاں اور انوکھی باتیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن بعض وقت چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں کا اثر اس طرح ہوتا ہے کہ بے سکون آ جاتی ہے۔ اس دن میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ رات آٹھ بجے میں کام سے واپس آ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں کچھ سامان بھی تھا۔

ایک گلی سے گزرتے ہوئے میں نے دو نوجوانوں کو دیکھا۔ وہ ایک گھر سے بڑی بڑی پلاسٹک بوتلوں میں پانی بھر کر چھوٹا گاڑی میں رکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک لڑکا بولا "انکل ایک بوتل ذرا گاڑی میں رکھ دیں۔"

کسی کے کام آ کر جو خوشی ملتی ہے، اس کا الگ ہی مزا ہے۔ میں نے فوراً بوتل اٹھا کر گاڑی میں رکھ دی۔

لڑکا بولا "ایک اور سر!"

میں نے دوسری بوتل بھی اٹھالی۔ میرا خیال تھا اب وہ مزید اٹھانے کا نہیں کہیں گے لیکن وہ بولا "ایک بوتل اور رکھ دیں۔"

میری کمر میں درد ہونے لگا تھا۔ میں نے جھنجھلا کر کہا "بھئی یار سب مجھ سے ہی اٹھواؤ گے؟"

"اچھا رہنے دیں۔" وہ بولا۔

میں آگے بڑھا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں منہ چھپا کر ہنس رہے ہیں۔ میں نے اس حرکت کی کوئی خاص پروا نہ کی۔ چند قدم چل کر کانوں میں کچھ آواز آئی تو بے اختیار مڑ کر دیکھا۔ [illegible]

www.pdfbooksfree.pk

انھی نے کا کہا رہے تھے۔ میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں کچھ دیر ٹی وی دیکھتا رہا پھر سونے لیٹ گیا۔ عموماً لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے۔ لیکن اس دن میں دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ میری طبیعت بے چین تھی اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور۔ دماغ میں خیالات گھوم رہے تھے۔ خاص طور پر وہ لڑکے مجھے بار بار یاد آنے لگے۔ ان کا طرزِ عمل کچھ ایسا تھا جس نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا۔

اپنا کام دوسروں سے دھڑلے سے کرانا اور پھر اس پر فخر بھی، کچھ عجیب کی بات تھی۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن ایسا ہوا تھا۔ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا، یہ حقیقت تھی۔ ان کی اس حرکت سے میرا ذہن منتشر ہو گیا۔ مجھے لگا کہ ایسا ایک واقعہ میرے ساتھ پہلے بھی پیش آ چکا۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ آخر میں نے اپنے دماغ سے تمام خیالات نکالے اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن ناکامی ہوئی۔

میرا ذہن گھوم پھر کر دوبارہ اسی طرف چلا جاتا۔ نیند میری آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ آخر میں خود کو تسلی دینے لگا کہ وہ بچے ہی تو ہیں۔ بچے شرارتی بھی ہوتے ہیں۔ جب سمجھ آتی تو ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہوتا ہے، بچوں کی منفی باتیں بڑے ہونے پر مثبت میں بدل جاتی ہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ایسا پہلے بھی ہو چکا۔ کوئی گم گشتہ یاد تھی جو ماضی کے اندھیرے میں کہیں چھپی تھی۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اچانک ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے تیس سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔

میں تب بھی اسی علاقے میں رہتا تھا۔ جب یہاں کی آبادی بہت کم تھی۔ خالی میدان دور تک نظر آتے۔ بس اسٹاپ بھی گھر سے دور تھا۔ مجھے وہ واقعہ یاد آیا تو آنکھوں کے سامنے گویا فلم سی چلنے لگی۔ شام کا وقت تھا۔ میں کہیں سے آ رہا تھا۔ اسٹاپ پر بس رکی تو بہت سے لوگ اترے۔ میں نے ان لوگوں میں آتے جاتے ہوئے دو لڑکوں کو دیکھا۔ انھوں نے اپنے کندھوں پر ایک ایک آٹے کا تھیلا اٹھا رکھا تھا۔

ان دنوں آٹے کی قلت تھی۔ لوگوں کو آٹا دور دراز راشن ڈپو سے لانا پڑتا۔ میں ان لڑکوں کو جانتا تھا۔ وہ میرے گھر کے قریب ہی رہتے اور میرے دوست صادق کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ان کی عمریں یہی کوئی دس گیارہ سال ہوں گی۔ وہ کندھوں پر بوجھ اٹھائے میدان میں تیزی سے چلے جا رہے تھے۔ میں نے بھی اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی اور جلد ان تک پہنچ گیا۔ قدموں کی چاپ سن کر انھوں نے گھوم کر دیکھا اور پھر مسکرا کر مجھے سلام کیا۔ میں نے کہا "وعلیکم السلام، لاؤ ایک تھیلا مجھے دے دو۔"

میں نے چھوٹے والے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خیال تھا کہ وہ سب بچوں کی طرح میری بات مان جائیں گے۔ لیکن اس وقت میں حیران رہ گیا جب بڑا لڑکا بولا "نہیں بھائی جان! ہم لے جائیں گے۔"

"ارے بھئی، میں بھی تو گھر ہی جا رہا ہوں اور تم بھی اسی طرف رہتے ہو۔ آتے آتے راستے تھک جاؤ گے، لاؤ اپنا تھیلا اٹھانے دو۔ اس طرح تمھیں بوجھ نہیں ہو گا اور راستہ آرام سے کٹ جائے گا۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "نہیں، ہم تو روز ایسے ہی اسی طرح آٹا لاتے ہیں۔ امی کہتی ہیں کہ انسان کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا چاہیے۔"

میرے بڑھتے ہاتھ وہیں رک گئے۔ میں نے کہا "ہاں دوست! تمھاری امی ٹھیک کہتی ہیں۔"

پھر میں ان کے ساتھ چلنے لگا۔ لیکن ان کے قدم مجھ سے تیز اٹھ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں وہ مجھ سے آگے نکل گئے۔ میری نظریں ان پر ٹکی تھیں۔ دونوں بھائی بہت

www.pdfbooksfree.pk

ذہین اور فرماں بردار تھے۔ میرے اسکول ہی میں نچلی جماعتوں میں پڑھتے تھے۔ (صادق اور میں نے اسی سال میٹرک کا امتحان دیا تھا) ان کے والد فوت ہو چکے تھے۔ والدہ پرورش کر رہی تھیں۔ صدر میں ان کے شوہر کی ایک دکان تھی جس کے کرائے سے اب ان کی گزر بسر ہوتی۔

پھر مجھے یاد آیا کہ وہ لوگ اس واقعے کے چند ماہ بعد یہ علاقہ چھوڑ کر کسی اور جگہ چلے گئے۔ میں نے پھر انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ میرے دماغ کو سکون مل گیا، جیسے کوئی گتھی سلجھ گئی۔ پھر حیرت انگیز طور پر مجھے فوراً نیند بھی آ گئی۔

اگلے دن چھٹی تھی۔ میں نے چند کام نمٹائے۔ پھر خیال آیا کہ صادق سے ملے بہت دن ہو گئے، کیوں نہ آج اس سے ملاقات کی جائے۔ وہ ساتھ والی گلی ہی میں رہتا تھا۔ ہم دونوں اپنے معاملات میں اس طرح مصروف تھے کہ صرف آتے جاتے حال چال پوچھ لیتے، ورنہ شاذ و نادر ہی ایک دوسرے کی خبر ہوتی۔ میں اس کے گھر چلا گیا۔ وہ گرم جوشی سے ملا، لیکن چپ چپ سا تھا۔ اس کے چہرے سے بے چینی عیاں تھی۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں نے اداسی کی وجہ پوچھی۔

وہ بولا "کمپنی میں اپنی ملازمت کے باعث پریشان ہوں۔ جہاں پچھلے دس سال سے کام کر رہا تھا، وہ کمپنی بند ہو گئی ہے۔ دوسری ملازمت مل تو گئی ہے لیکن تنخواہ کم ہے۔ بس گزارہ کر رہا ہوں۔ تم اپنی سناؤ، بچے کیا پڑھ رہے ہیں؟"

میں نے کہا "ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ ہم دونوں تو تعلیم حاصل کر کے ہی آگے بڑھتے تھے۔"

وہ اثبات میں گردن ہلانے لگا۔ آخر میرے دل کی بات زبان پر آ گئی۔ میں نے پوچھا "صادق! تمہارے ماموں کے لڑکے آج کل کہاں ہیں؟"

وہ چونک کر بولا "نعیم اور کلیم کی بات کر رہے ہو؟"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

وہ پُرجوش لہجے میں بولا "وہ لوگ گلشن اقبال میں رہتے ہیں۔ وہاں انھوں نے بنگلہ بنا لیا ہے۔"

"اچھا، بہت خوشی ہوئی۔ وہ کیا کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نعیم نے بی اے کیا تھا، وہ ایک فرم میں کام کرتا ہے۔ کلیم نے سائنس پڑھی اور مکینیکل انجینئر بن گیا۔ دونوں بہت محنتی تھے اور قسمت بھی ان کے ساتھ تھی۔ بھائی! دوسرے خاندان میں تو ان کی کامیابی اور خوشی کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ کسی غیر کو بتاؤ تو وہ یقین نہیں کرتا۔ تمھیں بھی یقین نہیں آ رہا ہوگا؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "نہیں، مجھے یقین آ گیا ہے۔ میرے ذہن میں ان کی اچھائی کی تصویر تھی۔"

پھر میں نے اسے تیس سال پہلے پیش آنے والا واقعہ سنایا اور سوچا کہ کتنی زبردست ہوتی ان لڑکوں کی حرکت بھی۔ وہ حیرت سے میری باتیں سن رہا تھا۔ پھر بولا "ہاں ہاں، محلے کے بچوں میں کسی سے اپنا کام کرانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ والدین اپنے بچوں کو ایسی ہی تربیت دیا کرتے تھے۔ لیکن آج کل وہ سب بدل چکے۔"

"ہاں، اب اسے آسانی اور ہوشیاری میں شمار کیا جاتا ہے۔ پھر تمھارا کیا خیال ہے، کسی دن ان دونوں سے ملیں؟"

وہ خوش دلی سے بولا "ہاں ضرور، اگلی اتوار کو چلتے ہیں۔"

میں کچھ دیر اور بیٹھا۔ پھر اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ باہر نکل کر میں نے ایسی خوشی اپنے اندر محسوس کی جو پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ رات جو بوجھ ان دو بچوں نے مجھ پر ڈالا تھا، اسے تیس سال پہلے وہ اپنے عمل سے ہٹا دیا تو مجھے الجھنے نہیں دیتے تھے۔

◆◆◆

سال قبل مشہور ماہرین ...

پچاس سے چوتھی ... تھی تمیں تو تمیں ... تباہ ہو سکتی ہیں ... ہوس، بے وقوفی اور خوف۔ یہ سو فیصد درست قول ہے۔ خاص طور پر ہوس کا شکار انسان تو شیطان بن جاتا ہے اور پیسا کمانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہوا ہے:

"جب تم بے حیا ہو جاؤ تو پھر جو جی میں آئے کرو۔" (روایت حضرت ابن مسعودؓ، البخاری)

اب کئی ہفتے کی بجائے چند برس سے یہ خبر پاکستانی دکانوں میں کتوں، چیلوں اور گدھوں کا گوشت بیچے گئے ہیں۔ اس گھناؤنے فعل کے پیچھے کیا مقصد

ہمارے بازاروں میں کھلے عام

گدھے کا گوشت کیوں بک رہا ہے؟

کھال کی مانگ نے راتوں رات
پاکستانی گدھوں کو قیمتی شے بنا ڈالا

[illegible]

کارندے گدھے بیچے جا رہے تھے۔ خاص طور پر پچھلے ایک دو برس سے گدھوں اور گھوڑوں کا گوشت خاصی مقدار میں فروخت ہونے لگا ہے۔ آئے دن یہ خبر آتی ہے کہ فلاں مقام پر قصائی گدھے کا گوشت بیچتے پکڑا گیا۔ یاد رہے، بخاری اور مسلم کی روایت کے مطابق جنگلی گدھے (Onager) کا گوشت حلال ہے۔ تاہم پالتو گدھے کا گوشت کھانا نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا تھا۔ اسی طرح حنفی گھوڑے کے گوشت کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ جبکہ شوافع، حنابلہ اور مالکی اسے بلا تکلف حلال ... ہے۔

سوال یہ ہے کہ پچھلے چند برس سے یکایک گدھے کا گوشت اتنی زیادہ مقدار میں کہاں بکنے لگا؟ اس کی وجہ ہے، پاکستانیوں کو معلوم ہو چکا ... پڑوسی ملک چین میں گدھے کی بڑی مانگ ہے۔ وہاں اب یہ جانور قیمتی شے کی حیثیت اختیار کر چکا۔

چین میں لوگ گدھے کا گوشت شوق سے کھاتے ہیں اور اسے وہ مقوی غذا سمجھتے ہیں۔ چین میں گدھے کے گوشت کی قیمت ۱۰۰۰ روپے ہے۔ کئی چینی علاقوں میں اس گوشت سے بنے برگر، کباب اور سموسے

www.pdfbooksfree.pk

قیمت سے کھائے جاتے ہیں۔

مزید برآں چین میں گدھے کی کھال کی چربی مختلف دوائی دوا اور سامان آرائش و سنگھار میں ڈالی جاتی ہے۔ چین میں گدھے کی کھال سے بنی ایک کلوگرام چربی کی قیمت ”دس ہزار روپے“ ہے۔ درحقیقت اسے روایتی چینی طب میں استعمال ہونے والے اہم ترین اجزا میں شامل کیا جاتا ہے۔

چند سال پہلے کچھ چینی تاجر گدھے کی کھال تلاش کرتے کرتے پاکستان کے شہر قصور آن پہنچے۔ وہاں چمڑے کی بڑی منڈی واقع ہے۔ یہ چینی تاجر جانتے تھے کہ پاکستان میں گدھے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں گدھوں کی تعداد پچاس لاکھ سے زائد ہے۔ (ایتھوپیا، چین اور بھارت میں بالترتیب ایک کروڑ اور ستر لاکھ گدھے پائے جاتے ہیں)

جب چینی تاجر قصور شہر کی منڈی پہنچے، تو وہاں گدھے کی کھال تین چار سو روپے میں بکتی تھی۔ اس عرصہ میں بھینس بکری کی کھال کے برعکس گدھے کی کھال سے زیادہ چیزیں نہیں بنتی تھیں۔ اسی لیے چمڑا مارکیٹ میں اس کی مانگ نہیں تھی۔ گدھے کی کھال کے چمڑے سے جوتوں کے تلے بنتے ہیں یا جوتوں کی تہ بنتی۔

چینی تاجروں کو جب چند سو روپے میں گدھے کی کھالیں مل گئیں تو خوشی کے مارے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ کیونکہ چین میں اس کھال کی قیمت کئی گنا زیادہ تھی۔ انھوں نے فوراً مارکیٹ میں موجود ساری کھالیں خرید لیں اور چین واپس لوٹ گئے۔

چین جا کر انھوں نے دیگر تاجروں کو بتایا۔ پاکستان میں تو گدھے کی کھال بہت سستی ہے۔ چنانچہ کئی چینی خریدار پاکستانی منڈیوں میں آ پہنچے۔ انھیں صرف گدھے کی کھال درکار تھی۔ ادھر پاکستانی تاجروں نے چینیوں کی بڑھتی آمد دیکھی اور یہ بھی جانا کہ وہ ”کھوتے“ کی کھال مانگتے ہیں، تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔

تعلیم یافتہ پاکستانی تاجروں نے کچھ مہمان چینی تاجروں سے پوچھ گچھ کی، انٹرنیٹ سے مدد لی۔ یوں ان پر انکشاف ہوا کہ چین میں تو گدھے کی کھال بحساب پاکستانی کرنسی کئی ہزار روپے میں بکتی ہے۔ اس حقیقت نے پاکستانی تاجروں کے کان کھڑے کر دیے۔

اب قصور اور لاہور کی چمڑا منڈیوں میں راتوں رات گدھے کی کھال کی قیمت بڑھنے لگی۔ یہ کھالیں صرف چینی تاجر ہی خریدتے ہیں۔

چینی تاجر دس ہزار روپے میں بھی گدھے کی کھال سستی پاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ ایک کھال سے دو تین کلو چربی نکل آتی ہے۔ اسی لیے پاکستانی گدھے کی کھال مہنگی ہونے کے باوجود چین میں اس کی مانگ برقرار ہے۔

چین میں گدھے کی کھال سے بنی چربی یا (جیلاٹن) ”ایجیاؤ“ (Ejiao) کہلاتی ہے۔ چین میں مشہور ہے کہ اس کے استعمال سے چہرے اور جسم کی جھریاں دور ہوتی ہیں۔ خون کی روانی بڑھتی ہے۔ چہرہ چمک دار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے گدھے کی کھال سے حاصل کی گئی یہ چربی کریمیں بنانے میں وسیع پیمانے پر استعمال ہوتی ہے۔

پاکستان میں یہ مسئلہ یوں پیدا ہوا کہ جب لٹیروں اور چوروں کو پتا چلا کہ گدھے کی کھال دس ہزار روپے میں بکتی ہے، تو وہ چوکنا ہو گئے۔ تب خصوصاً پنجاب کے دیہی علاقوں میں وہ سرگرم ہوئے اور غریب دیہاتیوں کے گدھے چرائے گئے۔

ان چوروں کو صرف کھال درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ گدھے کا گوشت ... والوں قصابوں کو بیچ

www.pdfbooksfree.pk

لگے۔ یہ ہے وہ وجہ جس کے باعث پاکستانی بازاروں میں اچانک بڑی تعداد میں گدھے کا گوشت فروخت ہونے لگا۔ چور ہوں، قصائی یا گدھے کا گوشت خریدنے والے حرام خور ہوٹل والے، انھیں بس اپنی کمائی سے غرض ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ گوشت کھلا کر ہم وطن پاکستانیوں کا ایمان و صحت خراب کر رہے ہیں۔

یہ ہوس پرست چور غریب دیہاتیوں کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ ہمارے اکثر گھرانوں میں گدھا چھوٹے موٹے کاروبار کرنے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسان ہو یا مزدور، وہ اس جانور سے دن بھر کئی کام لیتا ہے حتیٰ کہ بہت سے دیہاتی گدھے کی مدد ہی سے روزی روٹی کماتے ہیں۔ لیکن اب حرص اور ظالم چور ان کے گدھے چرا انھیں تنگدور کر دیتے ہیں۔

پچھلے دو برس میں فیصل آباد، گجرات، اوکاڑہ، ساہیوال اور پنجاب کے دیگر اضلاع میں آباد سیکڑوں دیہاتی اپنے گدھوں سے محروم ہو چکے۔ اسی لیے وہ اکثر شاہراہوں پر ٹریفک روک کر اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں۔

حکومت پنجاب کو چاہیے، وہ پولیس کو سختی سے ہدایت دے کہ گدھا چوروں پر کڑی نظر رکھی جائے۔ ویسے دیہات میں آباد لوگ اب اپنے جانوروں کی زیادہ نگرانی کرنے لگے ہیں۔ اسی طرح گدھا چوروں کے عزائم کے آگے بند باندھنا ممکن ہے۔

یہ چور گدھا چرا کر اسے مار ڈالتے ہیں۔ پھر کھال اتار کر چمڑا منڈی میں فروخت کرتے ہیں۔ یوں وہ اچھا خاصا کما لیتے ہیں۔ اب گوشت بیچنے سے بھی انھیں آمدنی ہونے لگی ہے۔ اسی لیے وہ گدھوں کی چوری سے باز نہیں آ رہے۔

یاد رہے کہ گدھے کا گوشت دیکھنے میں گائے یا بھینس کے گوشت سے ملتا جلتا ہے۔ تاہم اس سے زیادہ تیز بو اٹھتی ہے۔ یہ اس حرام گوشت کی ایک بڑی نشانی ہے۔

◆◆●

...ے کا بدلہ

ایک دفعہ امام ابو حنیفہ کسی صحرا میں سفر کر رہے تھے۔ ان کے پاس پانی ختم ہو گیا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی، تو ریت کے ٹیلے اور ریت تھی۔ امام صاحب کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ اتفاق سے انھیں ایک بدو مل گیا جس کے پاس پانی کا ایک مشکیزہ تھا۔ آپ نے اس سے پانی مانگا۔ بدو نے پہلے تو پانی دینے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا "اگر پانچ درہم دو تو یہ مشکیزہ تمھیں مل سکتا ہے۔"

امام صاحب نے پانچ درہم دے کر مشکیزہ لے لیا اور سیر ہو کر پانی پیا۔ پھر بدو سے پوچھا "بھائی میرے پاس کچھ ستو ہیں۔ کیا تم انھیں کھانا پسند کرو گے؟"

اس نے کہا "کیوں نہیں۔"

آپ نے اس کو ستو دے دیے جن میں خوب روغن زیتون ڈالا گیا تھا۔ بدو نے ستو خوب پیٹ بھر کر کھا لیے۔ پھر اسے بھی پیاس لگی۔ اس نے آپ سے پانی کا ایک پیالہ مانگا۔ امام صاحب نے فرمایا "پانچ درہم میں ملے گا، اس سے کم میں نہیں۔"

یوں بدو نے پانی کے بدلے میں جو پانچ درہم لیے تھے، اس کو واپس دینے پڑے۔

اس طرح امام ابو حنیفہ نے اس بدو کو سبق دیا کہ کسی ضرورت مند کے ساتھ نیکی خدا کو خوش کرنے کے لیے کرنی چاہیے نہ کہ پیسے کی خاطر۔ اگر وہ بدو خوشی سے پانی آپ کو دے دیتا تو شاید آپ اسے پانچ درہم سے بھی زیادہ رقم انعام میں عطا فرماتے۔

(امیر حمزہ بن مشتاق، دار پشن)

www.pdfbooksfree.pk

قدیم زمانے کا ذکر ہے کہ ایک نیم وحشی دراوڑ راجا بندھیاچل سے اس پار کی زمینوں پر حکومت کرتا تھا۔ وہ آریہ نسل نہیں تھا۔ اس کی رگوں میں ہندوستان کے قدیم دراوڑوں کا خون موجزن تھا جس سے تاحال وحشت کی بو نہ گئی تھی۔ تاہم وہ بنگال، اودھ اور وسط ہند کے کھشتری راجاؤں کا ہم عصر اور مہذب آریہ ورت کا ہمسایہ تھا۔ اس مقدس پڑوس نے خیالات کو متاثر ضرور کر دیا۔ اس لیے وہ فیاض تھا، تند مزاج بھی۔ آزاد خیال تھا، پرانی وحشیانہ رسموں کا پابند بھی۔ اس کی طبیعت تلون سے معمور تھی، مگر حکم اٹل ہوا کرتا۔

وہ راجا تھا، مطلق العنان۔ اس لیے اپنے خیالات کو جب اور جس طریق سے چاہتا عملی جامہ پہنانے میں تامل نہ کرتا۔ اسے اپنی رائے پر پورا اعتماد تھا لہٰذا ہر کام اپنی رضامندی کے مطابق انجام دیتا۔ اودھ اور بنگال وغیرہ کے عظیم الشان درباروں کی طرح اس کا بھی ایک دربار تھا جس میں اپنی نیم وحشی رعایا میں سے اچھے اچھے رتن چن کر رکھے تھے۔ ان سے مشورہ طلب بھی ہوتا مگر اپنی رائے کی مخالفت اسے پسند نہ تھی۔ تائید کلام سے بے حد خوش ہوتا لیکن اختلاف رائے برداشت نہ کرتا۔ مخالفت کا خیال بھی اسے اپنے درباریوں کی تمنائیں کو تہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔

بند دروازے میں سے کیا نکلا

شیر یا دوشیزہ......

نسوانی فطرت کی بھول بھلیاں اور پیچیدگیاں اجاگر کرتا معنی خیز فسانہ

فرینک سٹوکٹن / ابوالاثر حفیظ جالندھری

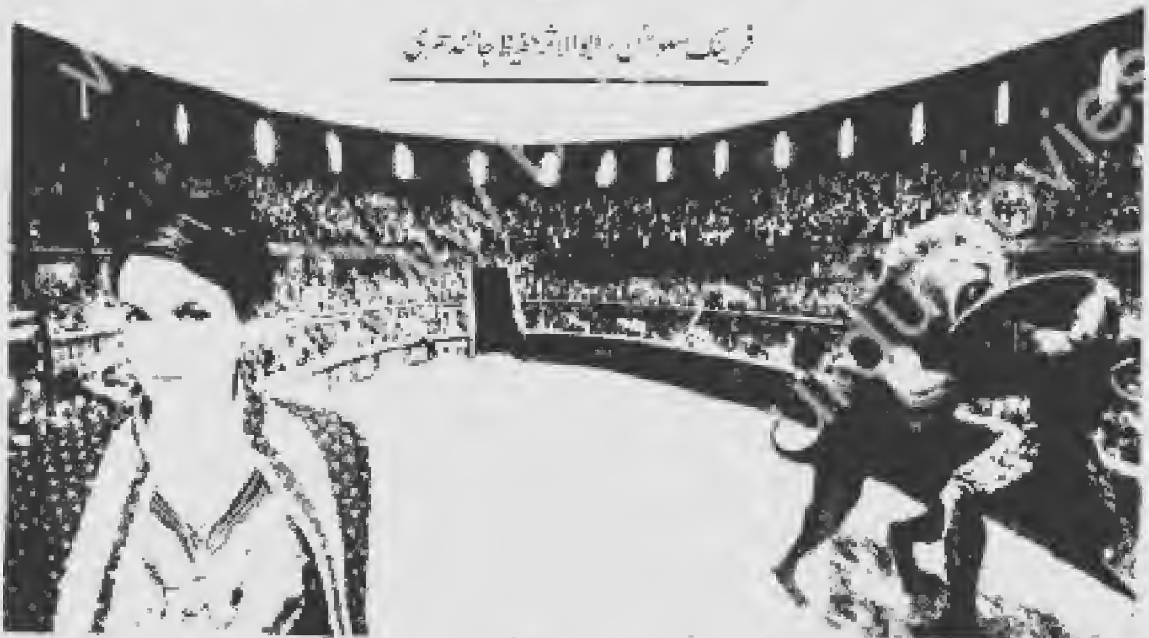

www.pdfbooksfree.pk

ہمسایہ قوم کے پرتو نے اس کی جدت کو کسی قدر زائل کر دیا۔ اپنے ہم عصر سورماؤں کے بہادرانہ اشغال کے مقابلے میں اس نے بھی اپنی راجدھانی میں ایک تماشا گاہ قائم کی تھی۔ وہاں وہ انسانی اور حیوانی درندوں کے نظارے دکھا کر تمام وحشی رعایا کو اپنے وقت کی تہذیب سے آراستہ کرنے میں بے حد ماہر تھا۔

لیکن تماشا گاہ میں بھی اس نے اپنی بے باک وحشت اور تصوراتی رنگ سے اک نئی جدت پیدا کر دی۔ یہ تماشا گاہ اس لیے نہیں بنائی گئی تھی کہ لوگ وہاں آ کر جمع ہوں اور وہ قیدیوں کی موت اور پھر ایک وحشیوں سے لڑ کر ہلاک ہوتا دیکھتے رہیں۔ نہ اس لیے کہ ایک خونخوار درندہ کسی درندے سے مقابلہ کرے بلکہ وہاں شائقین کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ تماشا گاہ کی بنیاد کا مقصد ان باتوں سے بلند تر تھا۔ وہ یہ کہ لوگوں کے ذہنی قویٰ کو اور زیادہ مضبوط اور وسیع کیا جائے۔

تماشا گاہ کا منتظم اپنے جدید عدالتی نظام اور پوشیدہ دہ خانوں اور بھول بھلیوں سے بھی زیادہ عجیب الخلقت درندگیوں کے سبب شاعرانہ عدل و انصاف کا ایک دلچسپ ذریعہ تھا۔ جب کبھی کوئی فرد ایسا مجرم ٹھہرایا جاتا جس سے خود راجا کو دلچسپی ہو تو اعلان کر دیا جاتا کہ فلاں روز اس کی قسمت کا آخری فیصلہ شاہی اکھاڑے میں ہو گا۔

اکھاڑا تماشا گاہ کے وسیع منظر کا سب سے نام تھا۔ گرچہ اس کی ساخت کسی دور دراز تہذیب کا پرتو تھی مگر راجا نے اس کے استعمال میں نئی جدت پیدا کر دی۔ وہ پرانے زمانے کے کارناموں کو دقیانوسی خیالات سے زیادہ تعبیر نہ دیتا۔ وہ اپنی اختراعات کو مناسب اور ہر شخص کے لیے قابل عمل خیال کرتا۔

مقررہ دن جب لوگ اکھاڑے کے وسیع برآمدوں میں جمع ہو جاتے، تو راجا بھی اپنے گراں ڈیل اور تہ غریاں درباریوں کے جلو میں برآمد ہوتا اور سب سے بڑی عدالت کے تخت شاہی پر بیٹھ جاتا۔ ہر طرف خاموشی چھا جاتی اور وحشیانہ نعروں کی جگہ عجیب چپ چاپ سے بدل جاتی۔ اس وقت راجا اشارہ کرتا۔ اشارے پر تخت شاہی کی نچلی دیوار میں ایک دروازہ کھول دیا جاتا اور مجرم اکھاڑے میں داخل ہوتا۔

راجا کے عین مقابل دیوار میں ایک ہی طرف کے دو بند دروازے بنائے گئے تھے۔ مجرم کا فرض تھا کہ عدالت عالیہ کے سامنے پس و پیش کیے بغیر ان کی طرف بڑھے اور دونوں میں سے ایک دروازہ کھول دے۔

صاحب تحریر

امریکا کے ممتاز قلم کار، فرینک سٹوکٹن ۵ اپریل ۱۸۳۴ء کو دی وڈلینڈ نامی قصبے میں پیدا ہوئے۔ والد پادری تھے۔ فرینک بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کی طرف مائل تھے مگر باپ نے انھیں منع کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے چوبی کندہ کاری کا پیشہ سیکھا اور اس کی مدد سے گزر اوقات کرنے لگے۔ ۱۸۶۰ء میں جب والد دنیا سے رخصت ہوئے، تب فرینک سب کہانیاں لکھنے لگے۔ انھوں نے بچوں اور بڑوں کے لیے کہانیاں لکھیں اور اخلاقی برائیوں مثلاً لالچ، تشدد، حسد وغیرہ کو موضوع بنایا۔ ان کی نمائندہ کہانی ''دی لیڈی اور دی ٹائیگر'' آپ کے زیر مطالعہ ہے۔ فرینک سٹوکٹن نے ۲۰ اپریل ۱۹۰۲ء کو وفات پائی۔

www.pdfbooksfree.pk

دروازے کا انتخاب مجرم کی اپنی خوشی اور پسند پر تھا۔ اس پر نہ تو کسی قسم کا جبر و تشدد روا رکھا جاتا نہ رہبری کی جاتی، بلکہ فیصلہ نہایت عادلانہ طور پر مجرم کی قسمت پر چھوڑ دیا جاتا۔ ایک دروازہ کھلنے پر خوفناک، ظالم اور بھوکا شیر برآمد ہوتا۔ وہ دروازے سے گرجتا ہوا نکلتا اور نہتے بدنصیب مجرم پر جھپٹا مار چیر پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا۔ یہی اس مجرم کی سزا سمجھی جاتی۔

جب مجرم کی قسمت یہ فیصلہ کرتی، تو لوہے کے گھڑیال ماتمی انداز سے شور مچاتے۔ اکھاڑے کے باہر چاروں طرف اجرت پر بلائے ماتمی اپنی دردناک چیخوں اور شکوہ دھوتو دھوتو کی پکار سے افسوس کا اظہار کرتے۔ عام تماشائی گردن جھکائے افسردہ صورت بنائے آہستہ آہستہ اپنے گھر لوٹ جاتے۔ ان کے دلوں میں مقتول کے حسن و شباب یا بزرگی و عزت کا احساس لہریں مارتا نظر آتا۔

لیکن جب مجرم دوسرا دروازہ کھول لیتا، تو اس میں سے ایک کم سن دوشیزہ نکل کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ اس دوشیزہ کا بے حد حسین ہونا لازمی تھا۔ راجا اپنی سلطنت میں سے خود انتخاب کرتا۔ دوشیزہ کی شادی اس مجرم کے ساتھ کر دی جاتی۔ اس امر کو مجرم کی معصومیت کا انعام خیال کیا جاتا۔

اس حالت میں یہ پروا نہیں کی جاتی کہ مجرم کی پہلے بھی کوئی بیوی ہے یا نہیں، خواہ وہ کسی عورت کو دل و جان سے ہی کیوں نہ چاہتا ہو۔ راجا اپنے عطیے کے مقابلے میں کسی بات کا خیال نہ کرتا تھا۔

شادی کی رسمیں اسی وقت اکھاڑے کے اندر راجا کے سامنے ادا کی جاتیں۔ راجا کے اشارے سے فوراً ایک اور دروازہ کھلتا۔ لمبے لمبے بالوں والے پجاری گویّے اور ناچنے والی کنواری لڑکیوں کو لیے باجے گاجے کے ساتھ اس جوڑے کے قریب پہنچتے۔ شادی کا اہتمام نہایت دھوم دھام سے کیا جاتا۔

رسوم کے خاتمے پر گھڑیال بجتے۔ تمام لوگ اپنی وحشیانہ اچھل کود سے خوشی کا اظہار کرتے اور معصوم مجرم اپنی نئی دلھن کے ساتھ گھر روانہ ہو جاتا۔ راستے میں لڑکے لڑکیاں ان پر پھولوں کی برکھا کرتے جاتے۔

راجا کی عدالت کا یہی نیم مہذب فیصلہ تھا۔ اس طریق عمل کی خوبی ظاہر ہے۔ مجرم کسی طرح یہ سمجھ نہ پاتا کہ عورت کس دروازے سے برآمد ہوگی۔ وہ اپنی خوشی سے ایک دروازہ کھول دیتا۔ اسے اس بات کی مطلقاً خبر نہ ہوتی کہ اب شادی سے ہمکنار ہوں گا یا موت سے!

اب تک جتنے واقعات گزرے تھے، ان میں شیر کبھی ایک دروازے سے برآمد ہوتا اور کبھی دوسرے سے۔ اگر آدمی اپنے آپ کو واقعی مجرم پاتا تو چشم زدن میں اسے سزا مل جاتی۔ اگر وہ معصوم ظاہر ہوتا تو دوشیزہ کو پسند کرے یا ناپسند، اسے راجا کے فیصلے سے رہائی مل ہی نہیں سکتی تھی۔

اکھاڑہ مشہور مقام تھا۔ جب لوگ اہم فیصلے کے دن وہاں جمع ہوتے، تو انھیں اس امر کا بالکل علم نہ ہوتا کہ وہ ایک مجرم کا قتل دیکھیں گے یا شادی! یہ لاعلمی ان کی آتش شوق کو اور بھی بھڑکا دیتی۔ تماشائی پرجوش اور بے تاب نظر آتے۔ اکثر اپنے ذہن سے کام لیتے اور اوٹ پٹانگ قیاس دوڑاتے۔ لیکن فیصلے پر الزام نہ دھرتے کیونکہ ان کے خیال میں فیصلہ مجرم کے اپنے ہاتھوں میں ہوتا تھا۔

اس وحشی کے سے نیم مہذب راجا کی ایک بیٹی بھی تھی۔ وہ حسین و جمیل تھی اور آرام و آسائش سے رہتی۔ راجا قدرتی طور پر اس لڑکی کو سارے جہان بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔

اس کے درباریوں میں ایک نوجوان معزز قبیلے سے

www.pdfbooksfree.pk

تعلق رکھتا تھا اور یہ ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے کہ اکثر درباری نوجوان شہزادیوں کے دام محبت میں پھنس کر صدمے اٹھاتے رہے ہیں۔ چناں اس نوجوان پر بھی راجا کی بیٹی فریفتہ تھی۔ اسے اپنے محبوب کی جاں نثاری پر پورا بھروسا تھا کیونکہ وہ ساری مملکت میں بہادری، خوب صورتی اور مردانگی میں بے نظیر تھا۔ وہ اسے انتہائی گرم جوشی کے ساتھ چاہتی تھی، اس حد تک کہ چاہت میں تشدد کا جذبہ بھی موجود تھا۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ دل سوز اور پُرجوش بنانا چاہتی تھی۔ اس آتشیں عشق کا سلسلہ مدت تک جاری رہا لیکن ایک وقت آیا کہ راجا پر یہ راز افشا ہو گیا۔

اس نے اپنے فرائض ادا کرنے میں زیادہ تامل نہیں کیا۔ کسی تذبذب یا سوچ بچار کے بغیر نوجوان کو حراست میں لیا اور مقدمے کی تحقیقات کے لیے آخری دن مقرر کر دیا۔ یہ دن واقعی یادگار تھا۔ رعایا اور خود راجا اس مقدمے کی تحقیق میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔ اس سے پیشتر کبھی ایسا واقعہ رونما نہ ہوا تھا کہ ایک غلام خاص راجا کی بیٹی سے محبت کرنے کی جرأت کا مرتکب ہو۔ شاید دنیا کے آغاز میں یہ بات معمولی خیال کی جاتی ہو مگر ان قوموں کے لیے معاملہ نہایت اہم تھا۔

خونخوار جلادوں نے تمام سلطنت کے پنجرے دیکھے بھالے تاکہ سب سے زیادہ تند، ظالم اور ہیبت ناک شیر منتخب کیا جا سکے۔

اسی طرح نسوانی فن کے بڑے بڑے ماہروں نے ملک کی دوشیزاؤں میں سے ایک بہترین حسین دوشیزہ تلاش کی تاکہ نوجوان کی قسمت کا ستارا اسے معصوم ثابت کر دے تو اس الزام کی نسبت سے انتہائی بڑا انعام بھی دیا جائے۔

البتہ ایک بات سب پر ظاہر تھی۔ یہ کہ ہر شخص جانتا تھا، الزام قطعاً درست اور سچا ہے۔ مجرم نے راج کماری سے محبت کی۔ اس سے نہ وہ جوان انکار کرتا تھا نہ راج کماری۔ لیکن راجا اس ظاہر ثبوت کی رو سے فیصلہ کر کے اپنی عدالت کے دستور کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

مقررہ دن آن پہنچا۔ قرب و جوار کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ تماشاگاہ ہجوم سے بھر گئی۔ یک کثیر التعداد انبوہ جسے اندر جگہ نہ مل سکی، احاطے کے باہر جمع ہو گیا۔

راجا اور اس کے درباری ہم صورت دروازوں کے بالمقابل متمکن ہوئے۔ سب کچھ تیار تھا۔ لوگوں کی نگاہیں ایک گہرے سکوت میں چھپ گئی تھیں کہ راجا نے اشارہ کیا۔ شاہی نشستوں کے نیچے بنا دروازہ کھلا اور راج کماری کا جاں نثار احاطے میں داخل ہوا۔

سرو قد، وجیہ، شکیل، خوش وضع، خوش اطوار۔ یا اس نوجوان کے لیے تماشائیوں کے دلوں میں خوشی اور رنج، دونوں قسم کے جذبات ابھر آئے۔

آدھی سے زیادہ خلقت کو یہ معلوم نہ تھا کہ ایسا شاندار انسان بھی ان کے درمیان رہتا ہے۔ لوگ سوچ رہے تھے کہ ایسے نوجوان سے کسی شہزادی کا محبت کرنا اچنبھے کی بات نہیں۔ لیکن اس کا امتحان کی جگہ موجود ہونا خطرناک ہے۔

جب نوجوان نے احاطے میں قدم رکھا، تو دستور کے مطابق وہ راجا کی تعظیم کے لیے جھکا۔ لیکن اس نے راجا کی موجودگی کا مطلق احساس نہ کیا۔ اس کی آنکھیں خوبصورت راج کماری پر جمی ہوئی تھیں جو راجا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھی تھی۔

اُف اس عورت کی فطرت کتنی بے باک تھی ورنہ شاید وہ ایسے وقت یہاں موجود نہ ہوتی۔ مگر اس کی روح میں ایک تڑپ تھی اور محبت کی آگ نے اسے یہ نظارہ دیکھنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

جب یہ سوال ہوا کہ اس کا محبوب انجمن کے دروازے میں اپنی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھوں سے کرے گا، تو اس کے لیے دن رات دوبھر ہو گئے۔ شہزادی نے سوالات اس قدر مبہم کیے کہ کسی بات سے سروکار نہ تھا۔ اس کے پاس حماقت اور ضرورت تھی۔ اس لڑکی سے ملاقات میں اسے پتا چل گیا کہ دونوں دروازوں کے راز معلوم تھے۔ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ دونوں دروازوں کے پیچھے کس طرف کس کمرے میں بھوکا شیر خونخوار حالت میں کھڑا ہے اور کس کمرے میں حسین دوشیزہ انتظار کر رہی ہے۔

راج کے دروازے میں اس کے دروازے کے پاس بھی خیال کے پردے لٹک رہے تھے۔ کسی قسم کا شور یا آواز سنائی دینے کا یہ امکان ناممکن تھے۔ لیکن دونوں نازک اور عورت کے جذبۂ محبت نے ساری حقیقت آشکار کر دی۔ اسے دونوں طرف کا معلوم تھا کہ دوشیزہ کس دروازے کے پیچھے اس کے عاشق کی منتظر ہے اور یہ بھی جانتی تھی کہ وہ دوشیزہ کون ہے؟

وہ دوشیزہ نوجوان حکمران کی بہ نسبت زیادہ حسین میں ممتاز ہوتی تھی۔ دربار کی تمام لڑکیوں سے بڑھ کر خوبصورت اور دل ربا تھی۔ خود راج کماری اسے خوبصورت سمجھتی تھی لیکن اس سے نفرت بھی کرتی۔ اس نے بارہا دیکھا اور محسوس کیا کہ یہ لڑکی اس کے حسین محبت بھری نظروں سے اس کے محبوب کو دیکھا کرتی ہے۔ بعض اوقات راج کماری کو محسوس ہوا کہ اس کی نگاہیں کامیاب لوٹ رہی ہیں۔ اس کا محبوب بھی اس کی محبت کا جواب دے رہا ہے۔ کبھی کبھی اس نے انھیں گفتگو کرتے بھی دیکھا۔ یہ گفتگو جو سرسری اور بہت مختصر ہوتی تھی، لیکن ہے کہ دو موقعوں پر ہوئی تھی راج کماری کس طرح برداشت کر سکتی تھی؟

راج کماری کے محبوب پر ڈورے ڈالنے والی لڑکی سے نفرت کی وجہ تھی لیکن راج کماری اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی انتہائی وحشت کے ساتھ اس لڑکی سے نفرت کرتی۔ اب وہی لڑکی اس وقت سامنے کے دروازوں میں سے ایک کے پیچھے پوشیدہ تھی۔

جب محبوب نے سر اس طرف دیکھا تو دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اس وقت راج کماری سب سے زیادہ سنجیدہ اور زرد ہو گئی تھی۔ اردگرد سب خاموش چہروں میں وہی تھی اس سے زیادہ بے حس و حرکت نظر آتی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو جذبات سے بھر گئے۔ دل کی دھڑکن بڑھ گئی اور نگاہیں ایک دوسرے سے پیوست ہوئیں۔ راج کماری جانتی تھی کہ کون سے دروازے کے پیچھے کیا ہے۔ نوجوان کو بھی یقین تھا کہ وہ ضرور جانتی ہے۔ نوجوان عاشق اپنی محبوبہ کی محبت بھری فطرت کو سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میری نگاہیں دروازوں کا یہ راز معلوم کیے بغیر راج کماری کے چہرے سے نہیں ہٹیں گی۔ وہ راز جو تماشائیوں کی نظروں سے پنہاں تھا۔ نوجوان کو یقین تھا کہ شہزادی یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

نوجوان کی نگاہیں آرزومند اور پرشوق نگاہ سے پوچھا "کدھر؟"

راج کماری پر یہ استفسار اس طرح واضح ہوا گویا نوجوان نے پورے زور سے پکارا ہو۔ ایک بھی ساعت ضائع نہیں ہونی چاہیے تھی۔ یہ سوال بغیر آنکھ جھپکائے صرف نگاہ کی لطیف جنبش کے ذریعے پوچھا گیا اور جنبش نگاہ ہی اس کا جواب ہو سکتی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

راج کماری نے اپنا داہنا ہاتھ اٹھایا۔ اس کی روشن آنکھوں میں سے نگاہ نے دائیں جانب جنبش کی۔ اس لطیف اشارے کو راج کماری کے محبوب کے سوا کوئی نہ دیکھ سکا۔ نوجوان کی آنکھوں کے سوا ہر فرد بشر کی آنکھیں سامنے کے دروازوں پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ مڑا اور مضبوط قدموں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازوں کا درمیانی فاصلہ طے کرنے لگا۔ دلوں کی حرکت بند ہوگئی۔ سانس رک گئے۔ آنکھیں کیمرے کی طرح اس پر جم گئیں۔ وہ بنا پس و پیش دائیں دروازے کی سمت بڑھا اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اسے کھول دیا۔

اب کہانی کا آخری معمہ یہ ہے کہ اس دروازے میں سے شیر نکلا یا دوشیزہ؟ اس سوال پر جتنا غور کریں اسی قدر اس کا حل مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اس سوال کا حل انسانی قلب کے معاملے میں ہے اور اس نے ہمیں جذبات کے پُراسرار گورکھ دھندے میں پھنسا دیا۔

کہانی پڑھنے والو! اس سوال کے جواب پر غور کرو۔ پُرجوش اور نیم وحشی راج کماری کے دل کا مطالعہ کرو جس کی روح مایوسی کی شدید آگ میں بھسم ہو رہی تھی۔ وہ بار بار سوچتی "میں نے اسے کھو دیا لیکن اس کو کون حاصل کرے گا؟"

آج سے پیشتر اپنی مرگ تفتیش کے آغاز پر وہ بارہا وحشت ناک خوابوں سے چونک گئی ہوگی۔ اس نے کئی بار یہ خیال آتے ہی دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا ہوگا کہ اس کا محبوب وہ دروازہ کھول رہا ہے جس کے دوسری جانب بھوکا شیر اس کا منتظر ہے۔

کئی مرتبہ اس نے تصور سے اپنے محبوب کو دوسرے دروازے پر دیکھا اور وہ غضب سے دانت پیس گئی ہوگی اور اپنے بالوں کو نوچا ہوگا۔ اس خیال سے کہ میرا محبوب اپنی خوشی سے یہ دروازہ کھول رہا ہے جس کے پیچھے ایک بے انتہا حسین دوشیزہ ہے۔

تصور ہی تصور میں اپنے عاشق کو پُراشتیاق نگاہوں سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے دیکھ کر راج کماری کا دل رقابت کی آگ سے جل اٹھا ہوگا۔ اس نے تصور کی آنکھوں سے اپنے کھوئے ہوئے معشوق کے افسردہ جسم کو نئی روح سے جگمگاتے دیکھا اور عوام الناس کو خوشی کے نعرے لگاتے سنا ہوگا۔ کبھی خیال کیا ہوگا کہ شیر اس کا جسم چیر پھاڑ رہا ہے۔ تب اس کی چیخیں نکل جاتی ہوں گی۔ کبھی پجاری نے اپنے رو برو اسے ایک دوسری لڑکی کا خاوند بنتے دیکھا ہوگا۔ کبھی اس کی نئی زندگی اور خوشی دکھائی دی ہوں گی اور کبھی اس پر پھولوں کی برکھا ہوتی نظر آتی ہوگی۔

ان تصورات کے ہنگاموں میں اس کی روح ہر ساعت آہوں میں غرق ہوتی ہوگی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ میں اسی وقت مر جاؤں اور اگلی دنیا میں اپنے محبوب کا انتظار کروں جہاں اسے مجھ سے چھینا نہیں جا سکتا۔

اس نے نگاہ کی ایک ہی جنبش سے اپنا فیصلہ سنا دیا مگر یہ فیصلہ کرنے کے لیے اس نے کئی اندوہناک دن اور راتیں بسر کیں۔

وہ جانتی تھی کہ مجھ سے سوال کیا جائے گا اور اس نے سوچ لیا کہ میں کیا جواب دوں گی۔

اس نے کسی پس و پیش کے بغیر اپنا نازک ہاتھ دائیں جانب پھیر دیا مگر اس فیصلے کا نتیجہ جاننا آسان نہیں۔ دروازے میں سے کیا نکلا؟ دوشیزہ یا شیر؟ آپ خود اس سوال پر غور کریں۔ ہم اس معمے کو حل کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

ورلڈ کپ کی وبا

جو چار سال بعد آئے، تو پاکستان میں زندگی کا پہیہ جام کر ڈالے

دانش ظاہر

"بیگم! لو" ندیم نے گھر میں داخل ہوتے ہی آواز لگائی۔ "گھر کا تمام ضروری سامان اور راشن منگوا

"یا اللہ خیر! کیا پڑوسی ملک نے حملہ کر دیا؟ ہائے ربا، ہمیں یہی خطرہ تھا۔ آئے دن سرحدوں پر چھیڑ خانی کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔ اب کیا ہوگا؟" بیگم سہم گئیں۔ وہ بچپن ہی سے جنگ کے نام پر خوفزدہ ہو جاتی تھیں۔ ہمیشہ دعا کرتیں کہ ان کی زندگی میں کبھی جنگ نہ ہو۔

"ارے نہیں بھئی ایسا کچھ نہیں۔" ندیم بولے۔

"تو پھر کیا دہشت گردی کا خطرہ ہے؟" بیگم نے یوں سرگوشی کے انداز میں پوچھا گویا کوئی دہشت گرد آس پاس ہی موجود ہے۔

"او خدایا! ایک تو تم عورتوں کو واویلا کرنے کا بہت شوق ہے۔ ارے بھئی بات تو پوری سن لیا کرو۔" ندیم جھنجھلا کر بولے۔

"تو پھر آپ ہی بتائیے کہ یہ ذخیرہ اندوزی کرنے کا حکم نامہ کیوں جاری کر رہے ہیں؟" بیگم نے پوچھا۔

"بھئی کرکٹ ورلڈ کپ شروع ہو رہا ہے۔ مجھے وقت بے وقت بازار سے سودا سلف لانے کا مت کہنا۔ جو منگوانا ہے، ابھی منگوا لو۔ پھر میں ذمے دار نہ ہوں گا۔" ندیم نے "میں" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تو یوں کہیے نا کہ ورلڈ کپ کی وبا حملہ آور ہو گئی۔ اس بیماری میں مبتلا کوئی مریض کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔" بیگم نے جل کر کہا۔

یوں تو کرکٹ کے شائق میں مبتلا مریضوں کی تعداد کم نہیں۔ لیکن اب چار سال بعد ورلڈ کپ شروع ہوا تو اس بیماری سے شاید ہی کوئی بچ پاتا ہے۔

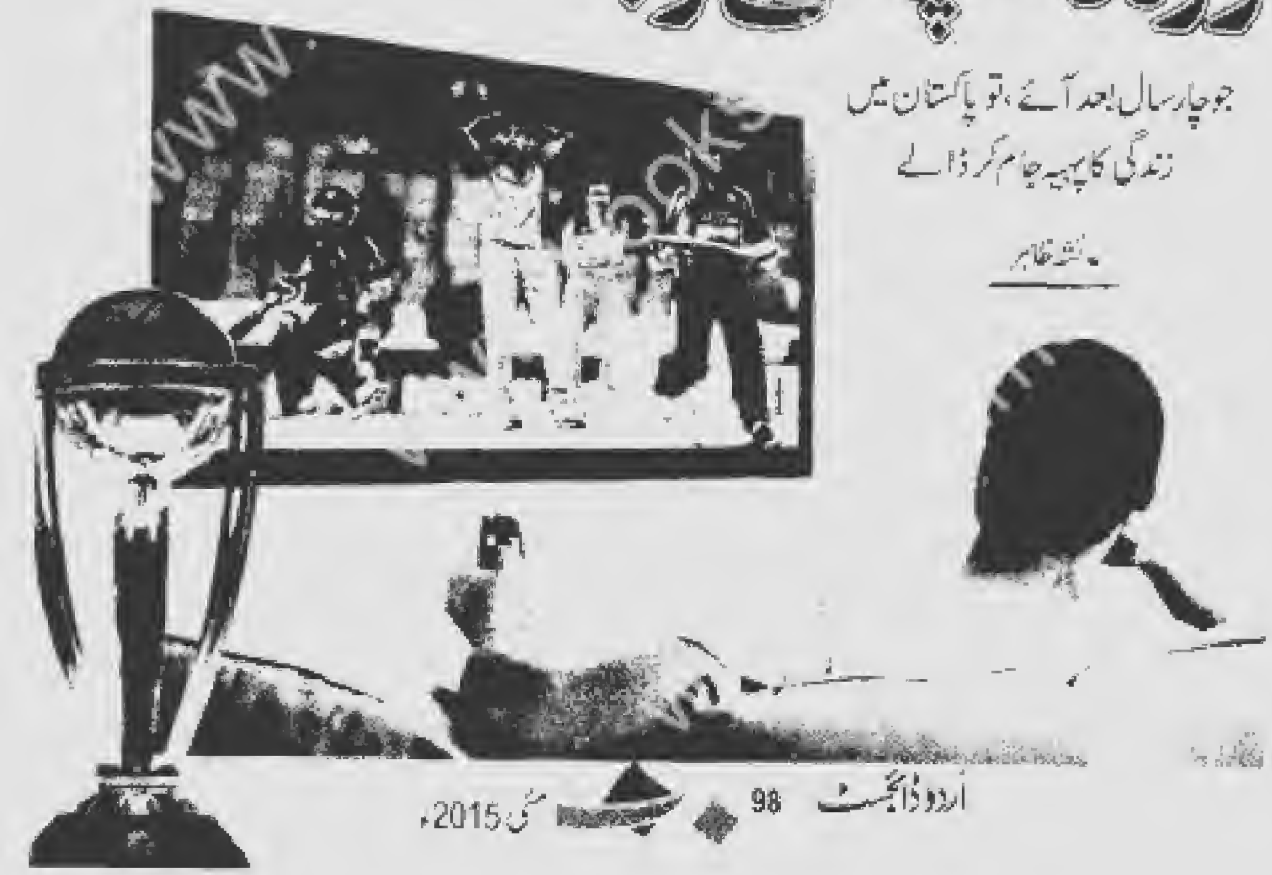

www.pdfbooksfree.pk

مرد، عورت، بچے، بوڑھے اور جوان ہر کسی پر یہ بیماری پوری شدت سے حملہ آور ہوتی ہے۔ رہ جاتے ہیں، تو مجھ جیسے معدودے چند لوگ جن کی بدولت کاروبارِ حیات چلتا ہے۔ ورنہ ایسا لگتا ہے، یہ وبا زندگی کا پہیہ ہی جام کر دے گی۔

کئی لوگ پہلے سے گھر میں راشن اکٹھا کرنے لگتے ہیں کہ دورانِ میچ کون باہر نکلے گا۔ والدین بچوں کو تمام اسباق پیشگی یاد کراتے ہیں کہ ورلڈ کپ کے دوران پڑھانے کا وقت نہیں ہوتا۔ خواتین کئی طرح کے کھانے بنا کر منجمد کر دیتی ہیں۔ غرض تمام لوگ ذوق و شوق سے ورلڈ کپ کی تیاریوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔

ورلڈ کپ کا شیڈول آتے ہی پہلے تو ان تمام تاریخوں پر نشان لگایا جاتا ہے، جن میں پاکستان کا مقابلہ کانٹے دار ٹیم سے ہو، خاص طور پر بھارت کے ساتھ! جس دن بھارت کے ساتھ پاکستان کا میچ ہو، پورے ملک میں کاروبارِ زندگی معطل ہو جاتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ ملک بھر میں ہڑتال ہے۔ بہت سے دیوانے اسے پاک بھارت جنگ ہی شمار کرتے ہیں۔

وہ دورانِ میچ لوگ کسی قسم کا کام کرنا کبیرہ گناہ سمجھتے ہیں۔ اس دوران مریضوں (یعنی کرکٹ کے شائقین) کی کیفیت قابلِ دید ہوتی ہے۔ ریموٹ ہاتھ میں پکڑے، آنکھیں پھاڑے اور سانس روکے نظریں ٹی وی پر جمی ہوتی ہیں۔ گویا کھلاڑی کے آؤٹ ہونے کا تعلق ان کے پلک جھپکنے یا سانس لینے سے ہے۔

رت جگے منانے کا رواج عام ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ بھی بہت شوق سے تمام رات جاگتے ہیں جو شاید کبھی رمضان میں عبادت کی غرض سے جاگے ہوں۔ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ خواتین سر پر دوپٹہ لپیٹے مصلّے بچھائے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں ریموٹ پکڑے خشوع و خضوع سے دعا میں مصروف ہیں۔ ان پر رقت طاری ہے۔ چہرے پر ایسی التجا اور درد ہوتا ہے کہ لگتا ہے آج مصلّے سے اپنے تمام گناہ بخشوا کر ہی اٹھیں گی۔ لیکن درحقیقت وہ پاکستانی ٹیم کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوتی ہیں۔

ان دنوں ہر کوئی دوسرے سے اسکور پوچھتا نظر آتا ہے۔ گاہک دکاندار، باس ملازمین، مریض ڈاکٹر اور خواتین رشتے داروں سے بات کریں، تو حال احوال سے پہلے میچ کی صورتِ حال ضرور پوچھتی ہیں۔ دورانِ میچ اگر لوڈشیڈنگ ہو جائے، تو واپڈا کی شان میں قصیدہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ تمام رشتے دار بھی یاد آنے لگتے ہیں جنھیں کئی سال سے فون نہیں کیا گیا۔ پھر انھیں فون یا میسج بھیج کر اسکور معلوم کیا جاتا ہے۔

دورانِ میچ جب کوئی کھلاڑی آؤٹ ہو یا ٹیم ہار جائے، تو ایسا ردِعمل سامنے آتا ہے کہ بچے سہم کر ماؤں کی گود میں دبک جاتے ہیں۔ پرندے گھبرا کر اپنے گھونسلوں سے اڑتے اور کمزور دل حضرات دل پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

کمزور دل کے وہ افراد جو اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ پاکستانی ٹیم ناقابلِ شکست ہے، عموماً یہ صدمہ برداشت نہیں کر پاتے اور دل کا دورہ پڑنے سے ہسپتال پہنچ جاتے ہیں۔ ان افراد کو ڈاکٹر فائنل میچ تک اسپتال ہی میں رکھتے ہیں۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ ہر میچ کے دوران ان کے بلڈ پریشر اور دل کی رفتار کے اتار چڑھاؤ کی مکمل پڑتال ہو سکے۔

یوں تو پاکستانی ٹیم ہماری امیدوں کے برخلاف ایک مرتبہ ورلڈ کپ جیت کر لا چکی۔ ورنہ عموماً ہماری توقعات کے عین مطابق کسی فائنل سے پہلے ہی منہ لٹکا کر واپس آ جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر مجھ جیسے دل جلے کہتے ہیں ''شکر ہے، اب کم از کم زندگی معمول پر تو آئے گی۔'' لیکن راز کی بات یہ ہے، ہمارا یہ جملہ انگور کھٹے ہیں کے مترادف ہے۔ ورنہ کون کافر ہے جو اپنی ٹیم کی ہار پر خوش ہو؟

مشورہ حاضر ہے

رخسانہ قندیل

گنج کا خاتمہ

مجھے گنج کے خاتمے کا تیر بہدف نسخہ درکار ہے۔ مزید برآں سفید بال سیاہ کرنے کا طریقہ بھی بتائیے؟

(علی احمد نور، اسلام آباد)

عمر کے ساتھ ساتھ اکثر مرد گنجے ہو جاتے ہیں۔ گنج جنم لینے کی کئی وجوہ ہیں۔ مثلاً اجداد میں گنج پن ہونا، ناقص غذا کھانا، جسمانی تبدیلی، ذہنی دباؤ اور خون کی کمی (انیمیا)۔ حقیقت یہ ہے کہ گنج پن کا کوئی شافی علاج نہیں، البتہ غذائیت سے پُر غذا کھا کر بال جھڑنے کا عمل روکا جا سکتا ہے۔

بالوں کی نشوونما کے لیے پروٹین ضروری ہے۔ لہٰذا دن میں گوشت کی دو تین بوٹیاں کھائیے۔ دودھ بھی لیجیے۔ نیز انڈے، پھل اور سبزیاں غذا میں شامل رکھیے۔ مزید برآں جسم میں فولاد، زنک اور وٹامن کی کمی نہ ہونے دیجیے۔ یہ معدنیات بھی بالوں کی افزائش کرتی ہیں۔ نہاتے ہوئے بالوں میں نرمی سے انگلیاں پھیریے۔ ذہنی دباؤ سے بچیے۔ بال اگانے کی ادویہ بازار میں دستیاب ہیں لیکن ان کے استعمال سے عموماً فائدہ نہیں ہوتا۔

خضاب کے بغیر سفید بال سیاہ کرنے کے مختلف دیسی ٹوٹکے موجود ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ مہندی کا آمیزہ بنائیے۔ اس میں تین چمچ کروندے کا سفوف اور ایک چمچ کافی پاؤڈر ملائیے۔ اب آمیزے میں تھوڑا سا پانی ڈال کر اچھی طرح چمچ چلائیے تاکہ تینوں اشیا حل ہو جائیں۔

یہ آمیزہ گھنے دانت والے برش کی مدد سے بالوں میں لگائیے اور کم از کم دو گھنٹے لگا رہنے دیجیے۔ اس کے بعد اچھی قسم کے صابن یا شیمپو سے سر دھو لیجیے۔ یہ نسخہ نہ صرف بال سیاہ کرتا بلکہ انھیں چمک دار اور نرم و ملائم بھی بناتا ہے۔

بال اگر زیادہ سفید نہ ہوں، تو چائے کی پتیوں کا نسخہ بھی قابلِ عمل ہے۔ دو چمچ چائے کی پتی پانی میں ابال لیں۔ جب پانی کچھ ٹھنڈا ہو جائے، تو بالوں پر لگائیے۔

www.pdfbooksfree.pk

ایک گھنٹے بعد صابن یا شیمپو استعمال کیے بغیر سر دھو لیجیے۔

ایک اور ٹوٹکا یہ ہے کہ سکاکائی، آملہ اور ریٹھا ہم وزن لیں۔ انھیں اچھی طرح دھو کر پیس لیں۔ یہ آمیزہ یا پیسٹ ایک چمچ کھولتے پانی میں ڈال دیں اور اسے اچھی طرح ملا لیں۔ یہ آمیزہ جب پانی نیم گرم ہو جائے، تو اس سے سر دھوئیے۔ یہ آمیزہ بال سیاہ اور لمبے کرتا ہے۔ خیال رہے، یہ پانی چہرے پہ لگا، تو اسے کالا کر دے گا۔ لہٰذا چہرہ بچا کر رکھیے۔

کالا جادو

میں ایم اے سیاسیات ہوں۔ شکل و صورت اور اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی نہیں ہو رہی۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمارے خاندان پر جادو کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی مشورہ دیجیے۔

(شاہین، راولپنڈی)

آیت ۱۰۲ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جادوگر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، یہ قدرت صرف اللہ پاک رکھتے ہیں۔

آپ نماز اور قرآن پاک باقاعدگی سے پڑھیے اور امید رکھیے کہ رب کائنات آپ کی مدد فرمائیں گے۔ رشتوں کی تلاش جاری رکھیے کہ ہاتھ پاؤں مارنے ہی سے منزل ملتی ہے۔ ان شاء اللہ رب کا پاک بار آپ پر کرم فرمائے گا۔

بال گرتے ہیں

میرے بال بہت گرتے ہیں۔ اس خرابی کا علاج بتائیے۔

(راحیلہ، لاہور)

خواتین گھنے بال رکھتی ہیں۔ لہٰذا روزانہ ان کے ۵۰ تا ۱۰۰ بال گرنا معمول کی بات ہے۔ اگر اس تعداد سے زیادہ بال گرنے لگیں، تو یہ درست نہیں۔ خوش قسمتی سے بال گرنے و ٹوٹنے سے بچانے والے عمدہ ٹوٹکے مروج ہیں۔

قدرتی علاج یہ ہے کہ ایک درمیانہ پیاز لیجیے اور اسے اتنا کاٹیے کہ اس کا رس نکل سکے۔ یہ رس بالوں پہ لگائیے اور انھیں ڈیڑھ گھنٹہ تک کھلا چھوڑ دیں۔ پھر عمدہ شیمپو سے بال دھوئیے اور انھیں ہوا میں خشک ہونے دیں۔ یہ ٹوٹکا ہفتے میں دو بار استعمال کیجیے۔ امید ہے، بال گرنے کی تعداد کم ہو جائے گی۔

واضح رہے کہ خواتین کے بال مختلف وجوہ کی بنا پر گرتے ہیں مثلاً حمل، ذہنی دباؤ، پریشانی، ہیجنگ، بیماری اور مرگی چھوٹ۔ اگر بال گرنا وراثت میں ملا ہے، تو ڈاکٹر کے مشورے سے مائنوکسیڈل (Minoxidil) دوا استعمال کیجیے۔

مزید قدرتی علاج یہ ہے کہ ورزش کیجیے جو سر سمیت پورے جسم میں خون کی روانی بڑھاتی ہے۔ سر پہ زیتون یا آملے کا تیل لگائیے، یوں بالوں کو غذائیت ملتی ہے۔

انڈا بھی گرتے بالوں کی خرابی دور کرتا ہے۔ ایک انڈے کی سفیدی لیجیے اور اس میں زیتون کے تیل کی ایک چمچی ڈال لیجیے۔ آمیزہ اچھی طرح ملائیے اور پھر سر پہ لگائیے۔ پندرہ منٹ بعد ٹھنڈے پانی اور عمدہ شیمپو سے دھو لیجیے۔ امید ہے یہ ٹوٹکا کارگر ثابت ہو گا۔

توجہ فرمائیے

قارئین اپنا مسئلہ ڈاک سے بھجوانے کے علاوہ موبائل نمبر ۰۳۰۳-۲۲۸۰۸۱۴ پر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ اپنا نام اور شہر کا نام ضرور لکھیے۔ درج بالا نمبر پر میسج صرف وصول کیے جاتے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

دستوں میں خون

میرا بیٹا ۱۰ ماہ کا ہے۔ وہ ہر دو ہفتے بعد ایسے دست کرتا ہے جن میں خون آتا ہے۔ یہ خرابی کیسے دور ہوگی؟

(جاوید اکبر، لالہ موسیٰ)

دست میں خون آنا خطرے کی نشانی ہے اور اس خلل کی اصل وجہ طبی معائنے سے ڈاکٹر ہی دریافت کر سکتا ہے۔ عموماً قبض یا سخت پاخانہ آنے سے مقعد میں زخم ہو جاتا ہے۔ وہاں سے نکلتا خون پھر پاخانے یا دست میں شامل ہوتا ہے۔

بچے کا نظام ہضم خراب ہو، تبھی وہ ہر پندرہ دن بعد دست کرتا ہے۔ تب بعض ناپسندیدہ غذاؤں کے ردعمل سے بھی آنتوں سے نکلا خون دست میں شامل ہو سکتا ہے۔ بہرحال مشورہ یہی ہے کہ آپ پہلی فرصت میں بچے کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جائیے۔ وہ بہتر مشورہ دے گا۔

کبوتر کی بیٹ

ہمارے گھر میں کافی چھجے بنے ہیں جہاں کبوتر بسیرا کر چکے۔ ان کی بیٹیں سارے صحن کو گندا کر دیتی ہیں۔ کبوتر بھگانے کا ٹوٹکا بتائیے۔ (عظیم خان، کوئٹہ)

کبوتروں سے انسانوں کو بعض بیماریاں منتقل ہوتی ہیں۔ ان میں پھیپھڑوں کو نشانہ بنانے والی ہسٹوپلازموسس (Histoplasmosis)، شدید بخار پیدا کرنے والا مرض پسیٹاکوسس (Psittacosis) اور ایڈز جیسی خصوصیات رکھنے والی بیماری کرپٹوکوکسس (Crptococcsis) شامل ہیں۔

غذا اور پناہ گاہ — کبوتر عموماً ان دونوں چیزوں کی مدد سے پلتے بڑھتے ہیں۔ لہٰذا گھر کے چھجوں میں لٹکے کبوتروں کو دانہ نہیں ڈالیے اور نہ ہی کوئی اور غذا دیجیے۔ دوسرا قدم یہ اٹھائیے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیجیے، کبوتر چھجوں میں بسیرا نہ کر سکیں۔

مثال کے طور پر تاریں لگا کر چھجے بند کریں یا وہاں اینٹیں رکھ دیں۔ غرض ایسی تدبیر کیجیے کہ کبوتر چھجوں پر نہ بیٹھ سکیں۔ غذا اور پناہ گاہ سے محروم ہونے کے بعد کبوتر خود بخود چلے جائیں گے۔ یوں آپ کو بدبودار بیٹوں سے بھی نجات مل جائے گی۔

شدید قبض

میں شدید قبض کا شکار ہوں۔ قسم قسم کے علاج کر لیے مگر کم ہی فائدہ ہوا۔ آپ ہی کوئی مشورہ دیجیے۔

(مسرت نجم، راولپنڈی)

انسان کو جب ہفتے میں صرف ایک بار پاخانہ آئے، تو وہ شدید قبض کا نشانہ بنتا ہے۔ تقریباً ہر بیماری کی طرح قبض ہونے کی مختلف وجوہ ہیں۔ آپ ڈاکٹروں سے طبی علاج کرا چکیں، لہٰذا اب قدرتی نسخے آزما کر دیکھیے۔ قبض دور کرنے والے قدرتی ٹوٹکے درج ذیل ہیں۔

ڈیڑھ چمچ اسپغول ایک گلاس پانی میں ملائیے۔ پانی دو گھنٹے کے لیے محفوظ مقام پر رکھ دیں۔ پھر پانی میں آدھا چمچ شہد اور ایک لیموں کا عرق ملائیے اور نوش کیجیے۔

ایسی غذائیں کھائیے جن میں فائبر یا ریشہ ہو۔ مثلاً مٹر، چھلکوں والی دالیں، بند گوبھی، ناشپاتی اور سیب بنا چھیلے کھائیں۔

صبح سویرے ایک چمچ زیتون کے تیل میں ایک چمچ لیموں کا عرق ملائیے اور پی جائیے۔ یہ آمیزہ خالی پیٹ لینا ضروری ہے۔ چند دن استعمال سے افاقہ ہوگا۔ یہ نسخہ نظام ہاضمہ متحرک رکھتا ہے۔ یوں قبض سے چھٹکارا ملتا ہے۔

ایک تازہ لیموں کا عرق نیم گرم پانی کے گلاس میں

ڈالیے اور نوش کیجیے۔ یہ پانی جسم کے زائد مادے نکال پھینکتا ہے۔

اپنے آپ کو متحرک رکھیے۔ دن کا بیشتر حصہ بیٹھ کر گزارنے سے عموماً قبض چمٹ جاتی ہے۔

کھانے کا (بیکنگ) پاؤڈر میٹھا سوڈا قبض سے عارضی نجات پانے کا عمدہ نسخہ ہے۔ ایک چوتھائی پانی (۱/۴) کے گلاس میں ایک چٹکی میٹھا سوڈا ملائیے اور فوراً پی جائیے۔ یہ معدے میں دباؤ ختم کر کے طبیعت ہلکی کر دیتا ہے۔

سوکھے آلو بخارے کا رس لیجیے۔ ایک گلاس صبح اور ایک گلاس رات کو نوش کریں۔ چند دن بعد دیکھیے افاقہ ہو گا۔ آپ سوکھے آلو بخارے کے بجائے سات دانے کھا بھی سکتی ہیں۔

گرونڈے کے پتوں سے بنی چائے پیجیے۔ دو چمچ پتے لیجیے۔ انھیں ایک پیالی میں ڈالیے اور اوپر سے ابلتا پانی ڈال دیجیے۔ پیالی ڈھک کر دس منٹ انتظار کیجیے پھر یہ چائے پی لیجیے۔ اگر قبض شدید ہے، تو یہ چائے صبح، دوپہر اور شام پیجیے۔ ان شاء اللہ چند دن میں افاقہ ہو گا۔

> آپ ردی (Junk) غذا کھا کر وزن نہ بڑھائیے بلکہ صحت بخش خوراک کھائیے ..... ایسی غذا جو آپ کو غذائیت اور حرارے فراہم کرے۔

بچی تنگ کرتی ہے

میں ایک دو سالہ بچی کی ماں ہوں۔ وہ کھانے پینے کے معاملے میں بہت تنگ کرتی ہے۔ اکثر کھایا پیا اگل دیتی ہے۔ اس مسئلے کا کوئی حل بتائیے۔

(بیگم فریدہ مرزا، کوئٹہ)

دو سے پانچ سال کے بچے من موجی ہوتے اور اپنی مرضی چلاتے ہیں۔ خاص طور پر وہ چاہتے ہیں کہ اپنی مرضی سے کھائیں پئیں۔ اسی لیے اگر آپ کی پیاری بچی صحت مند ہے اور اس کی نشوونما معمول کے مطابق جاری ہے، تو پریشان نہ ہوں۔ یہ اعتماد رکھیے کہ بچی کو جب بھی بھوک لگی، وہ خود کھانا مانگے گی۔ لہٰذا اسے زبردستی کوئی غذا نہ کھلائیے۔ مزید برآں بعد میں بھی یہ سوچ کر اسے زائد غذا نہ دیں کہ اس نے ایک وقت کا کھانا نہیں کھایا۔

اس کے علاوہ بچی جو اشیا کھانا پسند کرتی ہے، اسے وہ کھلائیے۔ ذرا سوچیے، آپ کو جو غذائیں پسند نہیں، اگر کوئی زبردستی وہی آپ کو کھلانا چاہے، تو یقیناً آپ ناگواری محسوس کریں گی۔ لہٰذا بچی کو کھانے پینے کے معاملے میں کچھ اختیار دیجیے، صورت حال بہتر ہو جائے گی۔

بچی کچھ نہیں کھاتی پیتی

میں دس ماہ کی بچی کا باپ ہوں۔ میری بچی دودھ پینے کے علاوہ کچھ نہیں کھاتی پیتی۔ کیا یہ تشویش ناک بات ہے؟ (سجاد احمد خان، گڑھی)

چھے سے بارہ ماہ کی عمر کے بچے بچیاں دودھ کو ٹھوس غذا پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ چوسنی سے دودھ پینا آسان ہے۔ جبکہ غذا کو چبا کر نگلنا مشکل لگتا ہے۔ اگر آپ کی بچی مطلوبہ مقدار میں ماں یا ڈبے کا دودھ پی رہی ہے، تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

دس ماہ کی بچی کو روزانہ فی پونڈ وزن کے لحاظ سے ۲۰ اونس دودھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیشتر بچے بچیاں ۲۴ تا ۳۲ اونس پیتی ہیں۔ یہ دودھ وٹامن اور معدنیات کی مطلوبہ ضرورت پوری کر دیتا ہے۔ چناں چہ بچوں کی ٹھوس غذا نہ کھانے والی "ہڑتال" سے انھیں کوئی بھی نقصان نہیں پہنچتا۔

www.pdfbooksfree.pk

زندگی کے پہلے سال نشوونما کے لیے درکار بیشتر حرارے بچے کو چکنائی (Fat) سے ملتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ماں کے دودھ کا ۵۰ فیصد حصہ چکنائی پر مشتمل تخلیق کیا ہے۔ اگر والدین یہ دیکھیں کہ بچے یا بچی کی نشوونما سست ہو چکی، تو اسے دودھ کے ساتھ کوئی چکنائی والی شے بھی دیں۔ مثال کے طور پر دودھ کی ہر بوتل میں آدھی چمچی السی کا تیل شامل کر دیں۔ یہ تیل بچے کو روزانہ ۸۰ زائد حرارے دے گا۔

ٹھوس غذا پسند نہ کرنے والے بچے بچیوں کو ایسا کھانا دیجیے جو غذائیت سے پُر ہو، مثلاً دہی، انڈا (ایک سال کا ہونے پر)، گاجر اور السی کا تیل۔

بعض اوقات بچے بازار سے دستیاب بچوں کے لیے مخصوص کھانے نہیں کھاتے۔ ایسی صورت میں والدین یہ کریں کہ ان بچوں کو وہی کھلائیں جو خود کھاتے ہیں۔ یعنی تازہ پھل، پکی ہوئی سبزیاں، چربی سے پاک گوشت اور مچھلی۔ اس غذا کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بچہ شروع سے گھر کا پکا کھانا بہ رغبت کھانے لگتا ہے۔ اسے پھر بازاری کھانے پسند نہیں آتے جو عموماً بچوں کو فربہ کر کے انھیں ذیابیطس میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

پیٹ میں کیڑے

میرے بھانجے بھانجیوں کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ اس وجہ سے وہ بیمار رہتے ہیں۔ ان کے خاتمے کا کوئی طریقہ بتائیے۔ (سعدیہ انصاری، کراچی)

پیٹ کے کیڑوں کی پانچ مختلف اقسام ہیں۔ یہ کیڑے جانوروں میں پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا گوشت کھانے سے انسانی معدے میں بھی آ پہنچتے ہیں۔ ان کی وجہ سے انسان پیٹ درد، دست، بخار، جسمانی کمزوری، تھکن وغیرہ کا شکار رہتا ہے۔

آپ نے بچوں کی عمریں نہیں لکھیں اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ ان کے پیٹ میں کیڑوں کی کون سی قسم تنگ کر رہی ہے۔ بہرحال ذیل میں کیڑے مارنے کے قدرتی نسخے پیش ہیں:

٭ بچوں کو صبح ناشتے میں ایک چمچ باریک کٹا ناریل کھلائیے۔ ڈھائی تین گھنٹے بعد ایک گلاس نیم گرم دودھ میں دو چمچ ارنڈ کا تیل (کیسٹر آئل) ملائیے اور بچوں کو پلائیے۔ لیکن بچوں کی عمر ۵ سال سے کم ہے تو ارنڈ کا تیل نہ دیجیے۔

٭ ایک چمچ پپیتے کے گودے میں ایک چمچی خالص شہد ملائیے۔ یہ آمیزہ صبح سویرے خالی پیٹ بچوں کو کھلائیے۔ کچھ دیر بعد انھیں گرم دودھ پلائیے اس میں ایک چمچی ارنڈ کا تیل ملا دیں۔ یہ عمل دو تین دن کیجیے۔

پیٹ کے کیڑے مارنے والی ایلوپیتھک ادویہ بھی دستیاب ہیں تاہم وہ زہریلی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کا زہر ہی کیڑے مارتا ہے۔ مزید برآں خصوصاً بچوں میں ان کے منفی اثرات بہ شدت ظاہر ہوتے ہیں۔

موٹا ہونا چاہتا ہوں

میں کمزور بدن کا مالک ہوں۔ فربہ ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے مشورہ دیجیے۔ (یاسر، بہاولپور)

لوگوں کی اکثریت یہ خواہش رکھتی ہے کہ وہ دبلے ہو جائیں، مگر آپ کی خواہش برعکس ہے۔ بہرحال آپ ردی (Junk) غذا کھا کر وزن نہ بڑھائیے بلکہ صحت بخش خوراک کھائیے۔ ایسی غذا جو آپ کو غذائیت اور حرارے فراہم کرے۔

مثال کے طور پر صبح ناشتے میں روٹی، انڈا اور کیلا کھائیے۔ دوپہر کو معتدل مقدار میں گوشت لیں۔ رات کے وقت سبزی لیجیے۔ ساتھ ساتھ دودھ اور مشروبات کا

www.pdfbooksfree.pk

استعمال بھی جاری رکھیے۔ سبزیوں میں آلو، شکرقند، پالک اور گوبھی غذائیت کا خزانہ ہیں۔

مزید برآں دن میں پانچ چھے بار غذا کھائیے تاکہ اپنا وزن بڑھا سکیں۔ عضلات کی موٹائی بڑھانے کے لیے مرغ اور مچھلی کا گوشت کھائیے۔ امید ہے کہ درج بالا تجاویز پر عمل کرنے سے دو تین ماہ میں آپ کا وزن خاطر خواہ بڑھ جائے گا۔

حساس بہن

میری بڑی بہن ۲۸ سال کی ہیں۔ ان کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ وہ بہت حساس ہو چکیں۔ معمولی بات پر رو پڑتی ہیں۔ غصہ آئے، تو چیزیں اٹھا کر مارتی ہیں۔ ان کا کچھ علاج بتائیے۔ (مریم، جہلم)

آپ کی بہن ڈپریشن کا شکار ہیں۔ اس صورت حال میں ضروری ہے کہ اہل خانہ ان کی دلجوئی کریں اور ایسی کوئی حرکت نہ ہونے دیں جس سے بہن مشتعل ہو جائیں۔ نیز بہن کی شادی کا بندوبست کیجیے۔ اگر اہل خانہ نے ان کی دیکھ بھال نہ کی، تو معاملہ بگڑ کر شیزوفرینیا تک پہنچ سکتا ہے۔

ایک حل یہ ہے کہ انھیں اچھے نفسیات دان کے پاس لے جائیے۔ بعض اوقات ادویہ کھانے سے ڈپریشن دور ہو جاتا ہے۔ آپ بہن سے بول چال رکھیے۔ ان کے ساتھ مختلف اِنڈور کھیل مثلاً لڈو کھیلیں اور انھیں زندگی سے پیار کرنا سکھائیے۔ اگر ڈپریشن کی مریضہ اہل خانہ کی مدد نہ لے، تو حالت بگڑتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا بہن پر توجہ دے کر آپ ایک قیمتی زندگی محفوظ کر سکتی ہیں۔ اور بہن کے ناز نخرے بھی اٹھانے پڑیں، تو اٹھائیے۔

کمر میں درد

مجھے ماہ قبل میرا بیٹا تولد ہوا۔ تب سے میری کمر میں درد چلا آرہا ہے۔ یہ کیسے دور ہوگا؟

(بیگم علی اختر، سیالکوٹ)

حمل کے دوران اور بعد میں کمر درد ہونا معمول ہے۔ تحقیق کے مطابق ۵۰ فیصد حاملہ خواتین کمر درد کا نشانہ بنتی ہیں۔ آپ اپنی تکلیف سے نجات کے لیے درج ذیل اقدامات کیجیے:

☆ ورزش کیجیے۔ اس ضمن میں معتدل رفتار میں پیدل چلنا سود مند ہے۔ تاہم درد بڑھ جائے تو زبردستی نہ چلیے، ورنہ کمر کے پٹھوں میں مزید اکڑن ہوگی۔ شروع میں آہستہ چلیے، پھر رفتار بڑھاتی جائیے۔ کمر کی ورزشیں بھی کر سکتی ہیں۔

☆ نرمی سے کمر کی مالش کیجیے۔ اس ضمن میں زیتون یا سرسوں کا تیل استعمال کر سکتی ہیں۔ تاہم مالش کا دورانیہ زیادہ طویل نہیں ہونا چاہیے۔

☆ کمر پر گرم پانی کی ٹکور کیجیے۔ لیکن پانی زیادہ گرم نہ ہو۔

☆ کمر کے پٹھوں میں زیادہ کھچاؤ ہو تو ان پر دوا چھڑکیے یا آرنیکا (Arnica) کریم لگائیے۔

☆ درج بالا تراکیب آزمانے کے باوجود کمر درد برقرار رہے تو ڈاکٹر سے رجوع کیجیے۔

سانس اور جلد کے امراض

ایلوویرا کے فوائد بتائیے۔ کیا یہ سانس اور جلد کے امراض میں مفید ثابت ہوتی ہے؟ (عالیہ علی، تربت)

اردو میں ایلوویرا کو گوار گندل کہتے ہیں۔ یہ ایسا پودا ہے جس کے پتوں میں گودا ہوتا ہے۔ جدید طبی تحقیق کے مطابق یہ گودا وٹامن اے، سی، ای اور فولک ایسڈ کا حامل ہے۔ اس میں انسانی صحت کے لیے مفید امائنو ایسڈ بھی ملتے ہیں۔ اسی لیے اب یورپ میں اس کا گودا بطور سلاد

www.pdfbooksfree.pk

کھایا جا رہا ہے۔ یہ نظامِ ہضم کو تقویت پہنچاتا اور قبض دور کرتا ہے۔ نیز بدن کے فاسد مادے نکال پھینکتا ہے۔

گودے سے جیلی جیسا مادہ نکلتا ہے۔ اسے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایلوویرا کے پتے کا بالائی حصہ چھیل لیں۔ نیچے سے جیلی نما مادہ نکل آئے گا۔ یہ مادہ جلد کے لیے مفید ہے۔ چہرے پر دانے یا داغ دھبے ہوں تو ایک ہفتے تک یہ مادہ معتدل مقدار میں لگائیے۔ چہرہ پہلے سے زیادہ صاف اور نکھرا نظر آئے گا۔

ایلوویرا سانس کی بیماریوں خصوصاً دمے میں بھی مفید ہے۔ استعمال کا طریق کار یہ ہے کہ ایک چھوٹی پتیلی میں پانی ابالیے۔ جب پانی ابلنے لگے، تو اس میں ایک چمچ ایلوویرا کی جیلی ملا دیجیے۔ اب اس پانی کی بھاپ لیجیے۔ ایلوویرا کے مفید اجزا سانس کی نالیاں کھول دیں گے۔ یوں سانس لینے میں دشواری نہیں رہے گی۔

اگر گلا خراب ہے، تب بھی ایلوویرا کام دیتا ہے۔ گرم پانی میں ایک چمچ جیلی ملائیے۔ پھر اس میں نمک ملانے کے بعد غرارے کیجیے۔ چند بار یہ عمل کرنے سے گلا ٹھیک ہو جائے گا۔

بھولنے کی بیماری

مجھے بھولنے کا مرض لاحق ہے۔ کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ کیا میری یادداشت درست ہو سکتی ہے؟!

(عاقل عمر، سکھر)

سر پر چوٹ لگنے یا کسی صدمے کے باعث یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ اس خلل کا کوئی ادویاتی علاج نہیں کیونکہ اب تک یادداشت قوی کرنے والی دوا ایجاد نہیں ہو سکی۔ البتہ بعض غذائیں مثلاً ثابت اناج، مچھلی، ٹماٹر، بادام، اخروٹ وغیرہ دماغی طاقت میں اضافہ کرتی ہیں۔

آپ کسی ڈاکٹر سے اپنا طبی معائنہ کرائیے۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ بھولنے کا مرض کسی جسمانی چوٹ کا نتیجہ ہے یا جذباتی صدمے سے پیدا ہوا۔ تشخیص کے مطابق وہ پھر علاج بھی تجویز کرے گا۔

گلا خراب رہتا ہے

میرا گلا ہر ایک دو ہفتے بعد خراب ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کے متعلق کچھ بتائیے۔

(نسیم، میرا، ڈیرہ غازی خان)

گلے کا عام درد چھوت کے باعث جنم لیتا اور عموماً ایک دو ہفتے میں کافور ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ کا مرض کسی سنگین مسئلے کی سمت اشارہ کر رہا ہے۔ یاد رہے، مسلسل گلا خراب رہنا سرطان چمٹنے کی نشانی بھی ہے۔ لہٰذا جلد فرصت میں ڈاکٹر سے اپنے گلے کا معائنہ کرائیے۔

بال سفید ہو چکے

میری عمر ۲۱ سال ہے۔ میرے بال سفید ہو رہے ہیں، جبکہ نظر بھی کمزور ہو چکی۔ تندرستی کے لیے مشورہ دیجیے۔ (ذیشان حسن، قصور)

بال عمر کے کسی بھی دور میں سفید ہو سکتے ہیں۔ وجہ یہ کہ بالوں کی تھیلیوں (Follicles) میں موجود خلیے انھیں رنگ بخشتے ہیں۔ جب یہ خلیے کسی وجہ سے اپنا کام کرنا چھوڑ دیں، تو بال بے رنگ ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر ہمیں سفید نظر آتے ہیں۔ عموماً ذہنی دباؤ اور ناقص غذا کے سبب تھیلیوں کے خلیوں میں خرابی جنم لیتی ہے۔ لہٰذا پرسکون ہونے، پریشانیوں سے بچنے اور غذائیت سے بھرپور کھانے کے ذریعے مزید سیاہ بالوں کو بے رنگ ہونے سے روکنا ممکن ہے۔

نوجوانی میں نظر کمزور ہونے کی مختلف وجوہ ہیں۔ مثال کے طور پر رات دیر تک جاگنا، طویل دورانیے تک ٹی وی

www.pdfbooksfree.pk

دیکھنا، وٹامن اے کی کمی، ناقص غذا کھانا، ہر وقت پریشان رہنا وغیرہ۔ کمزوری نظر کے سلسلے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ خلل کیوں پیدا ہوا۔ بہرحال بینائی بہتر کرنے کے لیے درج ذیل نسخے آزمائیے۔

٭ بادام، سونف اور مصری ہم وزن لیں اور تینوں کو کوٹ لیں۔ سفوف پھر کسی بوتل میں رکھیے۔ ہر رات کو ایک چمچ یہ سفوف ایک گلاس دودھ میں ملائیے اور پی جائیے۔ یہ عمل چالیس دن تک انجام دیجیے۔ امید ہے، نظر بہتر ہو جائے گی۔

رات کو ۱۰ تا ۱۵ بادام ایک گلاس پانی میں بھگوئیے۔ صبح سویرے باداموں کا چھلکا اتاریے اور اچھی طرح چبا کر کھائیے۔ بعدازاں دودھ کا گلاس بھی پی سکتے ہیں۔

ذیابیطس سے چھٹکارا

ذیابیطس کا مریض ہوں۔ پیروں کی انگلیوں میں اکثر درد رہتا ہے۔ اس کا علاج بتائیے

(خالد قریشی، لاہور)

> گرم مالش بافتوں کی اینٹھن دور کرتی ہے۔ جبکہ ٹھنڈک ان کا درد اور سوزش بھگاتی ہے۔

ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں میں درد اور سنسناہٹ ہونا ذیابیطس کی واضح علامت ہے۔ گو یہ درد کیوں جنم لیتا ہے، ماہرین اس کی وجہ دریافت نہیں کر سکے۔ تاہم انھیں یہ ضرور معلوم ہے کہ انگلیوں میں واقع بافتوں (connective tissues) کے سخت ہونے اور اکڑنے سے درد جنم لیتا ہے۔

ہمارے جسم میں واقع بافتیں رباط (ligamints) اور نسوں (Tenddons) پر مشتمل ہیں۔ انھی کے ذریعے ہمارا ڈھانچہ قائم و دائم رہتا ہے۔ یہ بافتیں لچک دار پروٹینی مادے، کولاجن سے بنی ہیں۔ جب کولاجن مادہ سخت ہو جائے، تو ہمارے جسمانی جوڑ صحیح طرح اپنا کام نہیں کر پاتے اور تکلیف دینے لگتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ جب ذیابیطس انسان کو چمٹے، تو خون میں شکر کی بلند سطح پروٹینی مادوں کا قدرتی توازن بگاڑ دیتی ہے۔ یا پھر سوزش پیدا کرنے والا کوئی عمل یہ توازن خراب کرتا ہے۔ بہرحال ذیابیطس میں کولاجن سخت ہونے سے ہاتھ پیروں کی انگلیوں میں سنسناہٹ اور تکلیف ہوتی ہے۔

اس تکلیف کا علاج یہی ہے کہ صبح سویرے انگلیوں کی ورزش کیجیے اور انھیں ہلائیے۔ شروع میں شاید کچھ تکلیف ہو مگر ورزش عادی ہونے پر جاتی رہے گی۔ اگر انگلیوں کو ہلایا جلایا نہ جائے، تو جوڑوں کی سختی بڑھتی جاتی ہے۔

گرم مالش بافتوں کی اینٹھن دور کرتی ہے۔ جبکہ ٹھنڈک ان کا درد اور سوزش بھگاتی ہے۔ لہٰذا انگلیوں کو گرم مالش اور ٹھنڈک، دونوں دے کر دیکھیے، کس ایک عمل سے افاقہ ہوتا۔

دیگر مشورے یہ ہیں۔ انگلیوں کی مالش کیجیے۔ (تاہم زیادہ درد ہو تو نہ کریں)۔ مالش سے عضلات تک تازہ آکسیجن اور غذائیت پہنچتی ہے۔ بھاری وزن اٹھانے سے بچیے اور خون میں شکر کی سطح متوازن رکھیے۔

کمزوری نظر کا علاج

میری نظر کمزور ہے۔ بادام، سونف اور مصری کا مرکب کھایا، مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ نظر تیز کرنے کے لیے تجاویز دیجیے۔ (بیگم ذوالفقار شاہ، پشاور)

جب ایک دفعہ نظر خراب ہو جائے، تو اُسے صرف آپریشن کے ذریعے ہی تقریباً ۱۰۰ فیصد درست کرنا ممکن ہے۔ اگر آپریشن نہیں کروانا، تو پھر طرزِ زندگی میں

www.pdfbooksfree.pk

تبدیلیاں لا کر نظر تیز کی جا سکتی ہے۔ لیکن بادام کھانا محض ایک عمل ہے۔ طرزِ زندگی مکمل طور پر بدلے بغیر اس نسخے سے فائدہ نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر ردی (Junk) غذا کھانا، مسلسل ٹی وی یا کمپیوٹر پر بیٹھنا، آنکھوں کی ورزش نہ کرنا، فکرمند رہنا۔ یہ تمام اعمال ہماری بینائی پر منفی اثرات ڈالتے ہیں۔ ایسی صورت میں محض بادام و سونف کھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

لہٰذا میری بہن، ایسی غذائیں کھائیے جن سے جسم و وٹامن اے، سی اور ای، اومیگا تھری فیٹی تیزابیت، اور لیوٹین میسر آئیں۔ یہ تمام غذائی عنصر بینائی کی حفاظت کرتے ہیں۔

دوسرے ٹی وی اور کمپیوٹر دیکھنا ہی ہے، تو مسلسل نظریں نہ جمائیے۔ ہر ۲۰ منٹ بعد ۲۰ سیکنڈ کے لیے ۲۰ فٹ دور موجود کسی شے کو دیکھیے۔ یہ چھوٹی سی ورزش بینائی طاقتور رکھتی ہے۔ آپ ماہر امراضِ چشم سے پوچھ کر آنکھوں کی دیگر ورزشیں بھی کر سکتی ہیں۔ یہ بینائی کو تقویت پہنچاتی ہیں۔

اچھی غذا کھانے، سات آٹھ گھنٹے نیند لینے، فکر و پریشانی سے دور رہنے اور آنکھوں کی ورزشیں کرنے سے آپ اپنی بینائی ٹھیک کر سکتی ہیں۔

اعضا سن رہتے ہیں

میرے جسم کے کئی اعضا عموماً سن رہتے ہیں۔ کئی ادویہ کھا چکا مگر آرام نہیں آیا۔ آپ کوئی مشورہ دیجیے۔
(جاوید صدیقی، مانسہرہ)

اعضا میں سنسناہٹ اور درد ہونا کئی وجوہ سے جنم لیتا ہے۔ مثلاً ذیابیطس، جسم میں غذائیت (وٹامن، معدنیات) کی کمی، نسوں کو ضرب پہنچنا، شریانوں (Arteries) کا سخت ہونا وغیرہ۔ لہٰذا آپ سب سے پہلے کسی اچھے ڈاکٹر سے ملیے تاکہ وہ اعضا سن ہونے کی وجہ جان سکے۔ تب ہی اس کا شافی علاج ہو سکے گا۔

عام طور پر یہ سنسناہٹ بدن میں وٹامن بی ۱۲ کی کمی سے ہوتی ہے۔ لہٰذا طبی معائنے سے یہ وجہ دریافت ہو گی۔ فولاد کی کمی بھی یہی اثرات پیدا کرتی ہے۔

قبض کا مرض

مجھے اکثر قبض رہتی ہے۔ اس سے چھٹکارے کا طریقہ بتائیے۔
(مجتبیٰ احمد، ہری پور)

قبض ایک موذی بیماری ہے جو شدید ہونے پر انسان کو کسی کام کے قابل نہیں چھوڑتی۔ بہرحال اس مرض سے چھٹکارے کے لیے کچھ مشورے شروع میں بتائے جا چکے، مزید تجاویز درج ذیل ہیں:

سب سے پہلے تو خوراک میں ریشے والی (Fiber) غذائیں زیادہ رکھیے مثلاً خوبانی، پھلیاں، آلو (چھیلیں نہیں) ثابت اناج اور گوبھی۔ ریشہ آنتوں میں غذاؤں کو چپکنے نہیں دیتا اور یوں پاخانہ ٹھیک آتا ہے۔

قبض سے نجات پانے کا ایک اور قدرتی طریقہ یہ ہے: کینو کا ایک گلاس رس لیجیے۔ اس میں کینوؤں کا گودا بھی ڈال دیجیے۔ اس رس میں ایک چمچ السی کا تیل ملائیے اور پی جائیے۔ پانچ چھے گھنٹے بعد آپ افاقہ محسوس کریں گے۔

طرزِ زندگی میں یہ تبدیلی لائیے یعنی حرکت کیجیے اور زیادہ دیر نہ بیٹھیے۔ صبح سویرے ورزش کیجیے، یہ قبض کا موثر قدرتی علاج ہے۔ نیز پانی خوب نوش کیجیے۔ جسم میں پانی کی فراوانی آنتوں میں فضلہ نہیں جمنے دیتی۔ موسم ہو تو آلو بخارا کھائیے، یہ بھی قبض دور کرتا ہے۔ یہ تجاویز اختیار کر کے آپ قبض سے نجات پا سکتے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

خوشی اور غم زندگی کا حصہ ہیں۔ انسان تنہا زندگی نہیں گزار سکتا، وہ کسی نہ کسی خاندان، قبیلے، گاؤں، شہر اور ملک سے منسلک ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے بہت ساری خوشیاں اور غم بھی اجتماعی ہوتے ہیں۔ خوشی کے کچھ تہواروں کی نوعیت ہے مثلاً عید یا کرسمس۔ لیکن یہاں ایسے تہواروں کے بارے میں آپ کو آگاہ کیا جا رہا ہے جو خاصی حد تک غیر مذہبی ہیں اور ان کی ثقافتی روایت بہت قدیم ہے۔

سعودی عرب

عام تاثر یہ ہے کہ سعودی عرب میں زندگی مذہب کے گرد گھومتی ہے۔ یہ تاثر ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن عرب اسلام سے پہلے بھی توانا ثقافتی روایت رکھتے تھے۔ وہ ان کا آج بھی فخر سے ذکر کرتے ہیں۔ آپ نے سوق

ہنسی، قہقہوں اور کھیلوں سے سجے

دنیا کے رنگ برنگے تہوار

روزمرہ معمول سے اکتائے لوگوں کو مسرت و خوشی کی انمول گھڑیاں عطا کرنے والے تحفے

محمد خلیل چودھری

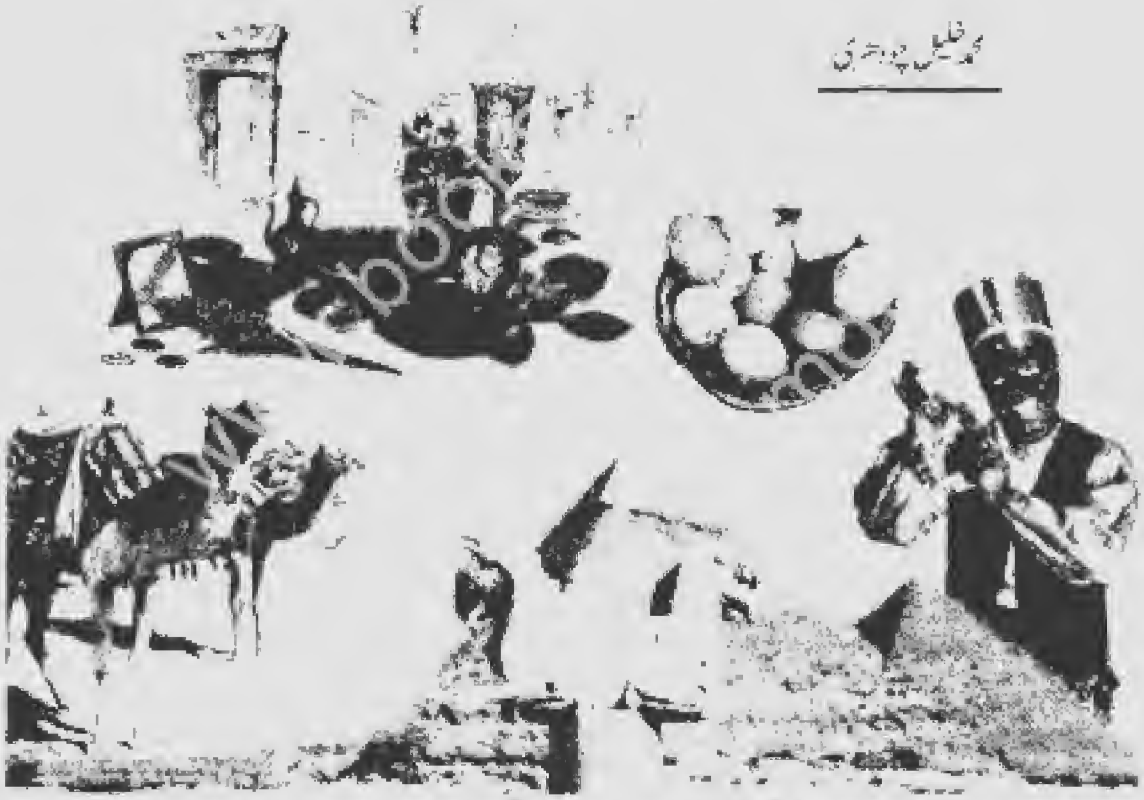

www.pdfbooksfree.pk

عکاظ کا نام سنا ہو گا۔ یہ ایک سالانہ میلا نما بازار تھا جو طائف میں لگتا۔ بہت قدیم وہاں دو چیزیں بہت اہم تھیں: ایک تجارت اور دوسری شاعری۔

جب یہ بازار لگتا، تو وہاں نامی گرامی شعرا اپنے اپنے قصیدے سناتے۔ اس شاعرانہ مقابلے کے باقاعدہ جج ہوتے۔ اول آنے والے قصیدے کو خانہ کعبہ کی دیوار پر ایک سال کے لیے لٹکا دیا جاتا۔ وہ تمام شاندار قصیدے جنھیں یہ شرف حاصل ہوا، انھیں شوق سے "معلقات" کہا جاتا ہے۔ عربی شاعری سے شغف رکھنے والے آج بھی معلقات شوق سے پڑھتے ہیں۔ کوئی دو سال پہلے کی بات ہے، اخباروں میں آیا کہ مکہ المکرمہ کے گورنر، شہزادہ خالد الفیصل سوق عکاظ کا احیا چاہتے ہیں۔ وہ خود بھی نامور شاعر ہیں۔ عرب معاشرے میں شروع سے شعرا کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

حال ہی میں مرحوم ہونے والے شاہ عبداللہ جب ولی عہد تھے، تو انھوں نے ریاض کے قریب واقع علاقہ جنادریہ میں لوک میلے کا آغاز کیا۔ یہ ثقافتی میلا دو ہفتے چلتا۔ اس میلے کا سب سے دلچسپ آئٹم اونٹوں کی دوڑ تھی۔ اس کے علاوہ لوک موسیقی اور ناچ بھی میلے کا حصہ تھے۔ کھجور اور میدے سے بنا روایتی کیک مہمانوں میں تقسیم ہوتا۔ سعودی لوک ناچ "عرضہ" فتح کا رقص ہے۔ نوجوان لڑکے یہ رقص ہاتھ میں تلوار پکڑ کر کرتے اور ساتھ ساتھ فتح کی خوشی کے گانے گاتے۔

مصر میں شم النسیم کا تہوار بہت اہم ہے۔ اس تہوار کی تاریخ چار ہزار سال پرانی ہے۔ یہ جشن ماہ اپریل میں ایسٹر کے فوراً بعد منایا جاتا ہے۔ یہ بہار کی آمد کا جشن ہے۔ مسلمان اور مسیحی، سب یہ تہوار مناتے ہیں۔ شم النسیم کے لفظی معنی تازہ ہوا میں سانس لینا ہے۔

صاحب تحریر

دینہ کے پر فضا مقام پر جنم لینے والے محمد خلیل چودھری پچھلے ۲۲ برس سے طلبہ کو زیور تعلیم سے آراستہ کر رہے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بھی ہے۔ اسی لیے کتب و رسائل شوق سے خریدتے اور قلم کاری بھی کرتے ہیں۔ اردو ڈائجسٹ سمیت وطن عزیز کے مختلف علمی و ادبی رسائل میں آپ کی تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تحریریں معلومات افروز ہوتی ہیں اور دلچسپ بھی۔

اس دن دریائے نیل میں بے شمار کشتیاں نظر آتی ہیں۔ لوگ خاص طرز کی مچھلی پکاتے ہیں۔ انڈے ابال کر ان کے اوپر رنگ کیا جاتا ہے۔ وہ پھر مہمانوں کو پیش کیے جاتے ہیں۔ قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ کرۂ ارض پر افزائش حیات اسی روز ہوئی تھی۔ تب مصری لوگ انڈے ابال ان کے اوپر دعائیں اور نیک خواہشات لکھ، درختوں پر باندھ دیتے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ اس طرح یہ دعائیں شرف قبولیت پاتی ہیں۔ اب یہ اعتقاد تو بدل چکا البتہ روایت کے طور پر رنگین انڈے اب بھی شم النسیم کا حصہ ہیں۔

جشن نوروز

یہ تہوار ۲۱ مارچ کو منایا جاتا ہے۔ اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، نوروز آمد بہار کی علامت ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ ۲۱ مارچ کو روز و شب کا دورانیہ بالکل برابر رہتا ہے۔ تب سورج برج حوت سے نکل کر برج حمل میں داخل ہوتا ہے۔ نوروز دراصل ایرانی جشن بہاراں ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

لیکن اب یہ افغانستان، پورے وسطی ایشیا اور ترکی کے مشرقی حصے میں بھی منایا جاتا ہے۔

زمانہ قدیم میں مختلف علاقوں کے والی نوروز کے دن شہنشاہ و آریہ مہر کے پاس بیش بہا تحفے تحائف لے کر حاضر ہوتے۔ پورے ملک میں جشن کا سماں ہوتا۔ ان علاقوں میں برف باری خوب ہوتی ہے۔ لیکن آخر مارچ تک برف پگھل جاتی اور سبز رنگ ہر طرف نمایاں ہو جاتا۔ اب تہران، تاشقند اور دوشنبے جیسے شہروں میں اکثریت فلیٹوں میں رہتی ہے۔ لہٰذا لوگ گملوں میں گندم کے بیج ڈال دیتے ہیں۔ نوروز پہ یہ گملے بہاری علامت بن جاتے ہیں۔

تاجکستان کے باشندے خصوصاً رقص و سرود کے دلدادہ ہیں۔ وہاں جشن نوروز کے موقع پر ہر طرف موسیقی کے سر بکھیرے ہوتے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں شوخ رنگوں والی ریشمی قمیصیں پہنتی ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں تاجکستان نیا نیا خانہ جنگی سے نکلا تھا۔ تاجک عمومی طور پر افسردہ تھے۔ کیونکہ دوشنبے میں پچاس ہزار لوگ ہلاک ہو چکے تھے۔ لیکن نوروز جیسے تہوار اور جشن غم بھلانے کا ذریعہ بھی تو ہیں۔ آہستہ آہستہ لوگ جشن نوروز دوبارہ منانے لگے۔ ۲۰۱۰ء میں یونیسکو نے اس تہوار کو انسانی ثقافتی ورثہ قرار دیا۔ یہ جشن اب بہت بڑے خطے میں منایا جاتا ہے۔

پانی کا میلا

رنگون میں آبی میلا (واٹر فیسٹیول) بڑے اہتمام سے برما کے دارالحکومت، منایا جاتا ہے۔ یہ برما کے علاوہ تھائی لینڈ، لاؤس اور کمبوڈیا میں بھی منعقد ہوتا ہے۔ یہ موسمی تہوار ہے۔ اپریل کے وسط میں دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اپریل اس علاقے کا گرم ترین مہینا ہے۔ آبی میلے کے بعد موسم برسات شروع ہو جاتا ہے۔ وہ چھے ماہ جاری رہتا ہے۔ گویا یہ میلا برسات کا استقبال ہے۔

اسی دن لوگ سڑکوں پر نکل کر ایک دوسرے پر پانی پھینکتے ہیں۔ بنکاک میں دریا میں ڈریگن ریس ہوتی ہے۔ یہ ایسی کشتیوں کی دوڑ ہے جو اژدہے کی شکل میں بنائی جاتی ہیں۔ گھر کی پرانی اشیا باہر پھینک یا غریبوں کو دی جاتی ہیں۔ آبی میلے کے تیسرے روز گوتم بدھ کے مجسمے دھوئے جاتے ہیں۔ تازہ دم ہو، کیلے کے پتوں پر رکھ کر بدھ بھکشوؤں کو تحفتاً دیتے ہیں۔

برف کے میلے

کینیڈا میں عجیب و غریب ''کیوبک ونٹر کارنیوال'' منعقد ہوتا اور جلوس کی شکل میں چلتا ہے۔ سخت سردی کے موسم میں یہ پریڈ رات کو ہوتی ہے۔ کینیڈا میں پانچ ماہ سخت سردی پڑتی اور ہر طرف برف ہی برف دکھائی دیتی ہے۔ یہ کارنیوال کیوبک شہر میں ہوتا ہے۔ لوگ برف سے مجسمے بناتے ہیں۔ مختلف فلوٹ کارنیوال میں آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ لوگ رقص و سرود میں مشغول ہوتے ہیں۔

دراصل کینیڈین طویل موسم سرما کے دوران گھر بیٹھ بیٹھ کر اکتا جاتے ہیں۔ لہٰذا موسم کی بوریت ختم کرنے کے لیے سردیوں میں بھی ایک روزہ میلے لگتے ہیں۔ اگر ٹھنڈی ہوا اور دھوپ نکلی ہو، تو برف سے بھی لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ برف کے مجسمے بناتے اور چھوٹی دکانیں لگا کر دستکاریاں بیچتے ہیں۔ اس مارکیٹ کو فلی (Flea) مارکیٹ کہا جاتا ہے۔ ایسی برف کے میلوں کے تناظر میں ایک شعر آپ کی نذر ہے۔

کل دھوپ کے میلے میں خریدے تھے کھلونے
جو موسم کا پتلا تھا، وہ گھر تک نہیں پہنچا

خوشی اور غم زندگی کا حصہ ہیں۔ دنیا کے ہر خطے میں میلے لگتے ہیں تاکہ لوگ خوشیاں منا سکیں اور مزے سے وقت گزاریں۔ دیگر میلوں کا احوال پھر کبھی سہی! ◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

معاشرتی کہانی

اچھی خاصی معقول لگنے والی

وہ لڑکی تو ٹھگ نکلی

دوست کے بھیس میں لٹیرن بنی
ایک دوشیزہ کا عبرت اثر ماجرا

راحت ...

"اوہ آج بھی تھکے ہوئے سے لگ رہے ہیں؟" ثوبیہ نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ مجھے میں نے دن اس کا چہرہ سوال بنا ہوا تھا۔

"نہیں، سر تو نہیں تھکے لیکن آپ پہنچ گئے شکر ہے، دیر سے آئی ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے ایک نظر حمیدی صاحب والے کمرے کے دروازے پر ڈالی اور بے چینی سے [illegible] ثوبیہ سے آج کل پریشانی سے آزادی پا لینے [illegible] بات بات پر [illegible] بیٹھنے کی عادت تھی۔ شاید اسے معلوم تھا کہ وہ [illegible] بہت [illegible] ہے۔

"تمہیں تو معلوم ہے، پہلے [illegible] کروا، پھر دوا میں [illegible] اور وہ [illegible] کے یہاں تک پہنچنا کوئی آسان کام تو نہیں نا؟" اس نے حسب عادت میں بات کرتے کرتے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔

"میں جانتی ہوں "ورکنگ وومن" کے ساتھ یہ مسئلے تو ہوتے ہی ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"معاف کرنا بھئی، میں عورت نہیں لڑکی ہوں۔" اس نے ادا سے کہا اور ہم دونوں ہنس دیے۔

"اچھا لڑکی صاحبہ، مجھے یہ خط ابھی ٹائپ کر کے ارسال کروا دو۔ ویسے کل کا کام بھی پڑا ہے، ورنہ حمیدی صاحب سے صبح صبح ہی ڈانٹ پڑ سکتی ہے۔"

ثوبیہ اور میں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ مجھے اس دفتر میں آئے دو سال ہو چکے تھے۔ پہلے میرے ساتھ ایک اور لڑکی کام کرتی تھی لیکن تقریباً سات ماہ

www.pdfbooksfree.pk

تک اس کی شادی ہوئی تو وہ ملازمت چھوڑ گئی۔ کوثر نے اس کی جگہ ثوبیہ کو ملازمت دے دی۔

[illegible] اسٹاف میں سب سے زیادہ میرے قریب تھی۔ [illegible] ساتھ تھیں۔ [illegible] کی عادت تھی۔ [illegible] میں مرد [illegible] زیادہ تھے [illegible] ہاتھ آتے ہوئے [illegible] ہو جاتی۔

ثوبیہ تو مجھ سے دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ کبھی کسی مرد سے بلاضرورت بات نہ کرتی نہ ہی اسے عام لڑکیوں کی طرح ٹوہ لینے کی عادت تھی کہ کون کیا کر رہا ہے۔ وہ اپنی دنیا میں مگن [illegible] تھی۔ حسن کا بھی [illegible] نے بات [illegible] آتا [illegible] اس کا [illegible] وقت آنے [illegible] زیادہ خوبصورت تھی۔ [illegible] عادات [illegible] ایک [illegible] ایسا [illegible] نے بھی [illegible]۔

"[illegible] خوبصورت [illegible]؟"

آج وہ [illegible] بتایا گیا تھا۔

"صدیقی صاحب سے لیا ہے۔ واقعی بہت اچھی لگ رہی ہے۔" اس نے دوپٹے کا کونا ناز سے پکڑ مجھے گھوم کر دکھایا۔

میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "اچھا اس سوٹ سے [illegible] کا [illegible] کیا میں نے [illegible] سامنے سے صدیقی صاحب بھی دیکھ رہے ہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسٹول پر بٹھایا۔

"اوہ [illegible] اف [illegible]" وہ جھٹ اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"[illegible] بھی [illegible]" اب [illegible] ان سے پوچھنے لگی [illegible] گھر میں ماں بہن نہیں ہے کیا؟" آواز آہستہ [illegible] کرتے [illegible] ہوا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

> وہ کبھی کسی مرد سے بلاضرورت بات نہ کرتی نہ ہی اسے عام لڑکیوں کی طرح ٹوہ لینے کی عادت تھی کہ کون کیا کر رہا ہے۔

"اچھا بتاؤ کتنے کا ہے؟" میں نے حسرت اور رشک سے پھر جوڑے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ساڑھے تین ہزار کا۔" بولتے ہوئے اس نے [illegible] سے [illegible] ناخنوں والے ہاتھ میں تھما دیا۔

"کیا؟ ساڑھے تین ہزار؟" ایک جوڑے کے لیے اتنے روپے خرچ کر دیے؟ گھر اور اخراجات [illegible] اور [illegible] کی دوائیں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"[illegible] ایک ہی تو شوق ہے۔ اچھے کپڑے پہننے کا۔ اب [illegible] کرتی ہوں تو کیا اتنا بھی اپنے لیے نہ کروں؟" اس نے سنجیدگی سے [illegible]۔

"ہاں یہ بھی ہے لیکن تمہیں کچھ بچت بھی کرنی چاہیے۔" میں نے [illegible] سے اسے مشورہ دیا۔ [illegible] میری اور میں اس کی [illegible] مجھے [illegible] دیکھ کر حیرت

www.pdfbooksfree.pk

تھی ہوتی کہ گھر کے حالات کے برعکس اس کے جوڑے بہت شاندار ہیں۔ جذبات چھپانے اور ضبط کا سلیقہ تھا تو اس لیے وہ خوبصورت نظر آتی۔ "ممی! اتنے مہنگے ملبوسات!" "پھر شوق کا کوئی مول نہیں" یہ دیکھ کر میں اپنی حیرت کو تسلیاں دے رہی۔

تقریباً ایک مہینے سے وہ روزانہ دفتر سے دس یا پندرہ منٹ دیر سے آ رہی تھی۔ آخر اس نے دیر سے آنے کے لیے دفتر سے اجازت لے لی۔ دراصل اس کی والدہ بہت بیمار تھیں۔ حمیدی صاحب اچھے باس ہونے کے ساتھ اچھے انسان بھی تھے جنھیں دوسروں کی مجبوریوں سے سمجھوتا کرنا آتا تھا۔

"ڈورا آنٹی نے اپنی وفات کے بعد گھر چھوڑ دیا۔ ان کی بیٹی کی شادی ہے نا۔ وہ اصرار کر رہی تھیں کہ تم لوگ کچھ دن پہلے آ جاؤ۔"

ثوبیہ نے ناپ دیتے ہوئے مجھے بتایا۔

"چلو اچھی بات ہے۔ اس کا بھی دل بہل جائے گا اور تمھیں بھی سکون رہے گا کہ انھیں کوئی دیکھنے والا ہے۔" میں نے اپنے ناپ کا رجسٹر اپنی طرف کرتے ہوئے کہا کہ اس کا حساب … کر دیا ہے۔

"ہاں … وہ تو ہے … ویسے مجھے تم سے کچھ چاہیے۔" اس نے اپنے ناپ کا رخ میری طرف کر کے … بھی مجھے تھما دی۔ مطالبہ تھا کہ آج سے میں ناپ کر کے دکھاؤں۔

"ہاں … بولو …" میں نے … سمجھ کر دیکھا۔

وہ … حالات … سے ہنس دی اور بولی "ایسے … کے … سے … تو میں … ہوں!"

"کی اماں تھیں آپ کے … مجھے شیشے پر گھور رہی ہوں۔" میں نے اپنے ناپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے … اور وہ … شروع کر دی۔ "اچھا خیر اب بولو کیا چاہیے؟"

"ماں … کی شادی کے لیے جو جوڑے اور زیور چاہیے۔ مجھے علم ہے تم یہاں پہن کر نہیں آتیں لیکن تمہارے پاس کافی اچھا مال موجود ہے۔" دراصل میں اسے اپنے گھر میں ہونے والی تقاریب کی تصویریں دکھا چکی تھی۔ اسے میرے کپڑے اور جیولری بہت پسند آئی تھی۔

اس نے بات کرتے کرتے سر جھکا لیا اور اس کی آواز میں کیا … تھی کہ … ہونی چاہیے۔ دیکھو اب میرے پاس اتنی رقم نہیں۔ اور شادی بھی تقریب میں پہننے والے کپڑے … بہت … عجیب …

اب وہ … میں … تمھارا … کر رہی ہوں کہ تمھاری چیزیں ویسے ہی واپس کر دوں گی۔" اس کا چہرہ … اور بھی جھک گیا۔

"ارے … تمھارا … کی بات تھی۔ ہاں سے یہ … کی اتنے زرق برق کپڑے قریبی لوگوں کی شادی میں ہی پہنے جاتے ہیں۔ ویسے بھی تو … سے ہی … اچھا ہے تمھارے کام آ جائیں، یوں تو قیمت وصول ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اوہ … میری … اس کا … ہزاروں … بہت بہت شکریہ۔ تمھیں نہیں پتا تم نے میری بہت بڑی پریشانی دور کر دی۔" وہ مجھے … گئی۔

"اچھا اس میں ایسی کوئی قربانی بھی نہیں دے دی۔" میں نے اسے شکریہ ادا کرنے سے روکتے

www.pdfbooksfree.pk

ہو سکے تو جانا۔"

"اور ویسے بھی رشتے داروں میں تو آج کل ایک دوسرے پر رعب جمانا ہے۔ تم بھی میری ان کی حسرت ہو۔"

لیکن پھر بھی اس کی باتوں سے آخر تک میری تعریف میں رطب اللسان رہی یہاں تک کہ مجھے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔

اس رات میں نے قیمتی جوڑے جو چند ہو گئے تھے، اپنے بھائی کی شادی پر بنائے تھے، وہ چار لفافوں میں رکھ لیے۔ جیولری کے ساتھ ہی پرانا غلاف بھی رکھا جو میرے بھائی نے اپنی شادی پر مجھے تحفہ دیا تھا۔ ثوبیہ نے یاد دلا کر کہا تھا "بس صرف ایک دن کے لیے اگر ہو سکے تو وہ بھی دے دیں۔ بہانہ میری بہن کی نند کی شادی ہے اور میں سب سے منفرد نظر آنا چاہتی ہوں۔" ثوبیہ کی باتیں سوچتے ہوئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

صبح اٹھ کر نماز کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ کپڑوں اور جیولری کی دونوں لفافے تیار کر لیے تاکہ جاتے وقت لے جاؤں۔ دراصل امی کے سامنے تیاری کرتی تو انھوں نے مجھے مسکین فقیر کی طرح دیکھنا تھا۔ لڑکی (ثوبیہ) نے "بانٹو بٹیا" کے ساتھ مجھے بھی چاہیے ہوتی کہ وہ سب واپس لا دے گی۔ پھر ہمارا گھر بہت بڑا تو تھا ہی نہیں، بھاوجوں سے بھرا ہوا بھی ہو جاتی کہ میں اپنے قیمتی جوڑے کی اتنی نمائش کرتی آئی ہوں۔ لہٰذا میں نے پہلے مرحلے ہی پر اپنا بچاؤ کر لیا۔

یوں بھی وہ بڑی بہنوں اور بھائیوں کی شادی کے بعد فی الحال میں گھر میں اکلوتی ہی تھی اور مجھے آٹھ اپنے کام اپنے ہی کرنے پڑتے۔

☆☆☆

وہ ... تمھارے قیمتی جوڑے لے آئی ہوں۔

"میں تو بڑی بات ہے، دو ماہ کی ... رکھ لیں ... بچاؤ"

دونوں نقاب میں نے اپنی الماری میں رکھ دیے۔ جلد ہی ہفتے میں دونوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ہم دونوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

"تو تم میرے ساتھ گلشن اقبال تک چل رہی ہو؟" ثوبیہ نے کھانا کھاتے ہوئے اچانک سوال کیا۔

"کیوں؟ نہیں بھئی آج میں نہیں جا سکتی۔ میری امی کی طبیعت خراب ہے۔" میں نے انکار کر دیا۔

"کوئی بات نہیں، وہ میرا کام تھا۔ دراصل ہمارے ایک جاننے والے ہیں۔ انھوں نے چند رقم قرض دینے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ قریبی رشتے دار بھی لگتے ہیں۔ تمھیں پتا ہے نا آج کل امی کی ادویات کا خرچہ اور پھر شادی کے اخراجات ..." وہ میری منتیں کرنے لگی "ویسے بھی تمھارے راستے ہی میں آتے ہیں۔ صرف چند منٹ کی بات ہے، کیا فرق پڑ جائے گا۔"

وقت ضائع تک میری زبان میں نہیں چلی، مجھے عجیب سا لگ رہا تھا کہ میں اپنی دوست کے رشتے دار کے گھر یوں جا کر بیٹھ جاؤں۔ لیکن وہ مسلسل مجھ سے مطالبہ کرتی رہی ... ہمیں ٹیکسی مل گئی۔

میں نے کہا "اتنے بڑے بڑے گھر ہیں وہاں ... پھر سنسان راستہ ... کوئی ڈاکو قیمتی جوہرات و زیورات چھین کر بھی بھاگ سکتا ہے۔" لیکن اس نے یہ خطرہ ہنسی میں اڑا دیا۔ آخر اس نے مجھے قائل کر ہی لیا کہ کراچی جیسے بڑے شہر میں رہتے ہوئے دن میں پندرہ منٹ کی ڈرائیو کوئی بڑی بات نہیں۔ ویسے بھی میں اپنی امی کو واپس جا کر بھی بتا سکتی ہوں کہ آج دیر سے کیوں آئی۔

www.pdfbooksfree.pk

شام ڈھلے جب ہم گھر سے نکلے تو ایک ایک لمحے کو خوش ہو رہے تھے۔ بچوں نے تقاضے شروع کر دیے۔ لیکن ہم دونوں ہی سب سے زیادہ "اللہ" میں محسن بھائی نے بتو پوچھا تھا کیوں۔

ابا جی کی طرف کے آنگن میں سے گزرتے ہوئے بچپن ... میں عجیب موسم آنے لگے دیے تو کسی کی زندگی کا تجزیہ کیا ... اور کہانی میں رستے ہوئے ... ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ کہ ہے کہ بچپن میں وقت کیا ہو جائے۔ اپنے ... سمت پہنچ گئی جس کے پاس ان لیے ہم ... والوں دیکھ رہا تھا کہ میں یہاں ہوں۔ اگر خدانخواستہ وہاں ہم پہنچ جاتے تو میرے گھر والے ... ہوتے میں

"آداب!" بھئی! یہ کس نے کہا کہ آپ دیکھا "کیا خیال ہے تم سوچ رہی ہو؟" اس وقت تو یہ بھی خاموش کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ لیکن خوشی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو اس بدلتے ہوئے ... سمجھتی تھی۔ مجھے اس کے چہرے پر بچپن کی مسرت نظر آئی۔

"مجھے یاد تو کچھ معلوم ہی ہے۔ میں نے اس کی ایک ہوئی پریشانی دور کر دی۔ اس لیے وہ خوش ہے۔ اس میں جو بات ... ہوتی ہے ..." ذرا دیر بعد ہی بس آ گئی۔ ہم دونوں اپنے خیالوں میں گم اپنی منزل تک پہنچ گئے۔

"آؤ نور!" اس نے مجھے آگے جانے کا اشارہ کیا۔ ہم اس ... آگے سے بچے۔ دونوں ... گھر کا آدھا راستہ ابھی باقی تھا لیکن ... تو مجھے ... لگے۔ پھر ... ساتھ ... بچپن کی ... ہے۔ میں نے قریب ہی ہے۔

"شکریہ" میں تو سوچ رہی تھی ایسا ہو گا اس نے ... ڈرائیور نے گھر کا راستہ لیے ہو گئے۔

"یہ تو خواب تھی تم؟" میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ... کا شکریہ ادا کیا ... عادت مطابق ... دی۔

"آؤ نور! یہاں سے آگے کے لیے ہیں ... کوئی دور ہوتا ہے۔"

"نہیں! کوئی دور ... تو بتا تھا کہ یہاں سے قریب ہی ہے۔" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

... میں جاتے ہوئے قریب ہی ہے۔" اس نے قریب کھڑے ... کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے ... مجھے ... دی۔

جلد ہی رستے میں ... کی منزل کی طرف گامزن تھے۔ اندرونی گلیاں دیکھتے ہی مجھے یاد آیا یہاں کبھی ہماری ... کا گھر ہوا کرتا تھا۔ بچپن میں یہ علاقہ بہت ... جب نانی کے گھر آتے تو خالہ کے ساتھ ... جاتے۔ ... اور ماموں کے ساتھ دکان سے چیز لینے نکلتے۔ بچپن کی یادیں اس علاقے کے ساتھ اب بھی وابستہ تھیں۔ پھر انھوں نے گھر تبدیل کر لیا۔ اب تو بہت ... پہلا ... خاصا ... بڑے بڑے مکان، ... مجھے محسوس ہوا تو یہ شہر اپنی ... کا ... بھول چکا ... آج بچپن کی مختلف گلیوں میں ... والے ... رہی تھی۔

"... پریشان ... میں ... کے ساتھ ... آ گئی ہوں۔ مجھے ... ہے۔" مجھے ... نے ... سے ساتھ ...

www.pdfbooksfree.pk

سے بڑی سب سے چوڑی گلیوں میں داخل ہوئے۔ تھوڑے
آگے رکشا رکوا کر اس نے ادائیگی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر
داخل ہوگئی۔

اس بڑے سے گھر کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں
مجھے بیٹھنے کی ہدایت کر کے وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔
دونوں لفافے بھی اس کے پاس تھے۔

"چھوٹو، وہ تو اس کے پاس تھے" میں نے دل کو تسلی
دی۔

پانچ..... چھ..... سات..... آٹھ منٹ مجھے یونہی
وقفہ کرتے گزر گئے۔ آخر وہ کہاں گئی؟ میرے صبر کا
پیمانہ لبریز ہو گیا۔

میں اٹھی اور ٹہلتے ہوئے ڈرائنگ
روم سے آگے راہداری اور اس سے آگے
کمروں کے دروازے بند کرتے
تھے۔ "اس گھر میں کوئی ایسے چپ
بیٹھ نہایت ہی معقول ہوتا ہے۔" میں
نے خود کو کہا۔

جب میں گھر کے اندر پہنچی تو اسی وقت کے
بالائی منزل سے ایک آدمی کی جھلک نظر آئی۔ وہ اپنی
آنکھوں سے مجھے گھورتا سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھا
رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن ایک ساز کی سی بجنے لگی۔
ساتھ ہی میں نے اوپر دیکھے بغیر باہر والے
دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔

وہ آدمی بھی مجھے دیکھ چکا تھا۔ اپنے بھاری وجود کے
ساتھ میرے پیچھے دوڑا۔ جب تک وہ سیڑھیاں اترتے
میرے قریب پہنچا، میں گلی تک آ پہنچی تھی جہاں سے
دو تین ٹیکسیاں اور گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

میرے ساتھ والی چھوٹی قریب آ گئی تو اس نے

میں پچیس منٹ کا راستہ مجھے صدیوں پر محیط لگا۔ گھر پہنچنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے بدن میں جان نہیں۔

تھا، وہ بچے میں کیا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے اپنی ہمت
مجتمع کی اور چیخ کر اسے کہا "یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں جاتا ہوں، میرے ساتھ چلو۔ میں نے تمہارے
پیسے لیے ہیں۔"

ایک ہی لمحے میں میری ریڑھ کی ہڈی سے آگ اور پورے
جسم میں پھیل گئی۔ مجھے لگا جیسے اب میں اپنے قدموں پر
کھڑی نہ رہ سکوں۔ لیکن میں نے پوری طاقت سے چیخ
کر کہا "تم نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو … میں چیخ چیخ کر لوگوں
کو اکٹھا کر لوں گی۔ میرے ساتھ جو ہو سو ہو، لیکن تمہیں بھی
نہیں چھوڑوں گی۔"

وہ پیچھے سے مجھے گھورتا رہا۔ اسی وقت
مجھے ایک رکشا آتا دکھائی دیا۔ میں
نے اسے روکتے ہوئے ہاتھ
ہلایا۔ رکشا آتا دیکھ کر وہ آدمی پیچھے
ہٹ گیا۔ قریب آنے پر میں دھڑکتے
دل لیے اس میں بیٹھ گئی۔ میں پچیس
منٹ کا راستہ مجھے صدیوں پر محیط لگا۔ گھر پہنچنے کے بعد
مجھے محسوس ہوا کہ میرے بدن میں جان نہیں۔ لیکن یہ
اچھا ہوا … یاں ہوا کہ مجھے گھر میں اس طرح داخل نہیں
ہونا چاہیے تھا۔ سب مجھے دیکھ کر پریشان ہو جاتیں اور سوالات
کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ تب مجھے مجرم نہ
ہوتے ہوئے بھی مجرم بننا پڑتا۔

اندر داخل ہوتے ہوئے میں نے پوری کوشش کی کہ
بدحواس نظر نہ آؤں۔ لیکن امی کے سامنے ہوتے ہی انھوں
نے پہلا سوال یہی کیا "کیا ہوا تمہیں؟"

اس مختصر جملے کے بعد مجھے اپنے اوپر قابو نہ رہا
اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ امی یہ دیکھ کر مزید گھبرا

www.pdfbooksfree.pk

گئیں۔ "ارے یہ تو اچھی بات ہو گئی۔"

"امی! آپ کی بیٹی آ گئی ہے۔" انھوں نے روتے ہوئے مجھے گلے لگا لیا۔

"ارے [illegible] کیا ہو گیا تھا؟ [illegible] انسان کی قیمتی زندگی ہوتی ہے۔ اسے یوں ضائع نہیں کرتے۔ چلو ہاتھ منہ دھو لو، قیصر بھی آ رہی ہوں گی۔" انھوں نے بھائی کا ذکر کیا۔ ان کا خیال تھا، شاید میں ان سے کوئی [illegible] رہی ہوں۔ میں خوشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

لیکن رات کو جب [illegible] پاس بیٹھ کر اطمینان سے سارا واقعہ سنتے ہوئے کئی بار انھوں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے مجھے [illegible] میں انھیں سنتے ہوئے بے انتہا سکون اور راحت محسوس ہوا۔

دوسرے دن [illegible] کے بعد [illegible] تو سب سے پہلے حمیدی صاحب سے [illegible] جا کر [illegible] سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ میرا چہرہ دیکھ کر حمیدی صاحب بھی کھٹک گئے۔ "خیریت تو ہے عائشہ جی؟ یہ کیا؟" انھوں نے استفسار کیا۔

میں نے سارا واقعہ ان کے گوش گزار کیا۔ ساری بات سن کر وہ [illegible] پھر [illegible] بولے۔ "اچھا آپ رہنے دیں، میں اس کی معلومات کرواتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر اٹھتے ہوئے انھوں نے مجھے تسلی دی ساتھ ہی [illegible] آرام کرنے کی ہدایت دی۔

آخر [illegible] کام زوہیب سے ہی [illegible] تھے۔ حمیدی صاحب نے ایک فارم پر سے [illegible] کا پتا نکالا اور اسے زوہیب کو دیتے ہوئے ہدایت دی کہ ان کے بارے میں ساری معلومات حاصل کی جائیں۔

میں واپس اپنی جگہ پر آ گئی لیکن کام میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ [illegible] کے بعد زوہیب واپس آیا۔ وہ سیدھا حمیدی صاحب کے کمرے میں گیا۔ [illegible] اس کے پیچھے [illegible] حمیدی صاحب نے [illegible] بعد حمیدی صاحب نے مجھے بلا لیا۔

"جی سر! آپ نے مجھے بلایا تھا؟" میں نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔

"جی آئیے۔" انھوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کرسی پر بیٹھی [illegible] ہو گئے۔

"عائشہ جی! زوہیب کی رپورٹ کے مطابق تو [illegible] وہاں اس نام کی کوئی لڑکی نہیں رہتی۔ اس کے [illegible] میں نے اپنے ایک پولیس افسر دوست [illegible] اس علاقے [illegible] لڑکی کا پتا چلانے کا بھی کہا [illegible] آئندہ ایسی چالاک لڑکیوں کے جال میں نہ پھنسنا۔"

اس حقیقت کے [illegible] اپنی نشست پر واپس آ گئی [illegible] اس دن سے میرا [illegible] سے اعتبار اٹھ گیا۔ آج بھی جب اس [illegible] اپنے [illegible] کے ساتھ فرار ہوتی تو [illegible] کیونکہ [illegible] میرے ساتھ ہوا۔

میں سوچتی ہوں، اگر خدانخواستہ اس دن لڑکی کا گروہ اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب ہو جاتا تو میرے پیچھے سارے [illegible] کا [illegible] اس طرف جاتا کہ یقیناً میں اپنی مرضی سے گھر چھوڑ گئی ہوں۔ ایسی صورت حال میں گھر کی عزت رسوا [illegible] لڑکی کو تو تلاش کیا جاتا لیکن [illegible] کی بات نہیں ہوتی کہ غائب کیسے ہوئی!

www.pdfbooksfree.pk

تازہ افسانہ

ایک باپ کا نیا فیصلہ

میں نے قربانی کا بکرا نہیں بننا

پیار و محبت پر جب دولت کی ہوس غالب آ جائے تو قطع تعلق چند دنوں کو سمجھنا پڑتا ہے

[illegible]

ظہیر [illegible]

[illegible]

www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.pk

کی پیدائش ہوئی۔

پہلے سال بیٹی ہوئی اور دوسرے سال بھی۔ دونوں بیٹیاں صحت مند اور خوبصورت تھیں۔ دونوں دادا کی پیاری تھیں۔ گھر ہر طرح سے آراستہ تھا اور ہر چیز میسر تھی۔ کھانے پینے کی چیزیں تھیں اور تعلیم و تربیت کی کوئی کمی نہ تھی۔ کے بغیر وقت نہ کٹتا، ان کے پاس رہتے۔ کبھی کبھی نظروں کے سامنے آتے تو خوشی ان کی آنکھوں میں آ جاتی۔

اس کی کاروباری مصروفیت بہت بڑھ گئی تھیں۔ ایک شام وہ کسی دوسرے شہر سے واپس لوٹا ہوا تھا۔ کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ قریب والے کمرے سے آوازیں آ رہی تھیں۔ دونوں کمرے میں کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔ آوازیں اس کی بچی اور بیگم کی تھیں۔ دوسری آواز بیگم کی تھی جس کے خاندان سے ان لوگوں کے اچھے مراسم تھے۔ اس نے ... کر رہی تھیں:

"ابھی تک آپ ... چھوٹی بیٹی ابھی اب بڑی ہو گئی ہے۔"

"مجھے یہی بات ہمت کا مقدر ہوتی ہے اور دو مرد کا۔ میں نے ... جہاں تک تعلق ہے وہ ... ہے۔ ... کے لیے ... کی قسمت بھی ہے۔ ... بیٹیوں میں سے ایک بیٹا بھی تو ہو سکتا تھا۔"

ظہیر نے ... الفاظ سنے۔ ... کے لب و لہجے اور انداز میں کتنی حسرت اور شکوہ تھا!

"کیا ... سب کو اپنا بخت ملتی ہے۔ میری محنت، دن رات کے ... پیچھے سے کمایا ہوا سرمایہ، میری ... کاروباری ذہانت، فراست اور خدا کی عنایت، ان کی نظر میں ... نہیں۔ بیٹا نہیں ہے، تو قصوروار میں ہو گیا۔ خوب ... "

مصنف سے ملیے

وطن عزیز کی ممتاز قلم کار، سلمیٰ اعوان سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل پر افسانوی رنگ میں لکھتی اور سوچ کے نئے در وا کرتی چلی جاتی ہیں۔ آپ کے پانچ افسانوی مجموعے، سات ناول اور تیرہ سفرنامے شائع ہو چکے۔ تین سفرنامے زیر طبع ہیں۔ نت نئی تخلیقات رقم کرنے کا سفر پوری آب و تاب سے جاری ہے۔

اس پر سوچ میں تھا کہ ... سوچ ... ذہن پر ... تھیں اس کے ... پر ابھر آئیں۔

... ایک ... کی ... میں تین چار ... تک ... بعد ... ہوا تو ... ابھی تک چلا جا رہا ... کا ... دوست ... منظور نے ... کوئی ... بیٹیوں پر ... دونوں کا ایک ہاتھ میں ... دونوں ... نظر ... کر رہے تھے۔

"کہاں جا رہے ہو؟" ظہیر نے پوچھا۔

"یار ایک مریض دیکھنے جا رہا ہوں۔ تم بھی ... ذرا ... کر ... گے۔"

شہر کی ایک گلی کے قریب ڈاکٹر منظور نے گاڑی روک دی۔ ... نے اسے تالا لگایا۔ دوست نے دونوں کو ایک ہاتھ میں ... ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دو گلیاں پار کرنے کے بعد تیسری گلی میں پہلے دروازے پر ڈاکٹر منظور نے دستک دی۔ ذرا ... کوئی انتظار میں تھا، ... دروازہ کھولا گیا۔ ظہیر نے دیکھا، سامنے ایک ... لڑکی کھڑی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے اماں جی کی؟" منظور نے پوچھا۔

www.pdfbooksfree.pk

”بہت محنت ہو رہی ہے۔“

وہ چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا۔ ... تھا مگر معلوم نہیں شادو اور عظمیٰ کیوں حیران ہوا۔ ظہیر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر منظور مریضہ کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ گھر میں سلیقہ اور صفائی تھی۔ تمام سامان [illegible] سے رکھا ہوا تھا کہ وہ تو جیلی تھی تو احساس ہوتا تھا ان دو نظروں کو برا لگتا۔ ذرا لمبے قد اور [illegible] رنگ کی تھی۔ شکل اچھی تھی۔ گھر میں خوشحالی ہوتی تو بہت خوبصورت ہوتی۔ آنکھیں بڑی چمکدار اور [illegible] ہوتی تھیں۔

ڈاکٹر منظور نبض اور دوائی کے بعد ظہیر کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں استفسار محسوس کرتے ہوئے بولا

”ایسے کئی مریض میں نے دیکھے ہیں [illegible] کہ ڈاکٹر [illegible] اس بیماری میں عذاب بن جاتا ہے۔ آج کل [illegible] کرتے رہیے۔ مریضہ کی بیٹی بہت بعد [illegible] تو مریضہ کی بیماری بڑھ جاتی ہے۔ دو [illegible] بہنیں ہیں۔ ایک شادی شدہ ہے جس کے ڈھیر سارے بچے ہیں۔ دوسری یہ عذرا ہے۔ [illegible] ہوں فون کر کے پاس [illegible] ماں [illegible] چلاتی اور بیٹی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ مسلسل محنت اور پریشانیوں نے اسے چڑچڑی بنا دیا۔ عذرا ہمت والی لڑکی ہے۔ [illegible] پڑھ چکی ہے۔ اب میرے بیٹے احمد کی کلاس [illegible] ہے۔ والدین کی میٹنگ میں [illegible] سے ملاقات ہوئی [illegible] تعلقات بن گئے تو ہم نے بھی تھوڑا خیال رکھنا شروع کر دیا۔ اصل میں اس گھر میں [illegible] لگتا چاہیے [illegible] اس کے بغیر مریضہ کی حالت [illegible] بہت مشکل ہے۔“

> اس نے امید بھرے لہجے میں کہا ”خدا کے بارے کوئی چیز کی نہیں، وہ تم جیسے دریادل لوگوں کو بہت دے گا۔“

”یار تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا [illegible] یہ کون سا مسئلہ ہے [illegible] گی۔“ ظہیر بولا۔

اسی دوران عذرا شربت کا جگ لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دونوں کے آگے تپائی رکھی۔ شربت کی ٹرے اور گلاس رکھے۔ بہت لذیذ شربت تھا۔ ظہیر نے پوچھا تو ڈاکٹر منظور نے کہا ”کیوں عذرا شربت بازار کا ہے یا گھر میں بنایا؟“

”میں نے خود تیار کیا ہے۔“

جب وہ واپس آ رہے تھے تو ڈاکٹر منظور نے کہا ”شریف لوگ ہیں۔ اور ہاں یار اس لڑکی عذرا کا خیال رکھنا۔ اگر کوئی معقول برسر روزگار لڑکا ہو تو بتانا۔ ماں کی جان [illegible] لڑکی کی شادی میں بھی اٹکی ہوئی ہے۔ لڑکی بھی بہت اچھی ہے۔“

ظہیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ وہ اسٹیرنگ سنبھالے رہا۔ [illegible] جب ہسپتال کے احاطے میں گاڑی رکی اور ڈاکٹر منظور نے ظہیر سے پھر آنے کا کہا تو وہ بولا ”نہیں۔ اب چلتا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔“

جب وہ جا رہا تھا منظور نے آگے بڑھ کر کہا ”بھئی وہ اسے کی [illegible] مت بھول جانا۔“

اگلے دن شام پانچ بجے اس نے ڈاکٹر منظور کو فون کر کے بتایا کہ اس کے کوئی [illegible] آئے ہیں۔ مگر ایک نظر وہ خود دیکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کے پاس آجائے تاکہ اکٹھے چلیں۔ مگر ڈاکٹر منظور نے جانے سے معذرت کی کہ وہ اس وقت فارغ نہیں اور کہا ”یار تم ہی ذرا ہمت کرو اور چلے جاؤ۔“

www.pdfbooksfree.pk

شام ڈھل گئی تھی۔ تاہم ابھی تھوڑی دیر میں جانا چاہتے تھے جب وہ عذرا کے گھر داخل ہوا۔ چارپائی پر بیٹھی دراز قد کی عورت بیٹھی تھی۔ اس نے سلام کیا۔ معمر عورت نے اسے قریب بٹھایا۔ شانوں پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا لیکن اسے محسوس ہوا کہ عذرا بہت پریشان ہے۔ فوزان نے اس سے گھرداری کے بارے میں سوالات کیے اور یہ جاننے پر کہ اس کے ہاں اولاد نہیں تھی، اس نے امید بھرے لہجے میں کہا: "خدا کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں، وہ تمھیں دریا دلی سے لوگوں کو بہت دے گا۔"

اس نے شربت پیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ اٹھنے سے پہلے اس نے ایک لفافہ تکیے کے نیچے رکھنا چاہا، مگر عذرا نے بڑھ کر اسے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ جس سرعت سے وہ گھر سے نکلنے لگا، اسی سرعت سے وہ اس کے پیچھے لپکی۔ برآمدے میں وہ رک گیا۔ عذرا اس کے عین سامنے کھڑی تھی۔ اس کی ناک آنکھوں میں گہرا اضطراب تھا۔ وہ دھیمی مگر لرزتی ہوئی آواز میں بولی:

"میری سمجھ میں نہیں آیا آپ نے قرض ادا کر دیا کے وقت میں لگنے نہ دیتی۔ آپ میری بہت بڑا بن گئے۔ لوگوں سے پاس آتے ہیں، اس کے ادا بھی کیا؟"

وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ سانجھ کو ڈوبتے سورج کی روشنی میں اس کا چہرہ اور بھی زرد ہو رہا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں اضطراب اور بے یقینی موجود تھی۔ ایک پل فہیم اسے دیکھتا رہا، پھر دھیمی آواز میں بولا: "میرے پاس دولت خدا کی امانت ہے، اسے کسی بھی ضرورت مند انسان پر صرف کر دوں یا اس کی زندگی میں تھوڑی آسانی پیدا کر دوں۔ آپ لوگوں کا احساس کر کے مجھے خوشی اور سکون ملتا ہے۔ یا آپ بھی اس سے محروم رکھنا

چاہتی تھی۔"

وہ گم صم کھڑی سن رہی تھی۔ اس نے چلنے کے لیے قدم اٹھائے تو وہ جیسے چونکی اور بولی: "مگر اس کی تو قطعی ضرورت نہیں۔ میری تنخواہ ہمارے لیے کافی ہے۔" اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" فہیم نے نرمی اور شفقت سے کہا، پھر غیر ارادی طور پر اس نے عذرا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر لفافہ ان میں بند کرتے ہوئے کہا:

"میں تم سے بہتر جانتا ہوں کہ تمھیں اس کی ضرورت ہے یا نہیں!"

وہ بوکھلا سی گئی۔ چپ چاپ لفافہ پکڑ لیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رکا اور بولا: "اگر میں تھوڑا سا شربت اپنے لیے خواہش کی فرمائش کروں تو؟"

"ارے..." وہ جیسے کھل اٹھی۔ "آپ کو اتنا پسند آیا ہے، میں ضرور بنا دوں گی۔" فہیم رخصت ہوا تو وہ دروازے کی کنڈی ہاتھوں میں پکڑے دیر تک کھڑی یہ سوچتی رہی کہ یہ کیا لوگ ہیں جو حالات کے باوجود دل زندہ رکھتا ہے؟

اگلے دن وہ اپنی فیکٹری کے دفتر میں مصروف تھا۔ پروجیکٹ منیجر نے فون پر اطلاع دی کہ پیداوار پلانٹ کی مشین ٹھیک کر دی گئی ہے اور وہ شروع ہو چکا۔ وہ سارے معاملات دیکھ کر سائٹ پر چلا گیا۔ پلانٹ دوبارہ چالو کرنے میں کئی دن لگے۔ فارغ ہو کر آیا، کچھ ضروری کام نپٹائے۔ شام وہ ڈاکٹر منظور سے ملنے ان کے گھر گیا۔ عذرا اور بواجی کا شربت اسے کئی بار یاد آیا تھا۔

ڈاکٹر منظور اور ان کے بیوی بچے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ جب وہ ان کے ہاں پہنچا تو ظاہر دار بچوں نے اسے شربت پیش کیا۔ وہ کچھ چونکے بنا نے چلی گئی

www.pdfbooksfree.pk

اور بچے نانیوں کے گھر گئے ہوئے تھے۔ تب ظہیر دوبارہ منظور سے مخاطب ہوا۔ "پھر تم نے عذرا کے بچے میں ترسے کا بتایا تھا۔"

"ہاں" نہ جانے منظور! لکڑیوں سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم کو شاید ایک مرد ہے میری نظر میں۔"

"وہاں سے؟" کہتا ہے "اکرم وہاں" کیا کرتا ہے "تعلیم تو ہے؟" اس نے ذہن سارے سوال ایک ہی سانس میں کر ڈالے۔

ظہیر نے سکون سے سگریٹ سلگایا۔ تیلی ایش ٹرے میں جھٹکی، نشست سیدھی کی۔ لمبا کش لیا اور بولا: "تجھی دو تین ہوں۔"

"ارے یار!" منظور نے زور سے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ "داد دیتا ہوں تیرے فیصلے کی۔ کبھی تو یوں بھی بچوں سے اوپر کی ہو جاتی ہیں۔"

"میں اگر آپ کی محرومیوں کی تلافی کر سکوں، تو اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی بات اور کیا ہو گی۔ مگر..." وہ چپ ہو گئی۔

"منظور! یہ گھر والی بات نہیں، زندگی کا خوبصورت ترین حصہ اس کے ساتھ ہنسی ہو کر جیتے اور اپنا خون پسینے میں گزار دیا۔ اب تو بڑھاپے کی آمد آمد ہے۔ ہاں ایک کسک اور محرومی سی ہے جو اکثر پریشان رکھتی ہے۔ سوچتا ہوں، غریبانہ مزاج کی یہ لڑکی شاید میرے زخموں پر مرہم رکھ سکے۔"

"میں عذرا کی ماں سے بات کرتا ہوں۔ یوں بھی ظہیر، تمہیں اپنی لمبی چوڑی جائیداد کے لیے ایک بیٹے کی ضرورت تو ہے۔"

"چھوڑو بھائی، اس موضوع پر میں نہیں سوچتا۔"

چند دن بعد ایک شام منظور کا فون آیا۔ اس نے کہا "تم آج شام عذرا سے مل جانا۔"

ظہیر پوچھنا چاہتا تھا کہ بات کیسے طے پائی؟ مگر فون منقطع ہو گیا۔ اس نے چند بار کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ پھر اس شام وہ دفتر سے نکلتے ہوئے کام میں مصروف ہو گیا۔

چھٹی ہوئی تو بارش شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر انتظار میں بیٹھا کہ بارش تھم جائے تو چلے مگر وہ اور تیز ہو گئی۔ بہرحال بھیگتا ہوا اس کے گھر پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ ذرا سا دھکا دیا تو کھل گیا۔ صحن کی چھت والی آمد و بارش کی بوندوں سے ایک شور مچ رہا تھا۔

باورچی خانے میں عذرا چولھے کے سامنے پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ سیاہ گھنے بال یوں تھے جیسے شیش ناگ کی طرح زمین پر کنڈلیاں مارے بیٹھے ہوں۔ یہ حیرت انگیز منظر تھا۔ اتنے لمبے بال اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ کھڑکی کے قریب ہو گیا۔ دال ابل کر ہنڈیا سے باہر گر رہی تھی۔ عذرا بالوں کو خشک کرتی، ٹھٹھرتے ہوئے سیلا دھواں چھوڑ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے بڑھا اور باورچی خانے میں دھرے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ عذرا نے چونک کر دیکھا اور سٹپٹاتے ہوئے بولی:

"ارے آپ کب آئے؟ اور یہاں کس لیے بیٹھ گئے۔ اندر بیٹھئے، یہاں حبس ہے۔"

"تم بھی تو حبس میں بیٹھی ہو۔" وہ غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں تو عادی ہوں۔" عذرا نے لکڑیوں کو چولھے کی دیواروں سے ٹکاتے ہوئے کہا۔ سلگتے ہوئے ٹھیکرے اور آنچ تیز ہو گئی۔ ہنڈیا اس نے اتار لی۔

www.pdfbooksfree.pk

"میں بھی منہ میں سونے کا نوالہ لے کر پیدا نہیں ہوا۔"

دونوں خاموش ہو گئے۔ کچھ لمحے بعد وہ بیٹی خانے میں تسلیم کے پاس پہنچے۔ عطر کی بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی تھی۔ وہ باتیں ہوتی رہیں اور ہوائیں رقص کر رہی تھیں۔

"ڈاکٹر منظور نے فون کیا تھا کہ عذرا کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔ کہو۔"

"میں اگر آپ کی محرومیوں کی تلافی کر سکوں تو اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی بات اور کیا ہو گی۔ مگر ..." وہ چپ ہو گئی۔

"مگر کیا؟" تسلیم نے بات کاٹ دی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ عذرا کے چہرے پر جذبات کی کشمکش تھی۔ آنکھوں میں اک تجسس تھا۔ اس کے ہونٹ لرزے اور سر جھکا لیا۔ وہ بہت دھیمے سے بولی: "میں اگر آپ کو بیٹا نہ دے سکی تو؟"

تسلیم کے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ ابھری۔ چہرے کا رنگ بدلا، لگا کہ کوئی دل چیر رہا تھا۔ "میرے پاس کون سا تخت طاؤس ہے جس کے لیے وارث کا ہونا لازم ہے؟ اصل میں ہمارے معاشرے کا المیہ یہی ہے کہ اس میں بیٹے کو اولیت دی گئی۔ یوں بھی انسانی فطرت ہے کہ جس چیز کی محرومی ہو اس کی طلب زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میں تو کئی محرومیاں رکھتا ہوں۔ ایک اچھی پیاری اور مخلص بیوی کی بھی شدید تمنا ہے۔"

* * *

وہ شادی کی تقریب سے کافی [illegible] ڈاکٹر منظور کے اصرار پر شامل ہو گیا۔

"آپ دونوں [illegible] سے [illegible] تک [illegible] ہو، تمہارا خاندان بیٹے کی اولاد کا عادی ہے۔"

عذرا اپنی ماں سمیت ایک خوبصورت گھر میں رہنے لگی۔ زندگی کی آسائشیں اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئیں۔ اچھی خوراک ملی تو جلدی چہرے کی زردیاں سرخیوں میں بدل گئیں۔ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی۔ دس ماہ بعد ایک خوبصورت بیٹا بھی آ گیا۔ تسلیم سعودی عرب میں تھا۔ واپس آیا تو بیٹے کی پیدائش کا پتا چلا۔ عذرا ابھی اسپتال میں تھی۔ پیدائش پر اسے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر منظور سے ملتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

زندگی کی ہر خواہش پوری ہوئی تو تسلیم کی صحت قابل رشک ہو گئی۔ ایسی دلآویز شخصیت تھی کہ ملنے جلنے والے کہتے تھے: "تسلیم تو روز بروز جوانی کی طرف قدم اٹھا رہا ہے۔ مجھے تو پچاس کا لگتا ہے۔"

تین سال میں دو بچے ہو گئے۔ عذرا دو بیٹوں پر پہلے [illegible] ہو جاتی۔ وہ سعودیہ اور ادھر میں اپنے دن بانٹ رہا تھا۔ جب بھی سعودیہ سے آتا عذرا کھل اٹھتی اور دونوں پر محبتیں نچھاور کرتے خوش آمدید کہتی۔ کبھی کبھی وہ بڑی جذباتی آواز میں کہتا "میرا جی چاہتا ہے عذرا کہ تمہارے ساتھ ہی رہ جاؤں۔ لیکن بیٹیاں بڑی ہو گئی ہیں۔ انھیں مناسب نگرانی کی ضرورت ہے۔ اسی لیے سعودیہ کا انتظار رہتا ہے۔"

بڑی بیٹی پندرہ سال کی ہو رہی تھی اور چھوٹی بارہ کی۔ چھوٹی کا رشتہ بڑی بہن اپنے بڑے بیٹے سے کرنا چاہتی تھی۔ وہ لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کئی ہاؤس جاب کے لیے منتخب ہو گیا تھا، دوسری بہن ایک [illegible] بیٹی کی بار بار تمنا رکھتی تھی۔

اس بار تسلیم سعودیہ سے آیا تو بڑی بہن اور بھتیجی دونوں نے فون پر بتایا کہ وہ آ رہے ہیں۔ بہن منگنی کی رسم

www.pdfbooksfree.pk

ادھر سے وہ خود بھی۔ اگلے دن دونوں میاں بیوی منشی جی کی تعزیت کے لیے آئے تو نگینہ نے [illegible] ہوئے کہا۔

"[illegible] کی وفات سے پہلے انھوں نے [illegible] دیے تھے۔"

"جی میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ مجھے بہت [illegible] اور [illegible] لگتے ہیں۔ [illegible] آپ کو بھی دیا کہ [illegible] سے [illegible] آپ کی خواہش پوری کرے۔"

"آپا جان اگر وہ بھی [illegible] سے منشی [illegible] چاہتی ہیں تو بھلا مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔"

"[illegible] دونوں [illegible] نے انھیں نصیحت میں [illegible] دی ہے۔"

"کیسی نصیحت؟" نگینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"انھیں نگینہ کا [illegible] ہوا تھا کہ آپ اور ان کے شوہر بھی آ جائیں گے۔ وہ [illegible] ہوئے تھے اور [illegible] "اللہ [illegible] سے [illegible] پر آ گئے ہیں۔ اب آپ ہی کو [illegible] رہا تھا۔"

"[illegible] تو [illegible] کی میری [illegible] کا شوہر [illegible] دل [illegible]"

[illegible] بیٹے [illegible] لگا اور [illegible] شروع ہوئی۔

نگینہ [illegible] کہ جو [illegible] کا [illegible] اور [illegible]

[illegible]

[illegible] زندگی [illegible] اندازہ نہیں تھا۔

اب ایک [illegible] کبھی [illegible] سے [illegible] [illegible] دونوں [illegible]

اخلاص اور اطاعت

☆ جو لوگ دل میں خلوص رکھتے ہیں، وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری پر بلند مرتبہ پائیں گے۔

☆ دنیا میں جو لوگ دوسروں کے لیے خلوص رکھیں، وہ ان کی نگاہ میں عزیز ہو جاتے ہیں۔

☆ خلوص سے کی گئی عبادت اور خدمت کبھی رائگاں نہیں جائے گی۔

☆ بے ادب بے نصیب اور باادب بانصیب۔

☆ [illegible] کا جائز حکم نہ ماننا دراصل بدنصیبی کی علامت ہے۔

☆ راہِ راست پر [illegible] اور مخلص لوگوں کی پیشانی ہمیشہ اطاعت و خدمت کی [illegible] رہتی ہے۔

☆ دنیا کی رزق و عزت [illegible] مشیت ایزدی سے ہوتی ہے نہ کہ محنت و عقل پر۔

(شیخ سعدی شیرازی انتخاب [illegible])

[illegible] آ رہی ہے۔ [illegible] نے [illegible] نگینہ نے [illegible] اور [illegible] سب [illegible] رخصت [illegible]

[illegible] دن وہ [illegible] کے پاس [illegible] [illegible] ہو گئے تھے۔

"میرے [illegible] میاں [illegible] اور میاں [illegible] کے [illegible] انھیں [illegible] مجھے [illegible] اور انھیں [illegible] [illegible]"

www.pdfbooksfree.pk

کرۂ ارض کے طاقتور حکمران کا

اُڑنے والا محل

دنیا بھر کی آسائشات و سہولیات
رکھنے والے اس عجوبے کا قصہ دلپذیر

قسیم الدین

ایک مشہور امریکی جہاز کا منفرد پہلو یہ ہے کہ جب یہ اُڑتا ہے تو حیرانی کا سبب بنتا ہے۔ یہ منفرد عمارت فضا میں اڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کی عمارت کو سفید محل کہتے ہیں۔ یہ اُڑن کھٹولا امریکی صدر کی سواری ہے جس کا پورا نام ایئرفورس ون ہے۔ یہ طیارہ ہر قسم کی جدید سہولیات سے آراستہ ہے۔ اس میں ایک سو افراد کا عملہ سفر کر سکتا ہے۔ وہ ہزاروں میل کا سفر بلا توقف طے کر سکتا ہے۔ ایئرفورس ون صدر کے لیے بنائے گئے خصوصی طیارے کا نام ہے۔

یہ طیارہ خصوصی طور پر صدر کے لیے تیار کیا گیا ہے اور اس کی تیاری میں کئی برس لگے۔

اس وقت دو طیارے اس خدمت پر مامور ہیں۔ یہ بوئنگ ۷۴۷ ماڈل کے ہیں۔ یہ ۱۹۹۰ء سے امریکی صدر کے زیر استعمال ہیں۔

صدر امریکہ کے اس فضائی محل میں ہر قسم کی ضروری سہولیات میسر ہیں۔ اس میں دفتر، ملاقات کا کمرا اور دیگر سہولیات موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں کانفرنس روم اور طبی عملے کے لیے جگہ بھی ہے۔ جہاز کی بلندی ایک چھ منزلہ عمارت کے برابر ہے۔ اس میں تین منزلیں ہیں۔ نچلی منزل میں سامان اور خوراک رکھی جاتی ہے۔ درمیانی منزل میں صدر اور ان کا عملہ بیٹھتے اور کام کرتے ہیں۔ اوپر کی منزل پر صدر کا کانفرنس روم، خواب گاہ، کمرے اور دیگر حصے واقع ہیں۔ یہ سب جہاز کے اگلے حصے میں ہیں۔

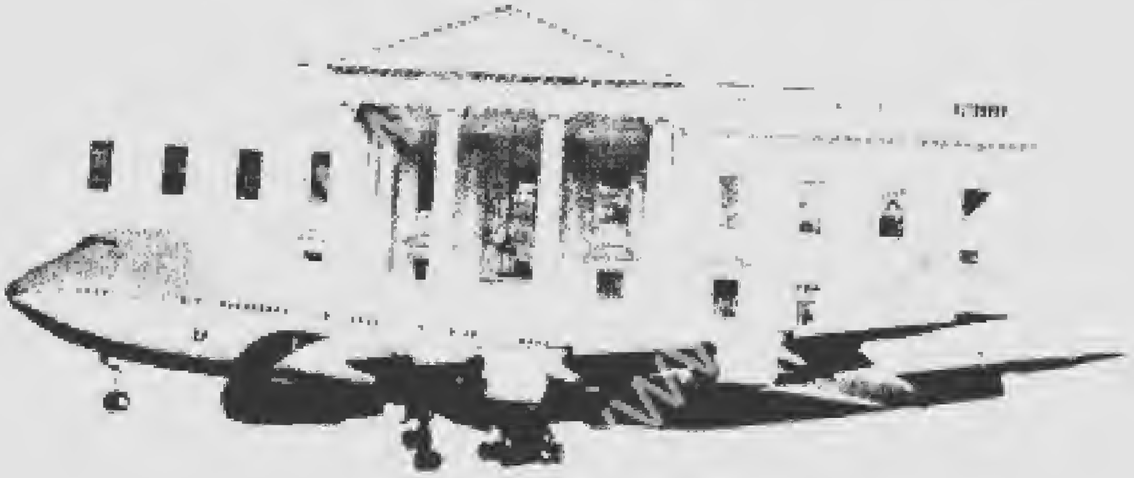

www.pdfbooksfree.pk

سب سے اوپر والی منزل میں جہاز کا عملہ جو تین ہوابازوں اور ۲۳ عملہ کے دیگر ارکان پر مشتمل ہے، قیام کرتا ہے۔ اس جہاز میں کل ۱۰۲ نشستیں ہیں۔ ۷۶ صدر اور ان کے ہمراہیوں اور اوپر ۲۶ عملہ جہاز کے لیے۔ اس جہاز میں ۴۰۰۰ فٹ پہ پھیلا فرش جو صدر امریکا اور دوسرے مسافروں کے زیر استعمال رہتا ہے۔ جہاز کا میڈیکل روم بھی اسی فرش پر ہے۔

یہ کوئی عام طیارہ نہیں: اس میں ایک شاندار سہولیات میسر اور انتہائی حساس مواصلاتی آلات نصب ہیں جو کسی دوسرے طیارے میں موجود نہیں۔ پچاسی نشستوں پر ٹیلی فون سیٹ نصب ہیں۔ انیس ٹی وی سیٹ بھی مختلف جگہوں پر لگے ہیں۔ اس کے علاوہ فیکس مشینوں اور کمپیوٹر (انٹرنیٹ) کی سہولت بھی موجود ہے۔ یوں صدر امریکا اس کا عملہ کسی بھی وقت دنیا کے کسی بھی نقطے سے ریڈیائی رابطہ کر سکتا ہے۔ بوقت ضرورت صدر اپنی قوم سے براہ راست خطاب بھی کر لیتا ہے۔

اس خصوصی جہاز میں کچھ ڈاکٹر اور نرسیں صدر کے ہمراہ سفر کرتی ہیں۔ ادویہ کے ایک اسٹور کے علاوہ ایک آپریشن روم بھی ہے جس میں جدید آلات جراحی ہے۔ جہاز میں ایسے آلات نصب ہیں جو بوقت ضرورت دشمن کا ریڈار جام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

جہاز میں جنرل الیکٹرک کمپنی (GEC) کے تیار کردہ چار طاقتور انجن نصب ہیں۔ یہ طیارہ دوران پرواز فضا میں کسی دوسرے جیٹ جہاز سے تیل حاصل کر سکتا ہے۔ یوں اس قابل ہو جاتا ہے کہ ایک ہی اڑان میں بغیر رکے ساری دنیا کے گرد چکر لگا سکے۔ گویا ساری دنیا اس طیارے کی دسترس میں ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، یہ جہاز امریکی طیارہ ساز ادارے "بوئنگ کمپنی" (Boeing) کا تیار کردہ ہے۔ یہ

ایئرفورس ون ...... ایک نظر میں

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

کمپنی دنیا بھر میں بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے۔ یہی کمپنی بوئنگ ۷۰۷، ۷۲۷، ۷۳۷، ۷۴۷، ۷۵۷، ۷۶۷، ۷۷۷ اور جدید ترین طیارہ ۷۸۷ (ڈریم لائنر) تیار کرتی ہے۔ صدر امریکا کا طیارہ بوئنگ ۷۴۷ سیریز کا حصہ ہے۔ اس کمپنی کا کارخانہ امریکا کی شمال مغربی ریاست واشنگٹن کے شہر سیاٹل (Seattle) میں واقع ہے۔

جب امریکی صدر کے یہ دو طیارے ۱۹۹۰ء میں خریدے گئے، تو قیمت ۳۲۵ ملین ڈالر تھی۔ تب ان کی عمر تیس سال قرار دی گئی۔ اب یہ دونوں طیارے ۲۰۱۷ء تک ریٹائر کر دیے جائیں گے۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا طیارہ لے گا۔ ظاہر ہے اس وقت تک امریکا کا نیا صدر بھی منتخب ہو چکا ہوگا۔ موجودہ صدر اوباما اپنی بیوی بچوں سمیت غالباً انہی طیاروں میں سفر کرتے رہیں گے۔

صدر امریکا کا طیارہ فضا میں ۴۵۱۰۰ فٹ بلندی تک پرواز کر سکتا ہے۔ اس کی حد رفتار ۷۰۰ میل (۱۱۰۰ کلومیٹر) فی گھنٹا ہے۔ یاد رہے، فضا میں عام مسافر طیارہ ۳۰/۳۳ ہزار فٹ کی بلندی تک پرواز کرتا ہے۔ اس طیارے میں ۵۳۶۱۱ گیلن (۲۰۳۰۰۰ لیٹر) تیل بھرا جا سکتا ہے۔ گویا یہ

www.pdfbooksfree.pk

آدھی دنیا تک بغیر رکے پرواز کرنے کے قابل ہے۔

جہاز میں کھانا تیار کر کے منجمد حالت میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اسے وقت ضرورت الیکٹرک اوون میں گرم کیا جاتا ہے۔ جہاز میں ۲۰۰۰ کھانے محفوظ رکھنے کی گنجائش ہے۔ اس کے علاوہ فضا میں ایندھن بھرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

جہاز کے دروازے کے ساتھ ہی سوار ہونے اور اترنے کے لیے فولڈنگ (سمٹنے) والی سیڑھی نصب ہے۔ وہ جہاز ہی کا حصہ ہے۔ جہاز کے مواصلاتی نظام میں ۲۳۸ میل لمبے تار آلات مواصلات میں استعمال ہوتے ہیں۔ وہ اسی سائز کے عام مسافر طیاروں میں استعمال ہونے والے تاروں سے دوگنا لمبے ہیں۔

صدر کے ہمراہ سفر کرنے والوں میں مشیر (Advisors)، ڈاکٹر، سروس کے افسران، پریس سیکریٹری، افراد خانہ اور دوسرے خاص مہمان شامل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ صدر امریکا کا پالتو کتا (پپی) بھی اس فضائی محل میں اچھلتا کودتا ہے۔ چار برس قبل جب صدر امریکا مسز اوباما بھارت کے سرکاری دورے پر آئے تو ان کا کتا بھی میڈیا میں موضوع سخن بنا رہا۔ امریکا کے سابق صدر جارج ڈبلیو بش کا کتا بھی ان کے ساتھ ہی سفر کرتا تھا۔ اس کے بھی چرچے لوگوں کی زبانوں پر تھے۔

جب کوئی جہاز کسی دوسرے علاقے کی فضائی حدود میں محو پرواز ہوتا ہے تو اس کی پہچان کے لیے ایک مخصوص نام دیا جاتا ہے۔ جسے ہوابازی کی اصطلاح میں کال سائن (Call Sign) کہا جاتا ہے۔ صدر امریکا کے طیارے کا کال سائن "ایئر فورس ون" (Air Force One) ہے۔ یہ صرف صدر امریکا کے طیارے کے لیے مخصوص ہے۔

یہ کال سائن امریکی افواج اور دنیا بھر کی شہری ہوابازی کے علاقوں میں معلوم ہے۔ یہ امریکی صدر کے طیارے کو کسی بھی قسم کے دوسرے اور فوجی طیاروں سے الگ کرتا ہے۔ اگر صدر کسی فوجی جہاز میں سفر کرے تو اس کا کال سائن "آرمی ون" ہوگا۔ کسی ہیلی کاپٹر میں سفر کرے تو اس کا کال سائن "میرین ون" ہو جاتا ہے۔

صدر امریکا کا خاص جہاز امریکی دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی کے ساتھ ملحق ریاست میری لینڈ میں ہوائی اڈے اینڈریوز ایئر فورس بیس (Andrew Air Force Base) پر کھڑا رہتا ہے۔ یہ واشنگٹن ڈی سی سے ۱۱ کلومیٹر اور وائٹ ہاؤس سے ۲۳ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ وائٹ ہاؤس سے آنے جانے کے لیے صدر امریکا ہیلی کاپٹر استعمال کرتا ہے۔ وائٹ ہاؤس کا فوجی رابطہ کار براہ راست اس طیارے کی نگرانی کا ذمے دار ہے۔

اینڈریوز بیس امریکی فضائیہ کا ہوائی اڈا ہے۔ یہ ریاست میری لینڈ کی پرنس جارج (PG) کاؤنٹی میں واقع ہے۔ یہ ہوائی اڈا اس قدر محفوظ ہے کہ غیر متعلقہ بندہ تو کجا وہاں کسی پرندے کو بھی پر مارنے کی اجازت نہیں۔ راقم کو دورۂ امریکا کے دوران اس ہوائی اڈے کی سیر کا شرف حاصل رہا۔ وہاں اترنے چڑھنے والے طیاروں کی حسن ترتیب دیکھ کر دل میں اس شخص کو داد دی جس نے مجھے یہ مکان کرنے پر دلایا تھا۔

ان دنوں جب وزیراعظم میاں نواز شریف امریکا کے دورے پر واشنگٹن آئے تو ان کا خصوصی طیارہ بھی اسی اڈے پر اترا تھا۔ وہیں سے انھیں ہیلی کاپٹر کے ذریعے وائٹ ہاؤس لے جایا گیا۔

اس ہوائی اڈے کے دو رن وے ہیں۔ ان کی لمبائی ایک کی (۹۳۰۰) فٹ اور دوسرے رن وے کی (۱۱۳۰۰) فٹ طویل ہے۔ اس ہوائی اڈے کا کل رقبہ ۱۸ مربع کلومیٹر ہے۔ اس کے چاروں اطراف سے سخت ترین سکیورٹی کے ذریعے محفوظ کیا گیا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

ایک شکر گزار بیٹے نے کہا

مجھے اپنے باپ پر فخر ہے

ریلوے سے تازیست وابستہ رہنے والی نیک روح کا ماجرا اس نے ساری عمر حلال روزی کمائی اور اولاد کو بھی قناعت و سادگی کا درس دیا

محمد آصف لودھی

لاہور سے ریل پر سفر کا آغاز کیا جائے تو تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر فاصلہ طے کرنے کے بعد واں رادھا رام کا اسٹیشن آتا ہے۔ یہ بستی اب حبیب آباد کہلاتی ہے۔ کئی برس قبل میرے والد محمد ارشاد خان لودھی کیبن مین کی حیثیت سے اس اسٹیشن پر تعینات تھے۔ جب پاکستان ریلوے کے اے ٹی او (اسسٹنٹ ٹریفک آفیسر) کسی ریل میں بیٹھ کر وہاں سے گزرتے، تو وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔ سخت ترین گرمیوں میں انھیں لیور پر بھاری بھرکم پاجامہ اور بنیان پر موٹی قمیص پہننی پڑتی۔

اس وقت وہ نہایت بیزاری کے عالم میں کہتے "یہ جب تک اے ٹی او صاحب کی گاڑی نہیں گزر جاتی، مجھے سکون نہیں مل سکتا۔" نجانے اے ٹی او کو کون سی مصیبت پڑی تھی جو ادھر آ نکلے اور ہمیں پریشان کر کے رکھ دیا۔ اس وقت میری عمر بمشکل آٹھ دس سال ہوگی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ اے ٹی او کس بلا کا نام ہے اور یہ کہاں رہتی ہے۔ اگر آسمان پر رہتی ہے تو پھر زمین

www.pdfbooksfree.pk

پر کیوں اتر آئی ہے۔

میں اپنے والد سے جنون کی حد تک محبت کرتا تھا۔ مجھے وہ کسی سے زیادہ طاقت ور اور ذہین دکھائی دیتے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ میں انھیں دیوارِ چین سے زیادہ بلند اور مضبوط تصور کرتا۔ یہ تصور اس لیے میرے ذہن میں محفوظ تھا کہ زندگی کے ابتدائی برسوں میں جب بھی کوئی مصیبت، بیماری یا پریشانی مجھے لاحق ہوتی، والد اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری حفاظت کرتے۔ انھیں اسی وقت سکون ملتا جب میں نارمل حالت میں واپس لوٹ آتا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میری آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔ والد صاحب کی ڈیوٹی اس دن صبح آٹھ بجے سے شام چار بجے تک تھی۔ سخت ترین سردیوں میں جب ماں انھیں دو دو یا تین تین قمیصیں اور بنیان پہنا کر سردی سے بچانے کی ناکام کوشش کرتی، تو اس سمے میں اپنے والد کو وردی کے اوپر صرف ایک برانڈی (اوور کوٹ نما) پہنے سخت ترین سردی میں کیبن پر سرد ہوا کے تھپیڑوں سے دو دو ہاتھ کرتے دیکھتا۔

اس دن وہ تھکے ماندے شام ڈھلے گھر واپس پہنچے، تو اپنے لاڈلے بیٹے کی سوجی آنکھیں دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ انھوں نے اپنا آرام بالائے طاق رکھتے ہوئے صرف میرے لیے سردیوں کی شام چھے بجے لاہور سے ساہیوال جانے والی ریل پر رینالہ خورد جانے کا پروگرام نہ صرف بنایا بلکہ آدھا گھنٹا پہلے ہی مجھے اپنی آغوش میں لیے واں رادھا رام ریلوے اسٹیشن کے مخصوص بینچ پر آ بیٹھے۔ جب بذریعہ ریل ہم رینالہ خورد پہنچے، تو نہ صرف سردی میں حد درجہ اضافہ ہوا بلکہ بازار کی دکانیں بھی تقریباً بند ہو چکی تھیں۔ ہم حکیم قسم کا ایک ڈاکٹر اپنی دکان ابھی بند کر ہی رہا تھا۔

والد صاحب نے اس سے درخواست کی کہ میرے لختِ جگر کی آنکھیں خراب ہوئی ہیں، از راہِ کرم کوئی ایسی دوائی دیں جس سے یہ جلد ٹھیک ہو جائے۔ اس نے میری آنکھیں غور سے دیکھیں پھر دوائی دے کر یہ کہتے ہوئے ہمیں فارغ کر دیا کہ اللہ نے چاہا تو یہ بچہ دوائی سے ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ کے کرم سے میں ٹھیک بھی ہو گیا لیکن اس شام اور رات کی سخت ترین سردی میں اپنے والد کا ایثار اور شفقت مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ میرے والد واقعی ایک عظیم محافظ اور شفیق باپ تھے۔ ان کی قربانیوں کا صلہ زندگی بھر ان کی خدمت کرنے کے باوجود میں ادا نہیں کر سکا۔

میں جنرل ایوب کی آمد کا تصور کر کے جب میرے والد پریشان ہوتے، تو ان سے زیادہ میں فکرمند ہو جاتا۔ اور سوچتا کہ یہ صاحب ہیں کون؟ انھیں کبھی واں رادھا رام جیسے چھوٹے اسٹیشن پر اترنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ یہ بلا اگر واقعی واں رادھا رام اسٹیشن پر اتر جاتی، تو پتا نہیں وہاں کیا طوفان برپا کرتی۔ یہ تو اس بلا کی مہربانی تھی کہ لاہور سے بذریعہ ریل ساہیوال چلی جاتی تھی۔ اے ڈی سی اپنے ایئر کنڈیشنڈ ڈبے کے شیشے اتارنا بھی گناہ تصور کرتے۔ لیکن ان کا ڈر لاہور سے ساہیوال تک ہر ریلوے اسٹیشن پر تعینات خاکروب سے لے کر اسٹیشن ماسٹر تک کو ہوتا۔ اے ڈی سی ریل جس جس اسٹیشن سے بخیریت گزر جاتی، وہاں کے ریلوے ملازمین کی جان میں جان آتی۔ مشکل کے اس لمحے کئی ملازمین کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا کہ ”جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔“

حالات نے کروٹ لی اور ۱۹۶۳ء کے سال میں چوتھی جماعت میں پہنچا۔ میرے دونوں بڑے بھائی محمد رمضان خان لودھی اور محمد اکرم خان لودھی بالترتیب میٹرک اور

www.pdfbooksfree.pk

آٹھویں جماعت میں پہنچ چکے تھے۔ انھیں پڑھنے کے لیے چونگی جانا پڑتا۔ والد صاحب کی شفقت نے ایک بار پھر جوش مارا۔ انھوں نے اپنی ۸۰ روپے ماہوار تنخواہ میں سے جو ۲۰ روپے بچا رکھے تھے، وہ ڈی ایس آفس کے متعلقہ کلرک کو رشوت میں دے کر اپنی تعیناتی بطور شنٹنگ پورٹر لاہور کینٹ کروالی۔

شنٹنگ پورٹر کا کام بہت خطرناک اور کٹھن ہوتا ہے۔ لیکن انھوں نے صرف اپنے بچوں کو معیاری تعلیم دلوانے کی خاطر زندگی کا خطرناک ترین کام کرنا بھی گوارا کر لیا۔ میں نے کئی شنٹنگ پورٹرز کو معمولی سستی کرنے پر ریل کے نیچے آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا ہے۔ اسے پاکستان ریلوے کی سب سے خطرناک ترین ڈیوٹی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ریلوے افسروں کے نزدیک شنٹنگ پورٹر کے فرائض انجام دینے والوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ وہ انھیں بھی دیگر ملازمین کی طرح جانور کے مانند ہانکتے ریٹائرمنٹ کی دہلیز پر لے جاتے ہیں۔

بہرکیف لاہور آنے کے بعد والد صاحب بڑے شہر کے اخراجات پورے کرنے کی خاطر اپنی ڈیوٹی کے علاوہ چھانگا مانگا اور چیچہ وطنی کے جنگل سے لاہور آنے والی لکڑیوں سے بھرے ڈبے بھی خالی کرنے لگے۔ مجھے یاد ہے، ہم تینوں بھائی اسکول سے فراغت کے بعد والد صاحب کے ساتھ مل کر رات آٹھ بجے تک صرف ایک ڈبا بمشکل خالی کرتے۔ اس کے عوض روزی خان ٹھیکیدار ہمیں صرف تین روپے مزدوری دیا کرتا۔ یہ تین روپے ہی ہمارے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی ہوتے۔

میرے بھائی تو میٹرک پاس کرنے کے بعد کہیں نہ کہیں ملازم ہو گئے۔ میں نے بطور پرائیویٹ امیدوار ایف اے اور بی اے بھی کر لیا۔ میرے والد کی خواہش تھی کہ میں ریلوے میں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر بھرتی ہو کر "باؤ" بن جاؤں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ڈی ایس آفس کے متعلقہ کلرک کو رشوت بھی دی۔ کلرک کے کہنے پر میں ہیڈکوارٹرز میں ریلوے بورڈ کے ایک اہم ترین رکن کی کوٹھی پانچ کلو بغیر کانٹے والی مچھلی دے کر آیا۔ لیکن رشوت کی رقم اور مچھلی، دونوں کام نہ آئی۔

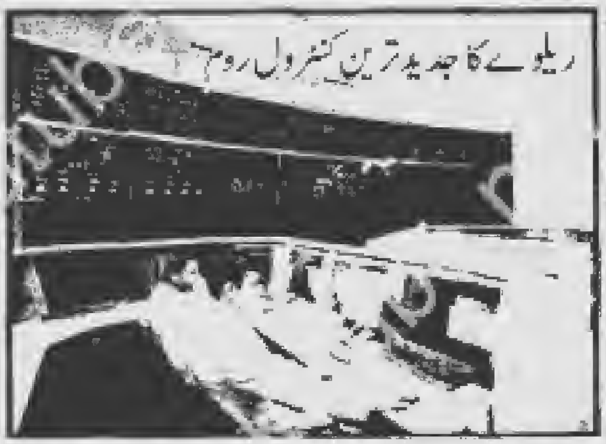
ریلوے کا جدید ترین کنٹرول روم

جب اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی حیثیت سے بھرتی ہونے والوں کی فہرست لگی، تو اس میں میرا نام شامل نہیں تھا۔ نہ صرف مجھے افسوس ہوا بلکہ میرے والد کو بھی بہت صدمہ پہنچا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا خوبصورت سفید رنگ کی وردی پہنے سر پہ سیاہ پی کیپ پہن اے ایس ایم کی کرسی پر بیٹھے اور لاہور میں گاڑیوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کرنے والے کنٹرولر سے فخر سے بات کرے۔ گاڑیاں لاہور سے ہارن بجاتی ساہیوال جائیں اور ان کا بیٹا باہر آتے جانے والی گاڑی کو خوبصورت وردی پہن کر سبز جھنڈی دکھائے۔ اس وقت ٹو اپ، ون ڈاؤن کا نام بہت مشہور تھا۔ تیز گام، تیز رو، خیبر میل، کوئٹہ ایکسپریس بہت "پھنے خاں" ٹرینیں تصور کی جاتی تھیں۔ لاہور میں بیٹھا کنٹرولر ان ریلوں کی نقل و حرکت بہت باریک بینی سے دیکھا کرتا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

مجھے یاد ہے، ۱۹۶۳ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور میں جماعت اسلامی نے ریل کے ذریعے خانہ کعبہ کا غلاف پہلے کراچی بھجوایا۔ پھر وہاں سے بحری جہاز کے ذریعے اسے سعودی عرب بھیجا جانا تھا۔ یہ غلاف کسی ایکسپریس ریل پر موجود تھا۔ وال رادھا رام یقینی سے دوسرا اور چھوٹا سا اسٹیشن ہے، اس لیے وہاں کوئی ایکسپریس گاڑی نہیں رکتی تھی۔ پسنجر ٹرینوں کے ذریعے ہی وہاں کے لوگ سفر کیا کرتے۔

اس زمانے میں "ٹوکن سسٹم" ریلوے میں رائج تھا۔ بغیر رکے جانے والی ایکسپریس ریل کو ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن سے گزرنے کے دوران میں ایک گول چمڑے کا ہوتا تھا، لوہے کی تار سے بنے دل چھلے میں یہ گول ڈالا جاتا۔ بغیر رکے جانے والی گاڑی جس اسٹیشن سے گزرتی، وہاں لوہے کا ایک فریم نصب ہوا رہتا تھا۔ اسٹیشن پر ڈیوٹی انجام دینے والا کانٹے والا وہ گول چھلے سے فریم میں نصب کر کے گاڑی کا منتظر رہتا۔ انجن کے دائیں جانب بیٹھا فائرمین ایک ہک کے ذریعے اس گول کو تیز رفتاری سے اٹھاتا۔ اگر گول اٹھانے میں ناکام رہتا تو اس گاڑی کو اسٹیشن پر رکنا پڑتا۔

غلاف کعبہ لے کر جانے والی ریل کے بارے میں کنٹرولر کا حکم تھا کہ وہ کسی چھوٹے اسٹیشن پر نہ رکے بلکہ اسے زیادہ احتیاط اور تیز رفتاری سے گزارا جائے۔ ایک جانب کنٹرولر کا سخت حکم تو دوسری جانب وال رادھا رام شہر کے لوگ ریلوے لائن پر آ بیٹھے کہ ہم نے خانہ کعبہ کے غلاف کی ہر حال میں زیارت کرنی ہے۔ اس صورت حال میں "ٹوکن" کی غلطی پر والد گرامی برطرف ہو سکتے تھے لیکن انھوں نے ریل روکنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کر لیا۔

اسٹیشن ماسٹر، اے ایس ایم اور ریلوے کا تمام عملہ پلیٹ فارم پر بہت چوکنا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ ریل کا نام کیا تھا لیکن جب وہ آؤٹر سگنل عبور کر کے وال رادھا رام کی حدود میں داخل ہوئی، تو انجن میں بیٹھا فائرمین ہک کے ذریعے گول اٹھانے لگا۔ وہیں لمحے والد صاحب نے فریم کو جھٹکا دے کر گول زمین پر گرا دیا۔ گول نہ ملنے پر ریل کو رکنا پڑا۔ جونہی ریل رکی، ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس میں رکھے غلاف کعبہ کو چومنے لگے۔ جن کی پہنچ سے غلاف کعبہ دور تھا، وہ ریلوے انجن ہی کو چوم کر اپنی عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔

ایک جانب شہر والوں کا جوش و خروش عروج پر تھا تو دوسری جانب اسٹیشن ماسٹر سمیت ریلوے کے تمام عملے کی پتلوں میں اتھل پتھل پڑ گئی۔ کنٹرولر بہت غصے میں دھاڑ رہا تھا کس نے یہ ریل روکی اور کیوں؟ کسی سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ جب والد صاحب سے باز پرس ہوئی، تو انھوں نے کہا کہ میں تو فریم میں گول لگا کر کھڑا تھا۔ اب گول پکڑنا فائرمین کا کام تھا میرا نہیں۔ بہرحال بہت مشکل سے بات آئی گئی ہوئی۔

لیکن اس واقعے کے بعد میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جس کنٹرولر سے ریلوے کا تمام عملہ خائف رہتا ہے، آخر وہ بیٹھتا کہاں ہے؟ اور اس کو کس طرح علم ہو جاتا ہے کہ ریل ابھی پہنچی کہ نہیں؟ اب وال رادھا رام کے پلیٹ فارم پر رکی والی گاڑی جو ساہیوال کی جانب روانہ ہوتا ہے اور ساہیوال سے لاہور جانے والی چھوٹی گاڑیاں روک کر ایکسپریس ریل کو کیسے گزارتا ہے؟

اس انجانی اور ان دیکھی دنیا کا تصور میرے دماغ میں محفوظ تھا۔ میں اے ٹی او کے بعد کنٹرولر کے بارے میں بھی جاننے کی جستجو رکھتا تھا۔ کانٹے والے شنٹنگ پورٹر

کیوں میں اور اے ایس ایف سمیت ہر شخص کی زبان پر کنٹرولر کا لفظ بہت سننے کو ملا۔

میں گزشتہ پچیس سال سے مختلف اخبارات میں باقاعدگی سے کام بطور مضمون نگار لکھتا چلا آ رہا ہوں لیکن کبھی یہ موقع نہیں ملا کہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ڈی ایس آفس کئی وجہ مرتبہ جانا ہوا لیکن اس دفتر میں داخل ہونے کی مجھ میں جرأت پیدا نہیں ہوئی۔ سنا کرتے تھے کہ اس دفتر میں اے ایس او صاحب کے ادارے بیٹھتے ہیں۔ مجھے یہ خیال ذہن میں ابھرتا کہ اگر اے ایس او کا اتنا دبدبہ ہے تو ڈی ایس صاحب (ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ) کے رعب و دبدبے کا عالم کیا ہوگا۔

قدرت نے مہربانی کی۔ میں نے ریلوے ورکر کو مخاطب کرتے ایک کالم لکھا جو روزنامہ نوائے وقت میں ۱۲ جنوری ۲۰۱۵ء کو شائع ہوا۔ اس کالم میں کیبن میں مشقت کرنے والوں کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ازالے کی تجویز دی۔ کالم شائع ہوتے ہی ایک کال آئی۔ معلوم ہوا ڈی ایس لاہور جناب عبدالحمید رازی مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ڈی ایس لاہور کا لفظ سنا تھا کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں پچپن سال پہلے کے دور میں پہنچ گیا جب اے ایس او صاحب کے گزرنے پر میرے والد خوف زدہ ہو جایا کرتے تھے۔ میں نے سوچا اگر ڈی ایس صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو میں دنیا کے خوفناک ترین انسان اے ایس او صاحب کو ضرور دیکھوں گا کہ وہ دکھتا کیسا ہے؟

میں نے اپنے داماد حافظ ... محمود سے رابطہ کیا اور رازی صاحب کے متعلق پوچھا۔ حافظ ... پاکستان ریلوے میں سگنل انجینئر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ریلوے کے بارے میں بہت معلومات رکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ صاف گو ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ صاحب ... ہیں اور انھوں نے ہفتے میں دو دن عام لوگوں سے ملاقات کے لیے مختص کر رکھے ہیں۔ اب عبدالحمید رازی سے بالمشافہ ملاقات کی آرزو دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ ان سے گزارش کی کہ مجھے والٹن ٹریننگ اسکول (اکیڈمی) کا دورہ بھی کرنا ہے۔ میں ایک جانب ریلوے کی ... کا ... دوسری جانب میں اس ادارے کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں جہاں کی راتیں میں نے والد ... رہتے تھے۔

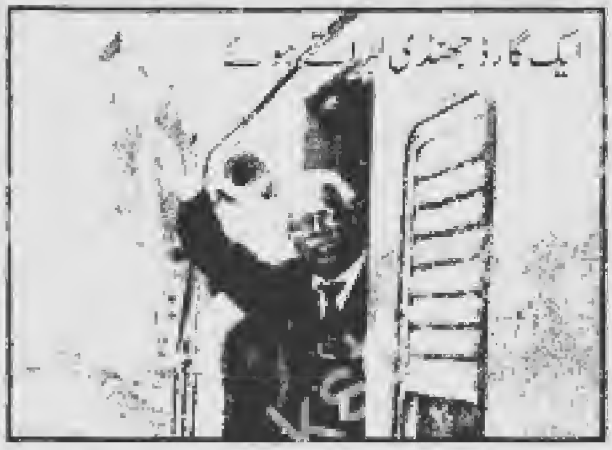

ایک گارڈ جھنڈی لہراتے ہوئے

میں بتاتا ہوں یہ مجھے کی اتنی ہے کہ مجھے ... اور مقامات، مقدس احساس رکھتے جہاں میرے والد کی کسی حوالے سے مقیم رہے۔ ... کہ میں محمود بوٹی ریلوے اسٹیشن بھی دیکھنا جہاں پاکستان بننے سے پہلے سے والد بحیثیت ... کانٹے پر ڈیوٹی انجام دیتے رہے۔ پاکستان بننے کے بعد انھیں اس ریلوے میں بطور کانٹے والا ملازمت ملی جب میری ولادت ہوئی۔ اس لیے دنیا میں میری آمد خاندان کے لیے خوش بختی تصور کیا گیا۔

آخر منگل ۲۷ جنوری ۲۰۱۵ء کو میں صاحب کرامت اور ... قاری محمد اقبال عارف قادری

www.pdfbooksfree.pk

کے ساتھ ڈی ایس آفس پہنچے۔ سرد ہوا کے جھونکے جسم میں تھرتھلی مچا رہے تھے، لیکن ہم ریلوے کی حیرت پراسرار اور حیرت انگیز دنیا دیکھنے جا رہے تھے، اس کی خوشی دیدنی تھی۔ دہشت گردی کے اس دور میں ہر سرکاری دفتر میں رکاوٹیں کھڑی کر کے آنے والوں کے لیے بے پناہ مشکلات پیدا کر دی گئی ہیں، لیکن ڈی ایس آفس میں داخل ہوتے ہوئے کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوئی۔ یہ دیکھ کر نہ صرف میں حیران ہوا بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ ڈی ایس آفس نہیں جہاں اے ٹی او صاحب کے والد بھی بیٹھتے ہیں، بلکہ یہ تو درویشوں کا ڈیرہ ہے جہاں جو چاہے آ جا سکتا ہے۔

جناب عبدالحمید رازی نے اپنی نشست سے اٹھ کر ہمارا استقبال کیا اور سامنے بچھی کرسیوں پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ بیٹھ کر ہم کمرے کا بغور جائزہ لینے لگے۔ کمرے میں ایک طرف لاہور ڈویژن کا نقشہ آویزاں تھا۔ دوسری جانب بہت تاریخی اہمیت کا حامل گھڑیال (وال کلاک) دیوار پر نصب دکھائی دیا۔ ذرا غور سے دیکھا، تو اس پر ۱۶۹۲ء میں لکھا تھا۔ سوا چار سو سال پرانا یہ گھڑیال انگلینڈ کی کسی معروف کمپنی نے بنایا تھا۔ حیرت کی بات یہ کہ سوا چار سو سال گزرنے کے باوجود اس گھڑیال میں زندگی کی رمق باقی تھی۔ حرکت کرتی سوئیاں وقت گزرنے کا بخوبی احساس دلا رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد عبدالحمید رازی صاحب فارغ ہو کر ہم سے مخاطب ہوئے۔ وہ ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ جیسے اہم عہدے پر فائز ہیں، لیکن ان کی شخصیت بہت کھلی ڈھلی دکھائی دی۔ نہ کوئی رعب اور نہ کوئی دبدبہ! میں حیران تھا کہ میرے والد سمیت ہزاروں ریلوے ملازمین جس کے خوف سے تھرتھر کانپتے تھے، یہ ان سے کئی درجے بڑے افسر ہیں لیکن پھر بھی نہایت خوش اخلاق نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ پاکستان ریلوے کے بہترین سفیر ہیں۔ جو اپنے اخلاق اور حسن سلوک سے دوسروں کے دل میں گھر کر لیتے ہیں۔

انھوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ایک کیبن مین کا بیٹا ہوں، میری عزت افزائی کی اور ریلوے کے بارے میں بے شمار معلومات فراہم کیں۔ دوران گفتگو ایک صاحب اندر تشریف لائے۔ رازی صاحب نے تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ یہ ڈی پی او ہیں۔ ان کا نام عمران نذیر ہے۔ گرمجوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد وہ بھی گفتگو میں شریک ہو گئے۔ ابھی اس شخص کو دیکھنے کی آرزو دل میں مچل رہی تھی جس کی آمد کا سن کر میرے والد پریشان ہو جایا کرتے تھے یعنی اے ٹی او......

رازی صاحب نے بتایا کہ آپ جس اے ٹی او صاحب سے خوفزدہ ہیں، یہ ان سے زیادہ بڑے افسر ہیں۔ میں نے مسکرا کے جواب دیا، یہ تو بہت سادہ اور شریف النفس افسر دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے تو بالکل کوئی خوف نہیں آ رہا۔ رازی صاحب نے قہقہہ لگایا اور فون اٹھا کر اے ٹی او صاحب کو بھی بلا لیا۔ اب میری نگاہیں دروازے پر جم گئیں۔ دروازہ کھلا، تو ایک سانولا سلونا درمیانی عمر کا شخص ادب سے نگاہیں نیچی کیے کمرے میں داخل ہوا۔ رازی صاحب نے مجھے مخاطب کر کے کہا "لودھی صاحب، یہ ہیں اے ٹی او صاحب۔ جنھیں دیکھنے کی فرمائش آپ بار بار کر رہے تھے۔"

میرے جسم میں خوشی کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ میں تصور ہی میں اپنے والد سے بولا "ابا جان کاش آج آپ زندہ ہوتے، تو اس کمرے میں پاکستان ریلوے کے سینئر ترین افسروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کس

www.pdfbooksfree.pk

قدر خوش ہوتے۔ ان افسروں میں وہ اپنے ہی کی جھلک دیکھتے جن کے ریل گزرنے سے آپ خوفزدہ ہو جایا کرتے تھے۔"

میں نے رازی صاحب کو بتایا کہ میرے والد ریلوے سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ ریلوے ہی ان کی زندگی کا اہم ترین حصہ تھا۔ انھیں اپنی وردی سے بہت پیار تھا۔ جب ترقی پا کر وہ یارڈ فورمین بنے، تو سیاہ رنگ کی گرم وردی ریلوے کی جانب سے ملی۔ جب گھر پر ہوتے، تو براس پالش سے اپنی وردی کے بیج چمکانے میں مصروف رہتے۔ ہم ان کے سیاہ جوتے بھی پالش سے اس طرح چمکا دیتے کہ چہرہ نظر آجاتا۔ وہ جب وردی پہن کر لاہور جنکشن اسٹیشن پلیٹ فارم پر چلتے، تو ان کے کندھے پر لگے بیج سورج کی روشنی میں جگمگانے لگتے۔

ایک ریل منزل کی طرف رواں دواں ہے

وہاں ڈیوٹی کبھی کبھار انھیں مال گاڑی میں بہ حیثیت گارڈ ساہیوال جانا پڑتا، تو وہ مال گاڑی کے ۴۲ ڈبوں کے بعد ایک ویران کیبن میں بہترین وردی پہن اس طرح بیٹھ جاتے جیسے شادی گھروں کی اسٹیج پر دولہے بیٹھتے ہیں۔ انھیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ مال گاڑی ہے جس کی نہ روانگی کا کوئی وقت تھا اور نہ ہی منزل مقصود پر پہنچنے کا کوئی حتمی پروگرام۔ بعض اوقات تو کسی چھوٹے اسٹیشن کے جنگل میں مال گاڑی کو کھڑا کر کے انجن دار چلا جایا کرتا۔ جنگل والد صاحب کو بھوکا پیاسا رہنا پڑتا تھا۔ ساہیوال پہنچ کر وہ ریسٹ ہاؤس میں چند دن آرام کرتے پھر کسی اور گاڑی کو لے لاہور آجاتے۔

وہ کانٹے والے تھے، لیکن میں یارڈ فورمین یا مال گاڑی کے گارڈ۔ پاکستان ریلوے میں ان کی ساری زندگی سرخ اور سبز جھنڈی دکھاتے ہی گزری۔ رات کو ان کے پاس ایک ہاتھ سے پکڑنے والی لالٹین ہوا کرتی۔ اس میں گودام سے مٹی کا تیل بھروا کر ایک چراغ سا رکھا ہوتا۔ اس میں تین گھومنے والے شیشے تھے: ایک سفید، ایک سبز اور ایک سرخ رنگ کا۔ رات کے وقت جب کسی ریل کو روانگی کا سگنل دینا ہوتا، تو وہ گھما کر چراغ کی روشنی کے سامنے سبز شیشہ کر دیتے۔ جب کسی ریل کو روکنا مقصود ہوتا، تو سرخ شیشہ استعمال کرتے۔ عام حالت میں سفید شیشہ ہی چراغ کے سامنے روشنی فراہم کرنے کے لیے نصب ہوتا۔

انھوں نے پاکستان ریلوے میں ۲۵ دسمبر ۱۹۵۳ء کو بطور کانٹے والا ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۸ء میں لاہور اسٹیشن سے (نابینا پن کے باعث) ریٹائرمنٹ لے لی۔ لیکن اس دوران کوئی ایک تنخواہ بھی انھیں پوری نہیں ملی۔ ریلوے ہمیشہ ہر ماہ تنخواہ سے کچھ نہ کچھ رقم خود ہی کاٹ لیا کرتا۔ والد صاحب ہمیشہ ریلوے سے آنے والی چھوٹی موٹی رقم پر صبر شکر کرتے خاموش ہو جاتے۔

سال میں ایک بار وہ آنکھوں کا طبی معائنہ کرانے لاہور جاتے۔ جتنی راتیں انھیں لاہور میں رکنا پڑتا، میں رات کو خود سوتا اور نہ ہی کسی اور کو سونے دیتا۔ مجھے والد کے بغیر نیند ہی نہیں آتی تھی۔ لاہور سے آنے والی ہر ریل دیکھنے کے لیے دوڑتا ہوا چھوٹے اسٹیشن پہنچ جاتا کہ

www.pdfbooksfree.pk

شاید وہ واپس آ گئے۔ لیکن جب گاڑی گزر جاتی تو میں سوچتا گھر چلا آتا۔

والد سے والہانہ محبت کا اظہار دورانِ تعلیمی دور بھی عروج پر رہا۔ جی۔ سی۔ ای اور دوسری جماعت کا جب امتحان ہوتا تو والد اسکول کی جالی دیوار کے پیچھے اس وقت تک کھڑے رہتے جب تک ممتحن مجھ سے سوال پوچھتا۔ میں سوال سن کے والد کے چہرے کو پیار بھری نگاہ سے دیکھتا پھر نہ جانے کہاں سے بالکل صحیح جواب میری زبان پر آ جاتا۔ اس طرح میں ابتدائی تین مرحلے تو عبور کر گیا لیکن تیسری جماعت کے امتحان کا دن آیا تو والد صاحب زیادہ بیمار ہونے کی وجہ سے میرے ساتھ اسکول نہ جا سکے۔ نتیجہ میں فیل ہو گیا۔ نتیجہ نکلنے کے بعد جب میں منہ لٹکائے گھر پہنچا تو والد نے پوچھا "میرا شہزادہ کیوں پاس ہو گیا ہے نا؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا "ابا جی میں فیل ہو گیا ہوں۔"

یہ سنتے ہی والد صاحب گویا درد سے کانپ اٹھے اور غصے میں … لگے۔ انھیں غصے میں دیکھ کر … والد صاحب نے مجھے ایک … بازو سے پکڑ … اسکول لے گئے اور ہیڈ ماسٹر ابراہیم صاحب سے کہا "میرا بیٹا فیل نہیں ہو سکتا۔ اس کا دوبارہ امتحان لیا جائے۔"

لہٰذا پھر ہیڈ ماسٹر کی ہدایت پر سب کے سامنے مجھ سے سوالات کرنے لگے۔ میں سوال سن کر اپنے والد کا چہرہ دیکھتا پھر جواب دے دیتا۔ ماسٹر صاحب نے مجھ سے سوال پوچھے، میں نے ان کے بالکل صحیح جواب دیے۔ یوں میں تیسری جماعت کا امتحان پاس کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے اس لیے ہیڈ ماسٹر کی بات اب تک یاد ہے "میں نے بچے کی ذہانت نہیں سمجھی۔ یہ اپنے والد سے تو پوری کرتا ہے کہ اس کے اظہار سے وہ بھی پاس ہو جاتا۔ جب جب والد سامنے ہوں تو سب جانتا آ جاتا ہے۔ یہ والد کے بغیر زندگی کیسے گزارے گا؟"

آج جب والد صاحب کو فوت ہوئے تیس سال بیت چکے، شاید ہی کوئی رات ایسی ہو جو خواب کی حالت میں وہ مجھے نہ ملتے ہوں۔ میں آنکھیں بند کروں تو اس دنیا پہنچ جاتا ہوں جہاں میرے والدین موجود ہیں۔ بیدار ہوں تو اس دنیا میں واپس آ جاتا ہوں جہاں وہ کئی برس پہلے … ہیں۔ مجھے خواب میں بھی وہ ریلوے اسٹیشن کے اردگرد اور ریل پر ڈیوٹی انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کسی ٹرین کو جھنڈی دکھاتے ہیں، کبھی ٹرین پر … سے سگنل ڈاؤن کرتے ہیں تو کبھی پلیٹ فارم پر سیاہ رنگ کی وردی پہن کر چہل قدمی کرتے ہیں۔ وہ دنیا سے رخصت ہو چکے لیکن ان کی روح ریلوے اسٹیشن کے اردگرد ہی گھومتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ان کی ریلوے سے والہانہ محبت کا کھلا اظہار ہے۔

اس سے مجھے الف لیلہ کی کتاب میں شامل ایک کہانی یاد آ گئی جو ایک انگریز ٹرین ڈرائیور سے … ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ ریلوے کا ایک ڈرائیور ریٹائر ہوا۔ حسنِ اتفاق سے اس کے انجن کو بھی ناکارہ … قرار دے کر … کھڑا کر دیا گیا۔ ریٹائر ہونے کے باوجود اس ڈرائیور کا یہ معمول تھا کہ جب بھی وردی پہن کر … گھر پہنچتا اور وہاں آنے والے لوگوں کو انجن کے بارے میں بتاتا۔ جب یہ کام کر کے تھک جاتا تو گھر واپس آ جاتا۔

ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ پہلے کی طرح جوان اپنے انجن پر سوار گاڑی کو کھیت کھلیانوں کے درمیان سے تیزی سے گزار رہا ہے۔ وہ اس کے بعد

خوش تھا۔ جب بیدار ہوا تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوش و خرم اور چاق و چوبند تھا۔ بیٹی کے ہاتھ کا بنا ناشتا کر کے وہ جناب گھر کی طرف روانہ ہوا۔ بیٹی نے اتنی جلد جانے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا "آج رات میں نے ایک خواب دیکھا جس میں پہلے کی طرح اپنا انجن چلاتے گاڑی دھکا دے رہا ہوں۔ میرا انجن بھی جوان ہے اور میں بھی۔ پتا نہیں کیوں آج مجھے اپنے انجن کی یاد بہت ستا رہی ہے اور میں جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔"

وہ انتہائی جذباتی انداز میں اپنی منزل پر پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہاں بہت سارے لوگ ارد گرد کھڑے تجسس کی نگاہ سے انجن کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ قہقہے مارتا انجن پر سوار ہوتا اور لوگوں کو اس کے متعلق قصے سنانے لگتا ہے۔ اسی اثنا میں جناب گھر کا نیا گارڈ وہاں پہنچ کر اسے انجن سے نیچے اترنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ گارڈ کو بتاتا ہے کہ میں ہی اس انجن کا ڈرائیور رہا ہوں۔ میں نے ساری زندگی اس انجن کے ساتھ گزاری ہے۔ برائے کرم مجھے نیچے نہ اتارا جائے۔ میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ میری اور میں اس کی زندگی ہوں۔

ڈرائیور کی باتوں کا نئے گارڈ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ بازو سے پکڑ کر ڈرائیور کو نیچے اتار دیتا ہے۔ ایک تو انجن سے جدائی اور دوسرا لوگوں کے سامنے بے عزتی کا غم اسے گھیر لیتا ہے۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا اپنے گھر پہنچتا ہے۔ بیٹی جلد واپسی پر استفسار کرتی ہے۔ لیکن وہ بیٹی سے بات کیے بغیر اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ دوپہر کو جب کھانے کے لیے اسے بیدار کرنے بیٹی کمرے میں پہنچی تو وہ اسے مردہ حالت میں ملا۔

آخر میں نصوری لکھتا ہے کہ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ انسان جس سے محبت کرے، اس سے جدائی برداشت نہیں کرتا۔ جدائی موت کا دوسرا نام ہے۔ کچھ یہی عالم میرے والد کا بھی ہے۔ دنیا سے رخصت ہونے کے باوجود وہ مجھے ریلوے اسٹیشن کے ارد گرد گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ان کی ریلوے سے محبت کا انوکھا اور انمٹ نقش ہے۔

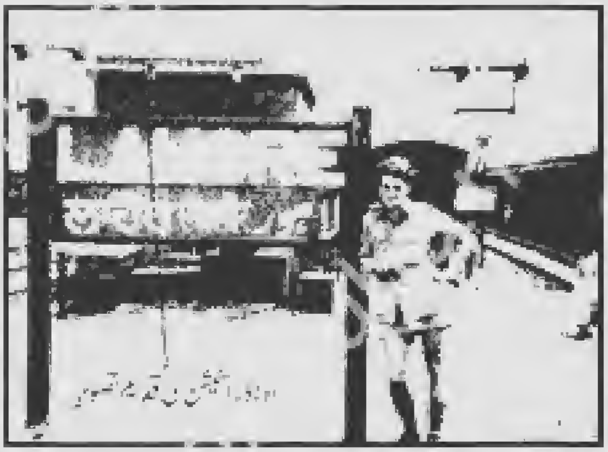
ریلوے اسٹیشن کی قدیم تصویر

اسی طرح ایک ڈراما پاکستان ٹیلی ویژن پر کچھ عرصہ پہلے دکھایا۔ ایک گارڈ ریٹائر ہونے کے باوجود اپنی وردی پہن کر ریلوے لائن کے قریب سبز اور سرخ جھنڈی لیے صبح سے بیٹھ جاتا۔ شام تک جتنی بھی گاڑیاں وہاں سے گزرتیں، وہ ان کو پورے پروٹوکول کے ساتھ جھنڈی دکھا کر اپنے قلبی سکون کا اظہار کرتا۔ جب تھک جاتا تو گھر واپس آ کر اپنی جوانی کے قصے لوگوں کو سناتا جو دوران ملازمت پیش آتے رہے۔

بات کچھ لمبی ہو گئی۔ میرے والد ہی نہیں ان کی اولاد کے خون میں بھی ریلوے کی محبت رچی بسی ہے۔ ہمارے خاندان کے جتنے بھی گھرانے ہیں، وہ ریلوے لائن کے نزدیک ہی آباد ہیں تاکہ چلتی گاڑی کی دھڑ دھڑاتی آواز اور انجن کی سیٹی کانوں میں رس گھول سکے۔ ہمیں دنیا جہان کے گانوں سے زیادہ اچھی آواز چلتی گاڑی اور انجن کی لگتی ہے۔ چلتی گاڑی جب کانٹے بدلے، تو اس وقت جو دھم

www.pdfbooksfree.pk

پیدا ہو، وہی ہماری محبوب ترین آواز بن جاتی ہے۔

بہرکیف اے ڈی او ملک قمر الحق کو سامنے پا کر طبیعت خوش ہوگئی۔ یقیناً میرے والد کی روح بھی پُرمسرت ہوگی۔ ریلوے کا وہ افسر جس کے صرف گزرنے سے ریلوے ملازمین کے سانس رک جاتے تھے، وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے ہمارے درمیان اس لیے موجود تھا کہ میں اس سے بڑے افسر کا مہمان تھا۔ آج اس کا جاہ و جلال ختم ہو چکا تھا اور وہ ایک عام انسان کی طرح ہم سے بات بھی کر رہا تھا۔ قدرت کا یہ ہم پر بہت بڑا احسان تھا۔

عبدالحمید رازی افسر کے بجائے ہر دلعزیز انسان دکھائی دیے۔ ان کی شخصیت اور تربیت کے پیچھے عظیم ماں اور باپ کا ہاتھ ہے۔ بے شک اچھے اور بااخلاق انسان ایسے پھول کی طرح ہوتے ہیں جس کی خوشبو کسی دائرے کی محتاج نہیں ہوتی۔ مجھے زندگی میں چار شخصیات عظیم نظر آئیں ایک ڈاکٹر محمد عارف جو سیکرٹری خزانہ حکومت پنجاب رہے۔ دوسرے جاوید احمد قریشی (سابق چیف سیکرٹری پنجاب)، تیسرے جاوید محمود (سابق چیف سیکرٹری پنجاب) اور موجودہ صوبائی محتسب (پنجاب) اور اب رازی صاحب کو بھی ایسے عظیم لوگوں میں شمار کرتا ہوں جن سے ملنے والا کوئی شخص ان کی شخصیت کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتا۔

اسی اثنا میں پولیس کی وردی میں ملبوس ایک افسر ڈی ایس آفس میں داخل ہوا اور رازی صاحب کو سیلوٹ مار کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ غالباً ریلوے پولیس کا کوئی افسر تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ریلوے پولیس کے تمام کارنامے یاد آگئے جو وہ اکثر و بیشتر انجام دیتی ہے۔ وہ ریلوے کا تحفظ کم چوری کی افزائش زیادہ کرتی ہے۔ کراچی سے پشاور تک ریلوے کی زمین پر جتنی بھی کچی آبادیاں قائم ہیں، وہ ریلوے پولیس کی ''مہربانی'' کا نتیجہ ہیں۔ ان کی مٹھی گرم کرکے جہاں چاہو قبضہ پا لو۔ بلکہ ریلوے پھاٹک اور اسٹیشن کے اردگرد جتنے بھی خوانچہ فروش موجود ہیں، وہ روزانہ ریلوے پولیس کو بھتا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اہلکار پیسے لے کر بغیر ٹکٹ مسافروں کو اپنے ڈبے میں بٹھانے سے گریز نہیں کرتے۔

جب گاڑی چلے تو کچھ مسافروں کی ٹکٹوں کے پیسے گارڈ جیب میں ڈال لیتا ہے تو کچھ اس کی اپنی جیب میں۔ پھر پولیس والے کہاں پیچھے رہنے والے ہیں؟ گویا پاکستان میں ریلوے کا نظام تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا تو اس میں سب سے زیادہ ہاتھ ریلوے پولیس کا ہے۔ عرف عام میں ریلوے پولیس کو چوروں کی نانی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ چیز جو کسی اور جگہ میسر نہ ہو، وہ ریلوے پولیس کے ملازمین کے گھروں میں باسانی مل جاتی ہے۔ ریل کے ذریعے آنے والی لکڑی ہو، مٹی کا تیل، مچھلی، دودھ، چینی یا ڈیزل، وہ پہلے ریلوے پولیس کے ملازمین کے گھر پہنچتا ہے، پھر بچا کھچا منزل مقصود پر۔ جنھیں رکھوالی کے لیے ملازم رکھا جائے جب وہی چوری کرنے لگیں، تو وہ کون سا ادارہ ہے جو اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے؟ ریلوے کا محکمہ اس لوٹ مار کی بہترین مثال ہے۔

دوران گفتگو میں نے رازی صاحب سے درخواست کی کہ بے شک آپ بہت اچھے افسر اور اعلیٰ انسان ہیں۔ اپنے ملازمین کے لیے اچھا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن انجنوں اور ڈبوں کی بوسیدگی، ماتحت ملازمین کے مسائل اور کارکردگی جاننے کے لیے آپ کو بغیر کسی پروٹوکول کے ہر چھوٹے بڑے ریلوے اسٹیشن کا اچانک دورہ ضرور کرنا چاہیے۔ مدعا یہ ہے کہ مسائل کا ازالہ ہو سکے۔ کسی نہ کسی شکل میں ریل گاڑیاں چل تو رہی ہیں لیکن انھیں چلانے والوں کے حالات اور مسائل سے آگاہی آپ کے کارناموں میں مزید نکھار پیدا کر سکتی ہے۔ پھر یہ عمل رب

www.pdfbooksfree.pk

کائنات کی نظر میں بھی نیکیوں میں اضافے کا باعث بنے گا۔ انھوں نے میری بات توجہ سے سننے کے بعد فرمایا "ٹھیک ہے، ایسا ہی ہوگا۔ جب واپس آئیں گے تو یقیناً اپنے سارے وعدے بھول چکے ہوں گے۔"

رازی صاحب نے مجھے اے ٹی او کو حکم دیا کہ وہ ہمیں ساتھ لے جا کر کنٹرول آفس دکھائیں۔ وہ ہمارے ساتھ پیدل چلتے ہوئے کنٹرول آفس کی جانب گامزن ہوئے۔ کسی نے ہوٹر بجایا نہ کسی نے رک کر سلام کیا۔ کنٹرول آفس میں داخل ہوتے ہی بڑی میز پر بیٹھے ایک مصروف شخص سے ہمارا تعارف کروایا۔ وہ بہت خوش اخلاقی سے ملے لیکن ان کا دماغ ریلوے لائنوں پر دوڑتی ریلوں کے تعاقب میں مصروف تھا۔ میں نے سوچا یقیناً یہی وہ خوش نصیب شخص ہے جسے ریلوے کی زبان میں کنٹرولر کہا جاتا ہے۔ اور جو پورے لاہور ڈویژن کی گاڑیوں کی نقل و حرکت کو اپنی ذہانت سے کنٹرول کرتے ہیں۔

پھر ہم لاہور تا فیصل آباد سیکشن کا ٹریفک سنبھال کرنے والے کمرے میں پہنچے۔ وہاں ایک نوجوان سامنے لگے بیٹھے مسلسل مصروف تھا۔ ایک ڈایاگرام نما لکیروں والا کاغذ اس کے سامنے تھا۔ جیسے ہی ریل ایک سے دوسرے اسٹیشن پہنچتی، وہ اسے ڈایاگرام میں لکیر کھینچ دیتا۔ پھر ہمیں لاہور تا ساہیوال سیکشن والے روم میں لے جایا گیا۔ وہاں بھی ایک مستعد نوجوان بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے سامنے بھی بڑے بڑے اسٹیشن کی تمام لائنوں کو ظاہر کرنے والی لکیریں دکھائی دے رہی تھیں۔ میرے سوال پر اے ٹی او نے بتایا کہ نہ صرف تمام آنے جانے والی ریلوں کی نقل و حرکت یہاں سے کنٹرول ہوتی ہے بلکہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کون سی ریل کس پٹری پر کھڑی کرنی ہے اور کس سے گزاری جائے۔

یہاں میں یہ عرض کرتا چلوں کہ عام طور پر درمیانے درجے کے اسٹیشن پر دونوں جانب بنے پلیٹ فارم کے درمیان چار لائنیں ہوتی ہیں۔ پلیٹ فارم کے ساتھ والی لائنوں کو لوپ لائن کہا جاتا ہے۔ دوسری مین لائن کہلاتی ہے۔ جن ریلوں کو اسٹیشن پر رکنا ہو، انھیں پلیٹ فارم کے ساتھ والی لائن پر لایا جاتا ہے۔ ایکسپریس ٹرینوں کو درمیانی لائنوں سے گزارا جاتا ہے۔

کنٹرولر کے دفتر کا دورہ کرتے ہوئے مجھے خانہ کعبہ کا غلاف لے جانے والی ایکسپریس ریل روکنے کا واقعہ یاد آ گیا۔ اس کے رکنے پر کنٹرولر حبیب آباد اسٹیشن کے تمام عملے پر برس رہا تھا۔ شاید اب بھی کسی ایکسپریس ریل کو بغیر اجازت روکنے پر کنٹرولر کا یہی رویہ ہوتا ہوگا۔ یہ پتا نہیں چلا کہ بڑی کی میز پر بیٹھا افسر (شاید کنٹرولر) برستا ہے یا چھوٹے کمروں میں بیٹھے والے افسر ریلوے ملازمین پر غصہ اتارتے ہیں۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام روزانہ لاکھوں انسانوں کی بیک وقت روح قبض کرتے ہیں لیکن اس کام میں لاکھوں فرشتے بھی ان کی معاونت کرتے ہیں۔ شاید اسی طرح کنٹرول آفس میں بھی کنٹرولر تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن اس کے معاون بے شمار ہیں۔ وہ ہر ریلوے اسٹیشن کے عملے بطور خاص اے ایس ایم پر روزانہ گولہ باری کرتے رہتے ہیں۔

آخر وہ دورہ اختتام پذیر ہوا جس کی خوشگوار یادیں ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہیں گی۔ والد مرحوم سے ملاقات تو روزانہ خواب میں ہوتی ہے، لیکن مجھے یقین ہے، کسی رات خواب میں ڈی ایس آفس دورے کے حوالے سے بات ہوئی، تو والد یقیناً بہت خوش ہوں گے۔ وہ کام جو خود نہیں کر سکے، اسے ان کے بیٹے نے انجام دے دیا۔ پھر دل سے یہی آواز نکلتی ہے کہ کاش یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے والد زندہ ہوتے تو میری اس کامیابی پر خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

معاشرتی کہانی

دنیا میں یکتا و نرالا

دیکھنے والا نابینا

ایک بزرگ کا یادگار قصہ، وہ معذوری کے باوجود بھکاری بننے کو تیار نہ تھا

تنویر اقبال، لاہور

سوزوکی جیسے ہی اسٹاپ پر رکی۔ میں نے نیچے اترنا چاہا، تو میرے پہلو میں بیٹھے ایک نابینا بزرگ نے میری کلائی پکڑ لی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سوزوکی سے اترنے میں میرا سہارا چاہتا ہے۔ میں نے کندھوں سے پکڑ کر اسے اترنے میں مدد دی۔ بزرگ جب اتر چکا، تو بھی میری کلائی پر اس کی گرفت بدستور قائم رہی۔

"بزرگ! آپ سوزوکی سے باخیریت نیچے اتر چکے ہیں۔" میں نے اسے یاددہانی کرائی۔

"مجھے اگلے چوک تک پہنچا دو۔" بزرگ نے فرمائش کی۔

"مگر بزرگ! مجھے اس طرف نہیں جانا۔" میں ہرگز پیچھا چھڑانا نہیں چاہتا تھا بلکہ حقیقتاً مجھے مخالف سمت جانا تھا۔ کچھ ہی دور میرا دفتر تھا۔ اگر میں چوک کی طرف جاتا، تو مجھے لمبا چکر کاٹ کر دفتر پہنچنا پڑتا۔ یہ جانتے ہوئے میں نے بزرگ سے پیچھا چھڑانا چاہا، مگر وہ کمبل کی طرح میرے گلے پڑ گیا۔

"جب خلق میں کھڑے ہو چکو، تو اوم کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔" کلائی پر بزرگ کی گرفت بدستور برقرار تھی۔ مجھے ناچار اس کے ساتھ چلنا پڑا۔ بزرگ نابینا ضرور تھا مگر اس کی ظاہری حالت کافی بہتر تھی۔ صاف ستھرا لباس۔ بینائی سے محروم آنکھوں پر سیاہ چشمہ۔ ہاتھوں

www.pdfbooksfree.pk

تن پر بغل میں لٹکا ہوا تھیلا، رنگ کا صاف ستھرا تھا۔ ویسے تو ایسے نابینا بھیک مانگتے نظر آتے ہیں مگر وہ بزرگ مجھے کسی بھی طرح بھکاری نہ لگے۔

لیکن اس نے مجھے جس چوک پر پہنچنے کا کہا، وہاں اکثر بھکاری ہی بیٹھے نظر آتے کہ کوئی ہجوم ہوتا تھا۔ باقی چوکوں کی نسبت وہاں کے بھکاری خاصی بھیک بٹور لیتے تھے۔ بزرگ نے میری کلائی پکڑ رکھی تھی۔ میں طوعاً کرہاً اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ حالانکہ میں تیز چل کر جلد چوک پر پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اس شخص سے جان چھوٹے۔ میں اندر ہی اندر یہ سوچ کر کڑھ رہا کہ بزرگ کو یہ مجبوری ہے جو اس عمر میں بھی سڑک پر بھیک [illegible] اوپر سے گرمی بھی بلا کی تھی۔ ویسے تو ابھی صبح کے نو بجے تھے مگر ان دنوں سورج صبح ہی سے سوا نیزے پر محسوس ہوتا۔ میں بزرگ کے ساتھ قدم بڑھا رہا تھا۔ اب پسینہ آنکھوں کو جلانے لگا تھا۔

"بزرگو! آپ نے کہاں جانا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس چوک تک ہی جانا ہے [illegible] وہیں بیٹھتا ہوں۔" بزرگ نے کہا۔

"کیا آپ وہاں بیٹھ کر بھیک مانگتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

[illegible]

میں سوچ رہا تھا [illegible]

"معاف کرنا بزرگو!" میں نے معذرت چاہی۔ "لیکن آپ چوک میں کیا کیا کرتے ہیں؟"

"سرمہ اور سرمہ سلائی بیچتا ہوں۔" بزرگ نے کہا۔ میں تعجب سے اس کی بغل میں لٹکے تھیلے کو دیکھنے لگا جس میں یقیناً سرمہ اور سرمہ سلائیاں (سرمچو) ہوں گے۔

"یقیناً تم حیران ہو گے کہ نابینا اور سرمے کا کاروبار۔ لیکن واقعی میں سرمہ بیچتا ہوں۔ میں خود پیدائشی نابینا ہوں۔ میرے پاس بینائی نہیں لیکن رب نے یہ نعمت دی، مجھے اس کی حفاظت کا درس دے رہا ہوں۔ جو کسی چیز کی قدر و قیمت کا انسان کو تبھی پتا چلتا ہے جب وہ اسے کھو بیٹھتا ہے۔" بزرگ نے کہا۔

"لیکن بزرگو کوئی آپ کو بیچنے کے بہانے میں دھوکا بھی تو دے سکتا ہے۔ آپ کیسے پتا کرتے ہیں؟"

بزرگ مسکرایا....

"وہ بولا کہ میں نابینا ہوں مگر میں وہ کچھ بھی دیکھ سکتا ہوں جو تم آنکھوں والے نہیں دیکھ سکتے اور [illegible] دیکھتے ہو وہ میں دیکھ بھی نہیں پاتا۔"

بزرگ کے کہنے پر میں متعجب ہوا۔ "آپ کیا دیکھتے ہیں؟" میں نے استفسار کیا۔

[illegible]

"معاف کیجیے گا بزرگو! آپ نے [illegible]

پوچھوں گا کہ میری حالت کا آپ کو کیسے پتا چلا؟" البتہ یہ خیال ضرور ہوا کہ مجھے مزید شرمندہ نہ کیجیے۔" میں نے کہا۔

بزرگ ہنس دیا اور کہنے لگا "کاش لوگ اچھے کپڑے پہن کر شرمندہ ہوں۔ مگر ایسا ہوتا نہیں۔ کوئی چاہے خود کاری کی کمائی نہ کھائے مگر آتے جاتے کھاتا بھی ہے کہ اس نے جو کیا جیب کی کمائی ہے، خود پر گھمنڈ رکھتا ہے۔"

ہم ایک ساتھ چل کر چشتیاں پہنچ رہے تھے۔ اوپر سے سورج آگ اگل رہا تھا۔ ایسی سست رفتار میں دھوپ اور بھی تیز لگ رہی تھی۔ "بزرگ اس عمر اور ایسی حالت میں بھی آپ محنت کرتے ہوئے، کیا آپ کی کوئی اولاد ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"الحمدللہ دو بیٹیاں ہیں۔ مگر ان کے گھر والے کے لیے بوجھ نہیں ہے۔ شاید اللہ والوں نے بیٹا دینا مناسب نہیں سمجھا۔" بزرگ نے بتایا۔

"تو کیا عمر میں پہنچے ہیں آپ کے اخراجات پورے ہو جاتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ساری زندگی تو اوپر والی ذات ہی چلاتی ہے۔ رزق حلال میں برکت وہی ذات ڈالتی ہے۔ کبھی کسی کی محتاجی کرنا پڑے تو برا لگتا ہے۔ ایک مسلمان کی یہ پہچان ہے کہ جب تک جسم مشقت کرنے میں ساتھ دیتا رہے اسے حلال کی روزی کمانی چاہیے۔ جب اس قابل نہ رہے تو زکوٰۃ اور خیرات لینے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر یہ نہیں کہ تندرست اور صحیح سلامت ہوتے ہوئے بھی بھیک مانگتے پھرے۔ الحمدللہ میں مسلمان ہوں اور جب تک جسم نے ساتھ دیا ان شاءاللہ محنت مزدوری سے رزق حلال کمانے کی کوشش کروں گا۔ پھر اللہ تبارک تعالیٰ اپنی ذات پاک کے سوا کسی کا محتاج نہ کرے۔"

میں نے دل میں بزرگ کو خراج تحسین پیش کیا اور پھر بولا "اقبال آپ نے جو کچھ ہم دیکھ سکتے ہیں وہ آپ دیکھنا نہیں چاہتے، یہ بات میرے پلے نہیں پڑی۔"

میں نے کھلا سا سوال کیا تو وہ مسکرا دیا اور بولا "پڑھے لکھے لگتے ہو مگر اتنی موٹی بات نہیں سمجھ سکے۔"

"آپ وضاحت کر دیجیے۔"

"تم جیسا لوگ یہ بے حیائی کی نمائش دیکھتے اور ضرورت کو دیکھ رہے ہو، خدا مجھے بھی نہ دکھائے۔" بزرگ کہنے لگا "خدا نے مجھے بینائی نہ دے کر اچھا ہی کیا ورنہ میں بھی گمراہوں میں شامل ہو کر خدا کو ناراض کر بیٹھتا۔"

"وہ کیسے... میں سمجھا نہیں؟" میں متعجب ہوا۔

"جیسے ہم تم دیکھ رہے ہو کبھی جوان لڑکیاں نہ رو کے، آج کل شہر میں بے پردگی کا ٹرینڈ ہے۔ اگر میری بینائی ہوتی تو میں بھی آوارہ صف میں شامل ہوتا۔ تمھاری بینائی سے میری روشنی اندر سے کہیں بہتر ہے۔" بزرگ نے کہا۔

خدا خدا کر کے ہم منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ میں نے بزرگ کو آگاہ کیا "ہم چوک پر پہنچ چکے۔ بتائیے آپ کو کہاں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کسی سائے میں بٹھا دیجیے، بھکاریوں سے ذرا دور ہی بٹھانا۔"

میں اسے ایک سایہ دار چھجے کی طرف لے گیا۔ جہاں بھکاری بھیک مانگ رہے تھے "اللہ کے نام پر دے دو بابا... خدا خوش رکھے... جگ جگ جیئے... تیری جوڑی سلامت رہے... مولا تجھے دے گا... کوئی اللہ کے نام سے دے جائے گا۔"

میں نے دیکھا ان بھکاریوں میں کچھ تو لنگڑے اور نابینا تھے یا اداکاری کر رہے تھے۔ کچھ ہٹے کٹے مضبوط ہاتھ پاؤں والے لوگ بھی لنگڑے بنے بیٹھے تھے۔ ان کی درد بھری صداؤں پر وہ لوگ جن کے دل نرم ہوتے،

www.pdfbooksfree.pk

دولت اور سکے روٹی کے تھیلوں میں ڈال دیتے۔

بزرگ نے تھیلا زمین پہ رکھا، الحمدللہ کہا اور ایک چادر نکال کر بچھا دی۔ پھر بولا "اس جنگل کی آواز تم ان سے سنو، تھیلا تمہیں، تم دیکھ بھی سکتے ہو۔"

"یہاں میں دیکھ رہا ہوں، یہ تو کافی سکے ہیں۔"

پھر میں بیٹھ گیا، کہنے لگا "میں نے جواب دیا۔"

"یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں۔" بزرگ نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "یہ میری تھی، لیکن مجھے اس سے دور کر دیا گیا، مجھے تھیلا دے دیا۔" بزرگ نے کہا "اس نے یہ تھیلے سے سب میں بانٹ دیا۔ یہ سب میری طرف سے ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے حکومت بخشی۔ اس کی حفاظت کیجیے۔"

مجھے سمجھ آ گئی۔ "جاؤ اللہ سے دعا کرو۔"

میں نے پوچھا "بزرگ آپ کون ہیں؟"

"مجھے دعا دے۔ یہی تھیلا مجھے قرآن پاک نے دیا ہے۔" بزرگ نے تھیلے سے باقی سامان نکال لیا۔

"اچھا بزرگ اب میں چلوں گا، دعا کرنا۔"

میں جانے لگا تو بزرگ نے کہا "ٹھہرو۔"

میں ٹھہر گیا۔ بزرگ نے ایک اپنی مرصع تسبیح نکالی اور میری طرف بڑھائی اور کہا "تم نے میری مدد کی ہے۔ یہ میری طرف سے تحفہ رکھ لو۔ یہ تسبیح میں کسی کو احسان رکھتے تو تمہیں یقین ہے اس وقت تمہارا احترام بھی نہیں کرتا۔ اگر خدا نے موقع دیا تو ضرور اس بوجھ سے چھٹکارا پاؤں گا اور کہو کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے عنایت کردہ نعمت کا شکر اسی صورت بجا لاتے ہیں جب بندہ اس نعمت کی حفاظت کرتے۔

بزرگ کے کہنے پر میں نے مرصع تسبیح لے کر اس کا شکریہ ادا کیا اور دعا لے کر رخصت ہو گیا۔

میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس بزرگ کی ملاقات میں وہ کیا پیغام دے گیا تھا، آپ بھی سوچیے گا۔

◆◆◆

احساس ذمے داری

ایک بدو امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ مانگا۔ امیر المومنین نے فرمایا "میرے گھر میں آج کی روٹی کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔"

بدو مایوس ہو کر چلا گیا۔ وہ بلند آواز سے کہتا جا رہا تھا "بخدا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ آپ سے میرے متعلق باز پرس کرے گا۔"

اس پر امیر المومنین رو پڑے اور اتنا روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ پھر بدو کو بلایا اور اپنے غلام کو آواز دی "قنبر! میری زرہ لے آؤ۔"

قنبر زرہ لایا۔ امیر المومنین نے زرہ بدو کو دیتے ہوئے کہا "یہ زرہ تمہاری ہے۔ اسے بیچ کر ضرورت پوری کرو۔ یہ وہی زرہ ہے جس سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے چہرہ مبارک پر آنے والی پریشانیوں کو بار بار دور کیا ہے۔"

"امیر المومنین! بدو کے لیے تو چند درہم کافی تھے۔" قنبر نے عرض کیا۔

"قنبر! اگر یہ دنیا سب کی سب سونا اور چاندی بن جائے اور میں سب کی سب اس شخص کو دے دوں تب بھی مجھے دلی راحت نہ ہوگی۔

اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اس شخص کے بارے میں جو یہ کہہ رہا تھا، باز پرس کی تو میں کیا جواب دوں گا۔"

(محمد ابن محمد... انتخاب... صفحہ ۱۱۱)

www.pdfbooksfree.pk

ہماری گاڑی چندوادنخاں شہر چھوڑتے ہوئے کھیوڑہ کی طرف رواں دواں تھی۔ راستے میں گورنمنٹ البیرونی کالج، پنڈدادنخاں بھی گزرا۔ اسے دیکھ کر مجھے یاد آگیا کہ اسی علاقے کے ایک امیدوار سے پبلک سروس کمیشن کی انٹرویو کمیٹی نے سوال کیا "یہاں کے کالج کا نام "البیرونی" کیوں ہے؟" اس نے جواب دیا "یہ کالج شہر سے کافی دور واقع ہے اسی لیے۔"

سچ یہ ہے کہ البیرونی نے اس علاقے میں قیام کیا تھا۔ اس نے اسی جگہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف "کتاب الہند" کے کچھ حصے تحریر کیے اور زمین کا قطر بھی معلوم کیا۔ البیرونی کی بابت سوچتے ہوئے ہم کھیوڑہ کان پہنچ گئے۔ ٹکٹ گھر ایک پرانی بنگلہ نما عمارت میں قائم تھا۔ پتھریلے اونچے نیچے راستوں سے ہو کر براہ مرکزی دروازہ کان کے اندر داخل ہوئے۔

ہاتھوں میں بیٹری لائٹس اٹھائے اور سر پر ہیلمٹ پہن کر ایسے لگا، چاند کے سفر پر روانہ ہونے والے ہوں۔

وطن عزیز کے دلکش سیاحتی مقامات

کھیوڑہ سے کلر کہار تک

کوہستان نمک کی تاریخی و تہذیبی جھلکیاں دکھاتا ایک دلچسپ سفرنامہ

پروفیسر اسد سلیم شیخ

www.pdfbooksfree.pk

کان کے اندر داخل ہوتے ہی احساس ہوا، گہری اندھیری غار میں داخل ہو چکے۔ اندر کا درجہ حرارت باہر سے قدرے کم تھا۔ ایک چھوٹی سی ٹرام گاڑی ہمیں کان کے اندرونی حصوں کی سیر کرانے تیار کھڑی تھی۔ پہلے کان سے نمک باہر لانے کے لیے کوئلے سے چلنے والے انجن چلتے تھے۔ ان کے دھوئیں سے کان کی اندرونی چھت اور در و دیوار سیاہ ہو چکے تھے۔ ویسے بھی اندر اندھیرا گھپ تھا مگر ٹرام کی بتی نے اسے کچھ کم کر دیا۔

ایک خطرناک موڑ آیا، تو ہم دبک کر بیٹھ گئے۔ مگر تھوڑے ہی فاصلے پر گاڑی کان کے اندر چاندنی چوک پہ جا رکی۔ وہاں راہبر نے ہمیں ایک دائرے میں کھڑا کیا اور خود ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو کر کان کی تاریخ بتانے لگا۔

کھیوڑہ میں نمک کی یہ کانیں بلحاظ رقبے اور ذخائر دنیا میں سب سے بڑی اور نمک کی پیداوار میں دوسرے نمبر پر ہیں۔ یہاں سے سکندر اعظم کی ہندوستان آمد سے بھی پہلے نمک نکالا جا رہا ہے۔ ابن بطوطہ نے بھی یہاں کا ذکر کیا۔ جب سکندر اعظم کی فوجیں اس علاقے میں آئیں، تو ان کے گھوڑے پہاڑ چاٹنے لگے۔ تبھی یونانیوں کو یہاں نمک کی موجودگی کا پتا چلا۔ پہلی بار باقاعدہ طور پر کھیوڑہ سے نمک اکبر اعظم کے عہد میں نکالا گیا۔

کہا جاتا ہے، ایک مقامی شخص "اسپ خان" نے اکبر کو یہاں نمک کی موجودگی کی اطلاع اس شرط پہ دی کہ وہ جب تک زندہ رہا اسے کان سے ہونے والی آمدنی کے برابر رقم بطور انعام ملتی رہے گی۔

جدید سائنسی بنیادوں پر کان سے نمک کا حصول انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں شروع ہوا، تب نمک نکالنے کے لیے مرکزی سرنگ کھودنے کا سہرا ڈاکٹر وارتھ نامی انگریز کے سر ہے جس نے ۱۸۷۲ء میں یہ کارنامہ انجام دیا۔ یہ کانیں اب تجارتی و صنعتی اہمیت ہی نہیں رکھتیں بلکہ ہر سال ہزاروں افراد بہت شوق سے یہ خوبصورت کان دیکھنے آتے ہیں۔ وہاں سے ... پہاڑ ... جس سے ... تیار کیا گیا ہے۔

صاحب تحریر

پروفیسر اسد سلیم شیخ کا تعلق وسطی پنجاب کے قصبے پنڈی بھٹیاں سے ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجوایشن کر کے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے سیاسیات کی ڈگری پائی۔ شعبہ درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔ آج کل گورنمنٹ ڈگری کالج پنڈی بھٹیاں میں بطور وائس پرنسپل تعینات ہیں۔ قومی اخبارات میں مضامین اور کالم نگاری کرتے ہیں۔ رائٹرز گلڈ پنجاب کے رکن اور ورلڈ بھٹی سنگت پنجاب کے چیئرمین ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں حکومت پاکستان نے انھیں علمی و تحقیقی خدمات کے صلے میں صدارتی ایوارڈ "اعزاز فضیلت" سے نوازا۔ ۲۰۰۱ء میں راولپنڈی آرٹس کونسل کی طرف سے ان کی کتاب "انسائیکلوپیڈیا تحریک پاکستان" پر تحریک پاکستان میڈل ملا۔ وزارت ثقافت حکومت پنجاب کی طرف سے کتابوں حاکمان پنجاب اور نواب سعد اللہ خان پر ایوارڈ دیے گئے۔ آپ کی تصانیف میں ڈھلے دی بار، وسیب، ٹھنڈی سڑک (مال روڈ لاہور کا منظر نامہ)، اور کچھ سفر بھولتے نہیں (سفرنامہ) شامل ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

...ہوں کی تاریخ بھی ختم ہوئی تو سورت کی تحقیق سے
کی اور شکلوں سے جب تک جب تک کر کی مسجد ظفر قلی۔ یہ
بھی ایک عجوبہ ہے۔ ساتھ ہی کمان کی چھت سے تنگ
سے آنسو ٹپک ٹپک کر زمین پر یوں جم گئے تھے کہ وہ
قدرتی نگینوں کا منظر دکھائی دیتے۔ اسی چوک میں تنگ
کی ہاتھوں سے چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہیں جہاں
سے نے مریضوں کو رکھا جاتا تھا۔ چونکہ بڑے بڑے تو
ایک بڑے ہال میں پہنچے جس کے دونوں طرف ٹھنڈے
پانی سے بھرے تالاب تھے۔ اس ہال سے اب تک اس
سمت تالاب جو بعد ازاں کی چھت بہت بلند ہو چکی۔

اس کے اوپر اٹھنے کے لیے دو سیڑھیاں ہیں چھت کے ایک سوراخ سے بلند بہت بڑا اس نے خوبصورت ... کرتی

کٹاس مندر کی ایک خوبصورت تصویر

چمکتی ہیں۔ جب سورج کی کرنیں اندر آتی ہیں تو بلند روشنی کا کوئی جب اتنا
سوراخ میں دو دو خوبصورت ... چھت تک سے آتی۔ اس
روشنی سے ہمیں ہال کی وسعت، بلندی اور نقش و
نگار دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ایک عجیب اور دل فریب
منظر تھا۔ وہاں سے نکلے کہ یہاں کی قلعوں کی شوکت بھی
ہو چکی۔

یہاں سے نکلے تو راہبر ہمیں ایک بڑے تالاب کی
طرف لے گئے۔ اس کے اوپر لکڑی کا پل بنا تھا۔ رنگ برنگی
روشنیاں تالاب کے پانی سے ٹکرا کر بہت خوش نما منظر
پیش کر رہی تھیں۔ پل پر کھڑے ہو کر تالاب کی گہرائی کا
اندازہ لگایا۔ ٹھنڈے پانی کی وجہ سے تالاب میں اتر نہیں
جاتے۔ تو اترنا نہیں۔ مگر ہمارے خیال میں پہنچا بھی
تھی۔ روایت ہے کہ تالاب میں پتھر پھینکتے وقت انسان
کے دل میں جو خواہش ہو، وہ پوری ہو جاتی ہے۔ ہماری تو
صرف یہی خواہش تھی کہ وہ تمنا پوری ہو جائے۔ اس لیے
صرف ایک پتھر پھینکا۔ مگر دیکھا کہ دوسرے کئی ساتھیوں
نے دو دو پتھر پھینکے۔ شاید انھوں نے تالاب کا رقبہ کم
دکھا تھا۔

ہماری خواہشیں تھیں کہ یہ خواہش پوری ہو جائے
بہت لگے ہیں سے اب تک پتھر بھی کم ہیں ہیں تاہم خواہشیں ہے کمان کا اندر اندرونی حصہ ختم ہوا باہر نکل کر ہم پھر اگلی منزل کٹاس کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس علاقے راستے ... کی
اونچائی بڑھتی، اونچائی میں اضافہ ہوا گویا پہاڑ اور
میدان بھی اپنا رنگ بدل رہے تھے۔ کہیں سرسبز میدان
آجاتے تو کہیں سرخی مائل، پتھریلی زمین کے قطعے
دکھائی دیتے۔ چوآ کھنڈ کا سفر طے ہوا ہوگا کہ پہاڑوں
کے دامن سے اچانک سیمنٹ فیکٹری کی چمنیوں سے
اٹھتا دھواں دکھائی دیا۔ اس میں وہاں کام کرنے والے
سینکڑوں مزدوروں کا خون پسینا بھی شامل تھا۔

تیس منٹ کے سفر کے بعد قصبہ چوآ سیدن شاہ
آ گیا۔ یہ قصبہ وہاں مدفون بزرگ حضرت سیدن شاہ کے
نام سے منسوب ہے۔ "چوا" کے معنی ہیں چشمہ۔ روایت

www.pdfbooksfree.pk

[illegible]

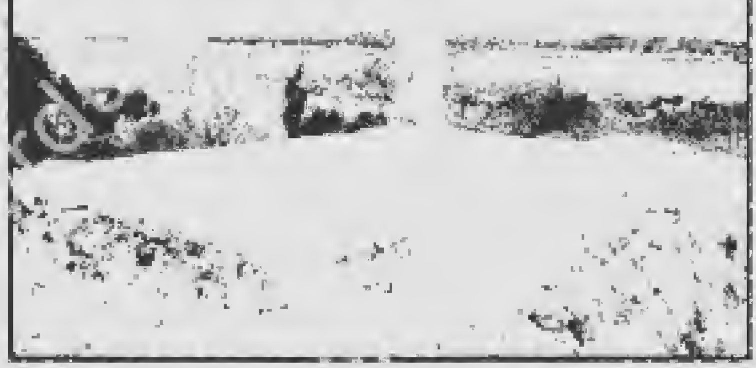

تخت بابری جہاں شہنشاہ بابر کھڑا ہوتا تھا

[illegible]

www.pdfbooksfree.pk

کلرکہار بھی آ گیا۔

جھیل کی طرف جانے والی بل کھاتی سڑک کی طرف مڑے تو تاحد نظر پھیلے باغات نے ہمارا استقبال کیا۔ عطر اور سرد ہوا بدن چھونے لگی۔ پُرکیف و سرور کے عالم میں گاڑی سے اترے۔ تارنگی وادی کا قدرتی حسن و جمال ہمارے سامنے تھا۔ تاحد نگاہ پھیلے باغات میں پھلوں کی مہک، کوئلوں کی کوک اور موروں کی چھوں چھوں کی مدھر آوازوں نے اس خوب صورت اور سحر آگیں جھیل کا روپ نکھار دیا۔

جنرل [illegible] کے بقول اس وادی کا پرانا نام "شاکلپا" تھا۔ اس کو "کلرکہار" بھی کہا گیا۔ مغل بادشاہ بابر یہاں آئے تو تخت بابری کے نام سے پہاڑ کی چٹان تراش کر ایک تخت بنوایا۔ اسی پر کھڑے ہو کر وہ اپنی فوج سے خطاب کیا۔ نیز "باغ صفا" کے نام سے ایک خوب صورت باغ بنوایا۔ یہ برصغیر میں پہلا مغل باغ تھا۔ تخت بابری اور باغ صفا کلرکہار میں مغلیہ دور کی بہترین یادگاریں ہیں۔

باغ کی دیکھ بھال موتی شجن میں آباد شیخ محمد [illegible] خاندان کے مورث اعلیٰ بابا [illegible] کے ذمے تھی۔ آج یہ باغ تاحد نظر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بیچ ایک وسیع جھیل ہے جس کا پانی نمکین تھا۔ اس پر تیرتی مختلف رنگوں کی کشتیاں بہت بھلی لگیں۔ کناروں پر تیرتی مچھلیاں [illegible] کی وجہ سے مرکز نگاہ تھیں اور آبی پرندے ان کے اوپر منڈلا رہے تھے۔ یہ قدرتی چشموں کے پانی سے بننے والی جھیل ہے۔ اس کے کناروں پر بچوں کے کئی جھولے بنے ہیں۔ ایک اونٹ اور ایک گھوڑا بھی سیاحوں کی سواری کے لیے موجود تھے۔

جھیل کی سیر سے فارغ ہو کر تخت بابری کا نظارہ کیا تو خود کو مغل بادشاہ بابر سمجھنے لگے مگر نیچے کوئی فوج نہ تھی جسے خطاب کرتے۔ تخت پر کھڑے ہو کر نظر دوڑائی۔ تو نیچے لوکاٹ اور کیلے کے باغات تھے، سامنے خوبصورت جھیل کا رواں دواں پانی اور بائیں طرف کلرکہار کی چھوٹی آبادی۔ تخت بابری کے اوپر دو تین خوب صورت ریسٹ ہاؤس بھی ہیں۔ ان میں سے ایک قصر ناز کے نام سے منسوب تھا۔ یہ باغ صفا کے درمیان واقع ہے۔ اب اس کے دروازے پر "دیوانِ [illegible]" درج ہے۔ ساتھ ہی شاعر مصطفیٰ زیدی کا یہ شعر درج ہے:

کسی پتھر پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

دراصل یہ [illegible] اس ریسٹ ہاؤس [illegible] جہلم کے ڈپٹی کمشنر اور شاعر مصطفیٰ زیدی نے ۱۹۶۱ء میں [illegible] تھا۔ وہیں بیٹھ کر انھوں نے اپنی محبوبہ کی یاد میں کئی غزلیں لکھیں۔ اب یہ ریسٹ ہاؤس کلرکہار کے اسسٹنٹ کمشنر کی رہائش گاہ میں تبدیل ہو چکا۔ اس کے بالمقابل خوبصورت سفید [illegible] اور [illegible] آشیاں ریسٹ

www.pdfbooksfree.pk

باؤس واقع ہے جسے ضلعی حکومت نے تعمیر کیا۔ ہم نے اسی میں پڑاؤ کیا۔

کلرکہار میں شام اترتے ہی خاموشی چھا جاتی اور عجیب قسم کا سکون محسوس ہوتا ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں ستا کر ہم پہاڑی پر واقع مزار "تخت آہو باہو" چلے گئے۔ اس دربار پر شیشے اور کاشی کاری ایسی عمدگی سے کی گئی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ روایت کے مطابق یہ دربار غوث الاعظم کے دو پوتوں، سید محمد یعقوب اور سید محمد اسحٰق کا ہے۔ ان کے دادا حضرت عبدالقادر جیلانی نے انھیں اس علاقے میں تبلیغ دین کے لیے بھیجا تھا۔ مقامی قبائل سے لڑائی میں انھوں نے جام شہادت نوش فرمایا۔ انھیں پہاڑ کی چٹان پر موجود دربار میں دفن کیا گیا۔

اس دربار پر بڑی تعداد میں موروں اور کبوتروں کا بسیرا ہے۔ کبوتر دن رات دربار ہی پر رہتے ہیں۔ مور دن بھر باغوں میں پھرتے اور شام کو دربار آ جاتے ہیں۔ جب سورج غروب ہونے لگے، تو مور اس منظر سے بہت لطف اندوز ہوتے اور سرور میں رقص کرتے ہیں جسے مقامی زبان میں "پائل" کہا جاتا ہے۔

ہم مزار پر فاتحہ خوانی سے فارغ ہوئے، تو باہر دکانوں کا جائزہ لینے گئے جہاں مختلف اشیا برائے فروخت رکھی تھیں۔ ان میں عرق گلاب، عرق چوعرق اور گل قند نمایاں تھے۔ یہ چیزیں مقامی سوغات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک آدھ دکان پر پتھر کی بنی اشیا بھی دیکھیں۔ سب نے پسند کی اشیا خریدیں۔ شام تیزی سے رات میں تبدیل ہو رہی تھی۔ چنانچہ ہم نے واپسی کے سفر کا آغاز کر دیا۔

◆◆◆

لکھیے اور معقول معاوضہ پائیے

گستاف فلابیر فرانس کا ممتاز تصوراتی گزرا ہے۔ اس کا قول ہے: "لکھنا ایسا فن ہے جس کے ذریعے آپ اپنے دل و دماغ میں پوشیدہ جذبے اور خیال دریافت کرتے، بوجھتے ہیں۔"

اُردو ڈائجسٹ آپ کو بھی لکھنے کی دعوت دیتا ہے

کہانی لکھیے، سچا واقعہ، آپ بیتی، مزاح یا معلوماتی مضمون! یا پھر کسی اصلاحی موضوع پر قلم اٹھائیے اور ایسی تحریر تخلیق کیجیے کہ وہ قاری کی زندگی میں انقلاب لے آئے۔

عمدہ شہ پارہ تخلیق کرنے پر آپ کو جو قلبی مسرت ہوگی، اس کی اہمیت اپنی جگہ! اُردو ڈائجسٹ میں جگہ پانے پر وہ آپ کو معقول معاوضے کا حقدار بھی بنا دے گی۔ آخر میں مشہور برازیلی ادیب، پاؤلو کیولو کا یہ قول بھی مدنظر رکھیے:

"ساجھے داری (Sharing) کا دوسرا نام لکھنا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے خیالات، نظریات اور تجربوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔"

(ادارہ اُردو ڈائجسٹ)

www.pdfbooksfree.pk

شادی کی سلامی

منگتے والے بچوں پر نچھاور کر دینے والے میزبان کا سبق آموز قصہ

www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.pk

اسے گھورتا رہا۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رقم واقعی معقول تھی میری تو جیسے بجائے چاندی ہو گئی۔ پورا ہفتہ میں بھیک مانگنے نہیں گیا بلکہ اس رقم سے خوب عیاشی کی اور نمبر بھی کھیلے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اب میرے پاس صرف پندرہ سو روپے باقی رہ گئے تو مجھے فکر لاحق ہوئی کہ اگر بازار جا کر اسی طرح پر بیٹھا تو ان صاحب سے ناگزیر ملاقات ہوئی تو کیا جواب دوں گا؟

اسی ادھیڑبن میں ایک دن اور گزر گیا۔ نجانے میرے انجان مہربان کی آنکھوں میں کیا بات تھی کہ میں اس کا سامنا کرنے کی اپنے اندر ہمت نہ پاتا۔ برسوں سے بغیر مشقت مفت کی کھا رہا تھا۔ چار پانچ ہزار روپے کی خاطر یہ دھندا چھوڑنا بہت مشکل لگا۔ یہ خیال بھی آیا کہ وہ میرا کیا بگاڑ لے گا اگر میں نے کاروبار نہ کیا تو؟ اسی رات میں نے بڑا ہی ڈراؤنا اور عجیب و غریب خواب دیکھا۔ جیسے میرے چہرے سے گوشت نوچ لیا گیا ہو۔ میں جدھر بھی جاتا لوگ ڈر کے مارے چیخیں مارتے بھاگ جاتے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بے ساختہ میرے ہاتھ اپنے چہرے پر گئے۔ شکر خدا کا کہ وہ ٹھیک تھا۔

میں حسب معمول گھر سے بھیک مانگنے نکلا۔ حیرت انگیز طور پر میرے قدم اس منڈی کی طرف اٹھ گئے جہاں سے دکاندار تھوک میں سودا سلف خریدتے تھے۔ جیب میں پندرہ سو روپے تھے اور انہی پیسوں سے میں نے بھی ٹافیاں، نمکو، پاپڑ اور دیگر چیزیں خریدیں اور اسی تختے پر آ بیٹھا جہاں کئی لوگ مجھے صدقہ، زکوٰۃ اور خیرات دیا کرتے تھے۔ اس روز جس نے مجھے جتنی رقم دی میں نے اسی حساب سے اسے سودا دے دیا۔ جس نے سودا لینے سے انکار کیا اس کی رقم لوٹا دی۔ لیکن شیطان مجھے ورغلاتا کہ رکھ لو وہ تمھیں خوشی سے دے رہا ہے مگر میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ بھیک ہرگز نہیں لوں گا خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ میں اعوذ باللہ کا ورد شروع کر دیتا جس سے تقویت پاتا اور شیطانی وسوسے دور ہو جاتے۔ خیر آہستہ آہستہ میرا کاروبار چل نکلا لیکن آمدن معقول نہیں تھی۔ اس پر میں فکرمند رہنے لگا۔

بہرحال محنت کی روٹی کھانے پر میرا ضمیر مطمئن رہنے لگا۔ میں سمجھتا ہوں یہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے اس محسن کی مہربانی تھی جس نے مجھے کاروبار کی نہ صرف ترغیب دی بلکہ مالی معاونت بھی کی۔ ایک دن اچانک وہ میرے پاس آیا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ عیاں اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے میرا حال احوال پوچھا اور آمدن کے بارے میں بھی جاننا چاہا۔ میں نے بتایا کہ لوگ اب بھی مجھے بھیک دینے کی کوشش کرتے ہیں تو میرے محسن نے ایک تختہ دیا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا:

"بھیک نہیں مجھ سے سودا لیجیے۔"

میں نے وہ تختہ اپنی پشت پر لٹکا دیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب اچھے لوگ بھی راستے پر چلتے چلتے کچھ نہ کچھ خرید لیتے۔ خدا کے فضل سے کاروبار میں اتنی برکت ڈالی کہ میں نے تین پہیوں والی سائیکل خرید لی جس کے پیچھے میری چھوٹی سی دکان ہے۔ میں اپنے علاقے کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی پھیری لگاتا ہوں۔ اب میں نے کاپیاں، پنسلیں اور دیگر اسٹیشنری کا سامان بھی رکھ لیا ہے۔ پھر ان میں بچوں کے لیے رنگ برنگے مختلف شکلوں کے غبارے بھی

www.pdfbooksfree.pk

پہنچنے شروع کیے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اپنے والدین کو ضد کر کے غبارے خریدنے پر مجبور کرتے جو انھیں چار و ناچار مجھ سے لینے ہی پڑتے۔ مختصر یہ کہ باعزت طریقے سے میں پندرہ سولہ ہزار ماہانہ کما لیتا ہوں۔ دکاندار مجھے ادھار سودا دینے پر آمادہ ہیں بلکہ زبردستی دینے کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن میں اس سے کتراتا اور تھوڑے ہی کو بہت سمجھتا ہوں۔

وہ لوگ جو کبھی مجھے معذور سمجھ کر میری مالی اعانت کیا کرتے تھے، اب بخوشی مجھ سے سودا لیتے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ مجھ سے سودا لیا کریں جو میرے کاروبار اور میرے لیے تقویت کا باعث بنا۔ بعض مہربان تو اپنے بچوں کی کاپیاں، پنسلیں، روشنائی، ربڑ اور قلم تراش اکٹھے ہی منگوا لیتے جس سے میری آمدن تیزی سے بڑھنے لگی۔ کاروبار کی برکت سے نہ صرف میری مشکلیں دور ہوئیں بلکہ میرا رہن سہن اور حلیہ بھی درست ہو گیا۔ اچھالی برائے معذوراں سے تا حال وہیل سہولت سے میں اپنی مصنوعی ٹانگ لگوا رہا ہوں، جنھوں نے میری ٹانگ کا ناپ لے کر ترقی کو آگاہ کر دیا ہے۔ دو لاکھ روپے خرچ آئے گا۔

محلے میں لوگ میری عزت کرتے اور دوسروں کو میری ہمت اور مستقل مزاجی کی مثال دیتے ہیں۔ اب میں کوٹھڑی کا دو ہزار روپے ماہانہ کرایہ ادا کرتا ہوں اور اسے سامان آرائش سے بھی سجا لیا ہے۔ بنگلہ کا شوق بھی تھا اور ہوٹی بھی جس پر میں سے سب رکھی ہے جس کا آدھا خرچ میں ادا کرتا ہوں۔ آج کل میری ایک غریب اچھی دوشیزہ سے رشتے کی بات چیت چل رہی ہے۔

میں اپنی معذوری سے صرف اس وقت دل برداشتہ ہوتا جب مجھے رفع حاجت کی حاجت ہوتی۔ نہایت جانگسل اور اذیت ناک مرحلہ ہوتا۔ کئی بار طہارت کے دوران میرے کپڑے بھی خراب ہو جاتے اور میں لڑھک کر گر جاتا تو بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ تب وہ ٹانگوں والوں پر مجھے رشک آتا اور اللہ کے حضور گڑگڑانے لگتا۔ پھر اس رحیم و کریم ذات نے اپنے غیبی خزانے سے مجھے دولت سے نوازا۔ کئی ماہ آنے جانے سے پہلے میں نے غسل خانے میں کموڈ لگوایا جس کے ساتھ نصب مسلم شاور نے مجھے اس اذیت سے نجات دلا دی۔

ایک دن میری اپنے محسن سے ملاقات ہوئی۔ انھیں اپنا حال احوال بتایا اور یہ بھی کہ عنقریب میری شادی ہونے والی ہے۔ اتفاق سے اس روز میری جیب میں پانچ ہزار روپے موجود تھے۔ یہی رقم جو مجھے بطور قرض ملی تھی۔ میں نے اپنے محسن کو روپے لوٹانے چاہے تو انھوں نے کہا: آپ میری طرف سے اپنی شادی کی سلامی سمجھو۔ یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے چل دیے۔

سنہرے پھول

۱۔ صرف مال کمانے میں نہ لگے رہیے ورنہ آپ عزیز و اقارب کو گنوا بیٹھیں گے۔

۲۔ سب لوگوں کو ایک جیسا مت سمجھیے۔ ان کی طبیعتیں کتنی رنگارنگ اور مختلف ہیں، آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

۳۔ لوگوں سے ایسی باتیں کیجیے جن میں وہ دلچسپی لیں نہ کہ ایسی باتیں جن سے آپ کو دلچسپی ہے۔

۴۔ جس شخص سے آپ کا میل جول ہے اس کا مزاج سمجھنا آپ کی مشکلات میں کمی کا باعث ہو سکتا ہے۔

۵۔ شہد کی مکھی کا طرزِ عمل اپنائیے جو میٹھے پر بیٹھتی اور کڑوے سے کتراتی ہے۔ گھریلو مکھی کی طرح نہ بنیے جو ہمیشہ زخموں کی تلاش میں رہتی ہے۔

(امیر حمزہ بن مشتاق، داور بونی)

www.pdfbooksfree.pk

معاشرتی کہانی

ہماری مذہبی و قومی اقدار پر

شیطان کا وار

بے حیائی کا امڈتا طوفان ہمارے مقدس رشتوں کو بھی پامال کرنے لگا

چھوٹی [illegible]

[illegible]

قبل اس کے کہ پنکی کی سسرال کا کوئی فیصلہ ہوتا اور چاند پرانے قصے ختم ہو جاتے، دادی جان نے نیا موضوع اٹھا دیا۔ "میں تو اس کا نام روشن رکھوں گی۔ چاند کا ٹکڑا ہے میری پوتی۔"

دن گزرتے رہے، وقت گزرتا رہا۔ پنکی بہت ہی پیاری تھی۔ وہ بچے بے اختیار پیار کرتے تھے۔ دادی تو تمام دعائیں اور آیات پڑھ پڑھ کر پھونکتی تھیں، مبادا اپنے پرائے کی نظر لگ جائے۔ وہ ان بچوں کی محبت میں سے والہانہ نظروں اور دعاؤں میں پھول کی طرح پرورش پانے والی بچی اب آہستہ آہستہ بڑی ہو رہی تھی۔ وقت تو تیزی سے چلنے والی گھڑی ہے، وہ قدرت کے مقررہ وقت پر چلتا جاتا ہے۔ بچے بڑے اور بوڑھے ہو گئے!

سوچیں پیچھے چھوڑتے ہوئے لڑکی بھی عمر کے اس دور میں آ پہنچی جب بے پناہی آتی ہے۔ جب روشنی میں بھی اندھیرے نظر آتے ہیں اور تو اور بھی گھر آنگن سے اڑنے لگتے ہیں۔ گھر والوں کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وقت چلا جا رہا تھا۔

٭٭

شعیب اور زبیر خان آپس میں چچازاد تھے۔ ایک مشترکہ حویلی میں رہتے، دادا جی کے زمانے سے ایک ساتھ رہتے تھے۔ خاندان اور رشتوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کی دوستی تھی کہ زمین کی تقسیم بھی نہ ہو سکی۔ دونوں کے والدین ایک ہی گھر میں رہا کرتے تھے۔ بچپن سے ساتھ پلے بڑھے۔ ہم عمر، ہم مزاج، ہم مکتب۔ یکساں مشاغل کے شوقین اور مطالعہ کرنے والے۔

بھائیوں میں اختلاف ہو جاتا ہے، لیکن ان دوستوں کا معاملہ ہی نرالا تھا۔ ہر معاملے پر دونوں کی رائے یا فکر ایک ہی ہوتی تھی۔ ان میں بڑے نظریے یکساں

ہماری معاشرتی قدریں بھیانک طوفان کی زد میں ہیں۔ ایسے سانحات جنم لے رہے ہیں کہ قلم تحریر کرنے سے قاصر ہے۔ عشروں سے ہمارے گھروں کی دہلیز پر ایک نادیدہ رکاوٹ ہماری گھریلو معاشرت کی محافظ تھی۔ جب رکاوٹ ہٹا کر گھر کو گزرگاہ بنا دیا گیا، تو شیطانی تہذیب اپنے پورے ہتھیاروں کے ساتھ اس میں وارد ہوئی۔

اب حال یہ ہے کہ موت تو گھر کے اندر ہے اور باہر صحرا کی شریر رات اور تماشا دیکھنے والے ہیں کا سامنا کرتے گھر کے آرام و سکون تباہ ہو رہا ہے۔ کوشش کی ہے کہ ان سطور میں پاکیزہ روایات سے محرومی کا غم قارئین کو ذائقہ بھی جانے۔

(توقیر ہاشمی)

ہوتی۔ ہاں ایک وقت ضرور آیا جب دونوں کو الگ الگ اداروں میں ملازمت ملی۔ شعیب کو کوئی مشکل نہ تھی اور اسے بڑے عہدے کی خواہش بھی زیادہ عرصہ قید نہیں رہتے ہوئے اسی شہر میں تبادلہ کرا لیا اور یوں دونوں نے پھر یکجا رہائش حاصل کر لی۔

یہاں آ کر پیچھے سے تھوڑی دیر بعد دونوں کی شادیاں بھی انجام پا گئیں۔ دونوں کی بیویاں جو آپس میں بھی کزن تھیں، پیچھے گھر میں رہنے والی دیورانی جیٹھانیاں۔ ان کی اس محبت کو دیکھ کر گھر والے حسد بھی کرتے اور موقع آنے پر اس کا اظہار بھی کر دیتے۔ خاص طور پر جب کوئی تقریب ہوتی، خاندان اکٹھے ہوتے۔ کوئی نہ کوئی جھگڑا ہو ہی جاتا مگر انھیں اس کی پروا نہ تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ دونوں صاحب اولاد بھی ہو گئے۔ زبیر کا ایک بیٹا احمر اور بیٹی ماہم تھے۔ جبکہ شعیب کے دو

www.pdfbooksfree.pk

بیٹے، سلمان اور نعمان تولد ہوئے۔ اب مدوش کے آنے سے خاندان مکمل ہو گیا۔

ابھی بچے چھوٹے ہی تھے کہ انھیں ایک نوتعمیر ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہائش حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ایک ہی گلی میں آمنے سامنے کے دو گھر مناسب ادائیگی کی شرائط پر مل گئے۔ یوں ذاتی رہائش کا حصول بھی آسان ہو گیا۔

بچے جس ماحول میں پلے بڑھے تھے، ایک دوسرے کے والد کو اپنا چچا ہی سمجھتے۔ یہ زبیر انکل تھے تو وہ شعیب انکل۔ دونوں گھرانوں میں بے تکلفی تھی۔ دن بھر آنا جانا لگا رہتا۔ بچے ایک دوسرے کے گھر [illegible] لڑکیوں کو ٹیوشن سنٹر، سہیلیوں کے ہاں ملانے، ماؤں کو اپنے کلینک اور مارکیٹ کے کاموں سے لانے لے جانا وغیرہ انجام دیتے رہتے۔ یوں وقت گزرتا چلا گیا۔

جہاں دونوں میں ذاتی ہم آہنگی ہو، وہاں نوجوانوں میں قربت کی بے تکلفی محبت میں بدل سکتی ہے۔ یہ بات بڑوں سے چھپی نہ رہ سکی۔ لہٰذا زبیر کے بیٹے [illegible] کے لیے مدوش کا رشتہ طے پا گیا۔ [illegible] کو سعودی عرب میں اچھی ملازمت مل چکی تھی۔ مدوش کی تعلیم کے اختتام پر شادی ہونا قرار پائی۔ دونوں گھرانے پرسکون اور زندگی سے بھرپور [illegible] تھے۔

شعیب [illegible] ایک فون [illegible] تھے۔ انھیں خیال آیا کہ [illegible] [illegible] داخل ہوئے۔

آج وہ گھر پر جانے کے موڈ میں تھے۔ شعیب نے موقع غنیمت جانا اور فون لانے کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ زبیر نے گاڑی لی اور گھر کی طرف چل پڑے۔

وہ ایک گرم دن تھا۔ گھر کی گاڑی مصروف ہونے کے باعث مدوش کو رکشے سے واپس آنا پڑا۔ آج اس کا سمسٹر تھا، فارغ ہوتے ہی گھر آ گئی۔ گھریلو ملازم [illegible] دین مرکزی دروازے پر کسی کام سے کھڑا تھا۔ مدوش نے شکر ادا کیا کہ اطلاعی گھنٹی بجا کر دروازہ کھلنے کے انتظار سے بچ گئی۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا۔ مزے کی بات یہ اے سی بھی چل رہا تھا۔ اس نے عجلت سے بیگ ایک طرف ڈالا اور صوفے پر آڑی ترچھی پڑ گئی۔ کمرے کی خوشگوار ٹھنڈک نے نیند طاری کر دی اور وہ بالکل ہی بے خبر سو گئی۔

[illegible]

زبیر فون لے کر [illegible] جب مرکزی شاہراہ پر پہنچے تو ٹریفک بری طرح جام ہو چکا تھا۔ وہ اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے [illegible] انھوں نے [illegible] آن کر دیا اور ان کی انگلیاں موسیقی کا ساتھ دینے لگیں۔ [illegible] اشتہارات سے سجا ہوا تھا۔ بڑے بڑے [illegible] خوبصورت ماڈل لڑکیاں [illegible] [illegible] ان میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے اپنا وقت [illegible] [illegible] [illegible] دروازے پر تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

انھوں نے سوچا، پہلے شعیب کے گھر سے فائل اٹھا لیں۔ طفیل دین نے دروازہ کھولا اور انھیں ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا کہہ کر بیگم صاحبہ کو بتانے چلا گیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ مرکزی میز پر فائل بھی نظر آ گئی۔ فائل اٹھاتے ہوئے سامنے نظر پڑی ۔۔۔ حسن خوابیدہ حالت میں سامنے تھا۔ ان کی نظریں سراپا حسن پر جیسے جم سی گئیں۔ وہ دل پھینک اور گھٹیا قسم کے انسان نہ تھے۔ مگر فرشتہ بھی نہیں اور ابھی تو وہ [illegible] حسن کی [illegible] میں دیکھتے آ رہے تھے۔ شیطان نے چند ہی لمحوں میں بڑا کاری وار کر دیا۔ جیسے ہی انھیں اپنی نظروں کے گھٹیا پن کا احساس ہوا، وہ آسمان سے زمین پر آ رہے۔ اپنی نظروں میں آپ ہی گر گئے۔ شرمندگی کے مارے پسینہ چھوٹ نکلا۔ تیزی سے فائل اٹھائی اور اپنے گھر چلے گئے۔

شیطان نے چند ہی لمحوں میں بڑا کاری وار کر دیا۔ جیسے ہی انھیں اپنی نظروں کے گھٹیا پن کا احساس ہوا، وہ آسمان سے زمین پر آ رہے۔

[illegible] ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں [illegible]

تو وہاں کوئی نہ تھا۔ [illegible] صوفے پر آڑی ترچھی سو رہی تھی۔ [illegible] فائل لینے آئے تھے [illegible] [illegible] فائل [illegible] پوچھا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] گئی ہیں۔

[illegible]

[illegible]

پوچھنے لگیں "کیا گاڑی کا اے سی ٹھیک طرح کام نہیں کر رہا؟ آپ تو پسینے میں بھیگ رہے ہیں۔"

وہ بات نظر انداز کرتے ہوئے غسل خانے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ تو بڑے سکون سے گھر کھانا کھانے آئے تھے، مگر اب کھانے سے رغبت اور بھوک ختم ہو چکی تھی۔ ان کی بے دلی رضوانہ سے چھپی نہ رہ سکی۔ "کیا ہوا؟ کس خیال میں گم ہیں؟"

ان کے پوچھنے پر وہ دکھ سے مسکرا دیے۔ اپنے احساسات بتا کر اپنی ذلت کا سامان خود تو نہیں کر سکتے تھے۔ تھوڑا سا کھانا کھایا۔ واپس جانے میں کچھ وقت تھا۔ رضوانہ چائے بنانے گئیں تو وہ کچھ دیر آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹ گئے۔ مگر کسی ڈرامے کے ری پلے کی طرح وہ منظر بار بار آنکھوں کے آگے [illegible]

[illegible] آنکھوں کے سامنے [illegible] شعیب [illegible] [illegible] [illegible] چائے پی اور [illegible]

[illegible]

www.pdfbooksfree.pk

بچا ہوا بھی گھر میں آتے تو ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ ان کی اکلوتی بیٹی اپنی بہو، نواسی کی طرح تھیں لیکن اب نہیں۔ تب تک سہی تھا جب لوگ ان کی نظروں سے بچے ہوئے تھے۔ اب تو انھیں کوئی چپ کرا نہیں [illegible] میں داخل ہو جائے۔ بیٹا اور بھائیوں کے واسطے اور دور کے رشتے داروں سے بھی الگ ہیں۔ وہ تو بہت تو الگ ہی ہیں۔ انھیں گھر کے درو دیوار میں سے مدد کی آواز آتی ہے۔ [illegible] انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے، جب تک کہ پھر انھیں نیند آ گئی۔

انھیں احساس ہوا کہ [illegible] معذور ہو تو بیٹے اور بیٹیاں آ جاتے ہیں۔ گھر والے ان کی خیریت میں لگ رہتے تھے کہ ان کی [illegible] مدد کی ضرورت ہے۔ [illegible] ان کی حالت میں [illegible] احساس کیا [illegible] ان پر یہ بات واضح ہو گئی۔

نیند کی کمی [illegible] معمول [illegible] کی [illegible] حالت [illegible] ادھر گھر میں [illegible] ان کی جگہ رضوانہ اور شعیب صورت حال محسوس کر رہے تھے۔ باہمی مشورے سے انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

ڈاکٹر نے حالات دیکھ کر بتایا کہ انھیں کوئی ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ لیکن کوئی بات اس کی تصدیق کرتی نظر نہ آئی۔ خاندان اور معاشرے میں انھیں بلند مقام حاصل تھا۔ مالی آسودگی تھی، بچوں کی طرف سے بھی کوئی فکر کا پہلو نہ تھا۔ بس دل آرام کا مشورہ مل رہا تھا۔

ہو گئے تھے کہ بیٹی مصروف ہو جاتے تو آپ کی طرف دیکھنے والے کہاں سے بچے چپ تھے۔ وہی تنہائی ان کی صحت تباہ کر رہی تھی۔

ان کی گرتی صحت کے پیش نظر بچے [illegible] اور گھر کی [illegible] تیمارداری [illegible] سے خوبصورت [illegible] ہو جاتے۔ انھیں سب کا [illegible] ان سے [illegible] ہوتے ہوئے [illegible]

ان کا [illegible] چاہتا تھا [illegible] بچے [illegible] ذہنی [illegible] اور [illegible] رہا تھا۔

جس دن امجد [illegible] آیا [illegible] پکڑ کر رو رہے [illegible] آپ [illegible] ان کی یاد [illegible] آپ [illegible]

بیٹی بچے اور شعیب سب قریب ہی موجود تھے۔ [illegible] آنکھ [illegible] دل میں [illegible] اب [illegible] رہی ہے [illegible] گھر کی ساری [illegible] محسوس ہو رہی ہیں۔

امجد نے ہاتھوں کی انگلیوں کی [illegible] دیکھ کر باپ کو [illegible] پلٹا دیا۔ ان کی روح عجیب انداز میں گلے لپٹ گئی۔ سب ہی ان پر بے ساختہ جھک گئے۔ فون اور ایمبولینس کی تلاش کرنے کی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی مگر انھیں اب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

وہ باتوں باتوں میں بن گیا

دنیا کا سب سے بڑا احمق

ایک چالاک آدمی کا ڈرامائی قصہ، اس نے مارنے آنے والے کو شہ مات دے دی

جیک رچی

وہ دیکھنے میں ایک شریف آدمی لگتا تھا۔ اس نے ہلکے فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ جب میں نے چہرہ دیکھا، تو میری نظر خود بخود اس کے ہاتھ کی طرف گئی۔ مجھے یقین تھا، اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس ہوگا۔ یہ مرد شریف اسے کھول کر کوئی چیز فروخت کرنے کی کوشش کرے گا، لیکن میری توقع کے خلاف اس کے ہاتھ میں بریف کیس کے بجائے بتیس دہانے کا ایک ریوالور چمک رہا تھا۔ پکڑنے کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ یہ "شریف آدمی" ایسے ہتھیار استعمال کرنے کا وسیع تجربہ رکھتا ہے۔

اس نے بڑی شائستگی و اہتمام سے یہاں آنے کا مقصد بیان کیا۔ لیکن میں پرسکون رہا۔ خود مجھے بھی اپنے آپ پر تعجب ہوا۔ "تو کیا تم مجھے قتل کرنے آئے ہو؟ ٹھیک ہے مگر یہ تو بتا دو کہ مجھے ہلاک کرنے پر تمھیں کس نے مامور کیا؟ مرنے سے پہلے مجھے کم از کم یہ جاننے کا حق تو ہے؟" میں نے کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کو صرف ذاتی دشمنی کی بنا پر ہلاک کرنا چاہوں؟" اس نے بھی بڑے سکون سے کہا۔ "مجھے کسی بھی شخص کو اپنا دشمن تصور کرنے کا پیدائشی حق حاصل

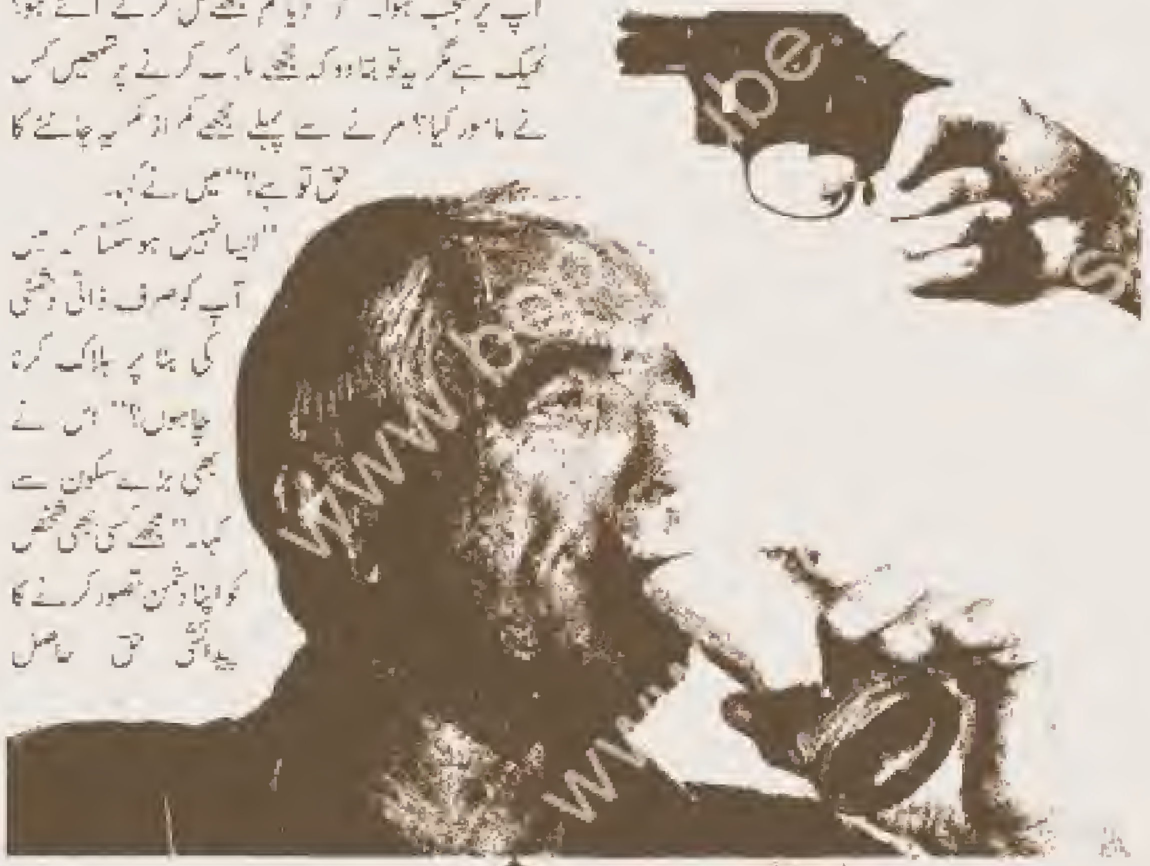

ہے۔"

جب وہ آیا، میں لائبریری میں بیٹھا اپنے لیے ایک گلاس میں مشروب انڈیل رہا تھا۔ آہٹ ہوئی تو پلٹ کر اسے دیکھا۔ میں نے تحمل سے کہا "میں اپنے دوستوں اور دشمنوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تم میرے لیے قطعاً اجنبی ہو۔ کیا تمھاری خدمات میری بیوی نے حاصل کی تھیں؟"

وہ مسکرایا۔ "درست ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیوی کے پاس آپ کو مروانے کے لیے معقول وجہ موجود ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں دولت مند آدمی ہوں۔ معلوم ہوتا ہے، وہ میری ساری دولت پر قابض ہونا چاہتی ہے۔"

وہ چند لمحوں تک مسکراتے ہوئے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا "آپ کی عمر کیا ہوگی؟"

"تریپن سال۔"

"اور بیوی کی عمر؟"

"بائیس سال۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر، وہ آپ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہیں، تو آپ کو کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے کہا۔ "اگر آپ اس سے وفا شعاری کی امید رکھتے ہیں، تو معاف کیجیے گا، آپ دنیا کے سب سے بڑے احمق ہیں۔"

میں نے مشروب کی چسکی لی اور کہا "مجھے اس سے وفا شعاری کی توقع تو نہیں تھی البتہ شادی کرتے وقت یہ توقع ضرور تھی کہ وہ سال دو سال بعد طلاق کا مطالبہ کرے گی۔ اور مجھے طلاق کے ساتھ اپنی کچھ جائیداد بھی اسے دینی پڑے گی۔ اس کا حسن دیکھتے ہوئے مجھے یہ سودا مہنگا نظر نہیں آیا۔ لیکن اب نوبت جان کی بازی تک پہنچ

صاحبِ تحریر

امریکا کے ممتاز ادیب، جیک ریچی امریکی شہر ملواکی میں ۲۶ فروری ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ اصل نام جان جارج ریچی تھا۔ جاسوسی کہانیاں لکھ کر نام کمایا۔ ان کی تعداد ۵۰۰ سے زیادہ ہے۔ ایک ناول بھی لکھا "دا ٹیگر آئی لینڈ" نامی یہ ناول ۱۹۸۷ء کو شائع ہوا۔ ریچی کی کئی کہانیاں اردو میں بھی ترجمہ ہو چکیں۔ جو ڈرامائی موڑوں کی وجہ سے مشہور ہوئیں۔ ریچی ۲۳ اپریل ۱۹۸۳ء کو چل بسے۔

گئی اور یہ قیمت ادا کرنا بڑا مہنگا سودا ہے۔"

"آپ کی بیوی خوب صورت ہونے کے علاوہ ذہین بھی ہیں مسٹر ولیم! مجھے حیرت ہے، آپ جیسا تجربہ کار آدمی اس کی یہ خوبی نہیں بھانپ سکا۔"

میں نے اس کا ریوالور دیکھا اور بولا "مجھے امید ہے تم پہلے بھی معقول معاوضے پر دوسروں کے لیے یہ خدمت انجام دے چکے؟"

"جی ہاں۔" اس نے انکسار سے جواب دیا۔

"اور تمھیں اپنے اس عمل سے لطف بھی ملتا ہوگا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی ہاں آپ اسے بھیانک مسرت کا نام دے سکتے ہیں مسٹر ولیم! مجھے اعتراف ہے، دوسروں کو قتل کرتے وقت مجھے واقعی بڑی مسرت ملتی ہے۔"

میں چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا، پھر کہا "دیکھو

www.pdfbooksfree.pk

تمھیں یہاں آئے دو منٹ سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے لیکن میں اب تک زندہ ہوں!"

"میں اپنا کام اطمینان سے انجام دینے کا عادی ہوں اور مجھے کوئی جلدی بھی نہیں۔ آج کی رات یہی ایک کام کرنا ہے۔"

"تو گویا تمھیں اپنے شکار کو تڑپتا ہوا دیکھ کر مسرت نہیں ہوتی بلکہ تم اسے وحشت زدہ کر کے لطف اندوز ہوتے ہو، ٹھیک ہے نا؟"

"آپ بہت گہرے آدمی ہیں مسٹر ولیم!" اس نے مجھے تعریفی نگاہ سے دیکھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تم لطف اندوز ہوتے رہو گے، میں زندہ رہوں گا؟"

"ہاں لیکن ایک حد تک۔ میں ساری رات تو یہاں بیٹھ نہیں سکتا اور پھر مجھے ایک بات کا خیال رکھنا ہے۔"

"ظاہر ہے، ظاہر ہے۔ مشروب کے ایک گلاس کے بارے میں کیا خیال ہے مسٹر؟"

"آپ مجھے احمق سمجھتے ہیں۔ سادہ سا ہے۔ جھوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں آپ کی دعوت شکریے کے ساتھ قبول کرتا ہوں لیکن مہربانی فرما کر مشروب بوتل سے گلاس میں میرے سامنے انڈیلیں۔ میں شربت کے ساتھ بے ہوشی کی دوا یا زہر پینے کی عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن تم یہ تو سوچو، مجھے تمھاری آمد کی اطلاع نہیں تھی۔ میں ایسی صورت میں اپنی جیب میں زہر کی پڑیا تیار رکھنے سے تو رہا۔"

"درست ہے، اچھا لگتا ہے لیکن میں خواہ مخواہ خطرہ مول لینے کا قائل نہیں۔"

میں نے میز پر رکھی بوتل سے مشروب ایک اور گلاس میں انڈیلا۔ وہ میرے ہاتھوں پر مسلسل نظریں جمائے رہا۔ میں نے اس کا گلاس میز کے کونے پر رکھ دیا۔ وہ ایک کرسی گھسیٹ میرے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے ریوالور کی نال اب بھی میری طرف تھی۔ وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ میں نے پوچھا "اس وقت میری بیوی کہاں ہے؟ ظاہر ہے اس نے جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنے کا کوئی بہت عمدہ انتظام کیا ہو گا؟"

"وہ ایک تقریب میں شریک ہیں۔ اس لیے ایک درجن سے زیادہ گواہ تمھیں لکھ کے یہ بیان دیں گے کہ وہ آپ کے قتل کے وقت ان کے سامنے موجود تھیں۔"

"ظاہر ہے، ظاہر ہے اور میرا قاتل ایک چور ہو گا جس نے میری غیر متوقع مداخلت سے گھبرا کے مجھے گولی مار دی؟ کوئی کمی رہ گئی ہو؟"

اس نے ایک بڑا گھونٹ لے کر گلاس میز پر رکھ دیا اور بولا "ہاں، کہانی تو واقعی سنی پٹی ہے لیکن اثر اب بھی رکھتی ہے۔ مگر پولیس کو اس پر یقین آ جاتا ہے۔ آپ کو گولی مارنے کے بعد میں یہ گلاس پانی سے اچھی طرح دھو کر دوبارہ الماری میں رکھ دوں گا اور جب واپس جاؤں گا تو دروازے کا ہینڈل بھی رومال سے صاف کر دوں گا کیونکہ اندر آتے وقت میں نے اسے پکڑا تھا۔ اس پر میری انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ میں ہر کام نہایت سلیقے اور احتیاط سے کرتا ہوں۔"

"اور غالباً تم یہاں سے چند چیزیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤ گے تاکہ چوری کی کہانی میں جان پڑ جائے؟"

"جی نہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں مسٹر ولیم! پولیس یہ سمجھے گی کہ چور مسٹر ولیم کو گولی مارتے ہی وحشت زدہ ہوا اور گھبراہٹ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے خالی ہاتھ فرار ہو گیا۔"

www.pdfbooksfree.pk

"وہ تصویر جو دیوار پر آویزاں ہے۔" میں نے نظروں سے اس کی پشت پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تیس ہزار ڈالر مالیت رکھتی ہے۔"

اس نے ایک ثانیے کے لیے مڑ کر تصویر دیکھی۔ پھر بولا "میں اپنے پاس ایسی کوئی چیز رکھنا نہیں چاہتا مسٹر ولیم جو میرا آپ سے تعلق ثابت کرے۔ میں فن کا قدردان ہوں لیکن اتنا بھی نہیں کہ اس کی خاطر پھانسی کا خطرہ مول لے لوں۔" وہ تحیر سے مسکرایا۔ "آپ شاید یہ قیمتی تصویر اپنی زندگی کے عوض مجھے دینا چاہتے ہیں؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی خیال تھا۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "مجھے افسوس ہے مسٹر ولیم! جب میں کسی کے لیے ہاتھ سے کوئی کام قبول کر لوں تو مخالف مجھے کسی قیمت پر نہیں خرید سکتا۔ یہ میرا کاروباری اصول ہے۔"

میں نے اپنا گلاس میز پر رکھ دیا اور بولا "تمہیں غالباً یہ انتظار ہے کہ میں دہشت زدہ ہو کے تم سے گڑگڑا کر زندگی کی بھیک مانگوں؟"

"ہاں اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کا یہ سکون محض کچھ دیر کی بات ہے۔"

"پھر تم مجھے قتل کر دو گے؟"

"ظاہر ہے مسٹر ولیم! ویسے کوئی شخص موت کے دہانے پر ہوتے ہوئے خاموش رہنا بھی بڑا مشکل کام ہے۔"

"شاید تم اپنے ہر شکار سے گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگنے کی توقع رکھتے ہو؟"

"ہاں اور مجھے اس میں کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔ البتہ ہر شخص کا انداز مختلف اور منفرد ہوتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم نے کبھی رحم کھا کر کسی کو زندہ چھوڑا؟"

"اب تک تو ایسا نہیں ہوا۔" وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرایا۔

"مرنے والوں نے تمہیں دوگنی رقم کی پیشکش بھی کی ہو گی؟" میں نے پوچھا۔ "ہاں، اکثر و بیشتر۔"

"پھر بھی انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا؟"

"جی ہاں، آپ کا خیال درست ہے۔"

"ابھی میں نے تمہیں جو تصویر دکھائی، اس کے پیچھے ایک تجوری پوشیدہ ہے۔"

اس نے ایک بار پھر سے پیچھے مڑ کر دوبارہ تصویر دیکھی اور کہا "اچھا پھر؟"

"کیا آپ کو یقین ہے مسٹر ولیم کہ آپ پانچ لاکھ ڈالر کے عوض اپنی زندگی خریدنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟"

"اس تجوری میں اس وقت پانچ لاکھ ڈالر موجود ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو کافی بڑی رقم ہے مسٹر ولیم!" اس کی آنکھوں میں لالچ ابھرا۔

میں نے میز سے اپنا گلاس اٹھایا۔ اس میں کچھ شراب باقی تھی۔ پھر میں تصویر کے قریب گیا۔ تجوری کھولی۔ اندر سے ایک لمبا لفافہ نکالا اور بچی شراب کا ایک گھونٹ لے کے خالی گلاس تجوری میں رکھ دیا۔ پھرتی سے اس کا دروازہ بند کر دیا۔ تجوری کا دروازہ بند ہونے پر خودبخود مقفل ہو جاتی تھی۔

اس کی نظریں لفافے پر جمی ہوئی تھیں۔ "یہ لفافہ کیسا ہے مسٹر ولیم!" وہ بولا۔

میں نے لفافہ میز پر اس کی طرف اچھال دیا۔ وہ چند لمحوں تک اسے گھورتا رہا "کیا آپ کو یقین ہے مسٹر ولیم کہ آپ پانچ لاکھ ڈالر کے عوض اپنی زندگی خریدنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟" اس نے پوچھا۔

www.pdfbooksfree.pk

میں نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا "نہیں، مجھے یقین ہے کہ تمھیں کسی قیمت پر بددیانتی کے لیے آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔"

اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا "اس کے باوجود آپ نے تجوری سے رقم کا لفافہ نکالا؟ کیوں آخر؟"

میں نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ اٹھایا اور اسے میز پر الٹ دیا۔ کچھ بوسیدہ کاغذات نکل کر میز پر بکھر گئے۔ "دیکھو، اس میں ایک بھی کرنسی نوٹ نہیں۔ یہ سب پرانے خط ہیں اور تمھارے لیے بیکار ہیں۔"

وہ کچھ جھنجھلا سا گیا۔ "پھر اس حرکت کا مقصد؟"

"مجھے اس بہانے تجوری کھول کر اس میں تمھارا گلاس رکھنا تھا۔ اس پر تمھاری انگلیوں کے نشانات ثبت ہیں۔"

اس نے جلدی سے اپنے سامنے رکھے گلاس کی طرف دیکھا اور بولا "وہ آپ کا گلاس تھا، میرا تو یہ رکھا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "وہ تمھارا گلاس تھا۔ مسٹر ڈیلے مجھے یقین ہے، جب پولیس نے تجوری میں ایک خالی گلاس دیکھا تو ضرور سوچے گی کہ آخر یہ تجوری میں کیوں آیا؟ اور چونکہ یہاں قتل کی واردات ہوئی، اس لیے وہ گلاس پر ضرور توجہ دے گی۔ اسے گلاس پر تمھاری انگلیوں کے نشانات آسانی سے مل جائیں گے۔"

اس کی پتلیاں سکڑ گئیں۔ تلملا کر کہنے لگا "آپ بکتے ہیں۔ میں نے آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ آپ گلاس تبدیل کر ہی نہیں سکتے۔"

"کیا واقعی؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم نے مجرا زم دوبار سر موڑ کر اس تصویر کی طرف دیکھا جس کی قیمت میں نے تیس ہزار ڈالر بتائی تھی۔"

اس نے بے اختیار سر موڑ کر پھر تصویر دیکھی پھر کہا۔ "لیکن وہ ایک دو سیکنڈ سے زیادہ کا وقفہ نہیں تھا۔"

"میں وقت کا صحیح تعین تو نہیں کر سکتا لیکن میرے لیے وہ وقفہ کافی تھا۔ میں نے تمھارا گلاس اپنے سامنے رکھا اور تمھارے سامنے اپنا گلاس رکھ دیا۔"

اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئیں، وہ ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "میں کہتا ہوں، یہ ناممکن ہے۔"

"ہو گا۔ مگر مجھے یقین ہے، جب پولیس نے تمھیں گرفتار کیا تو تمھیں بڑا تعجب ہو گا۔ پھر کچھ عرصے بعد تمھیں موت کی کرسی پر بیٹھ کے موت کو خوش آمدید کہنے کا موقع ملے گا۔ مجھے اصل خوشی اس بات کی ہے کہ تمھیں اپنی موت کا ہفتوں یا شاید مہینوں انتظار کرنا پڑے گا۔ ہر نیا دن تمھیں تمھاری موت سے قریب تر کرتا چلا جائے گا۔ تم نے اب تک کتنے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا؟ اپنے اس کھیل سے تم ہر بار تھوڑی دیر لطف اندوز ہو سکے؟ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے! لیکن تمھیں اپنی موت کا کئی ہفتے، ہر لمحہ انتظار کرنا پڑے گا! مجھے اپنے مرنے کا کوئی غم نہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ میں اس وقت تمھیں نہیں دیکھ سکوں گا۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ریوالور کی لبلبی پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھ گیا۔ وہ خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا۔ "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمھارے آخری لمحات کیسے ہوں گے؟" میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے احمق، تمھیں بھی دوسروں کی طرح یہ غلط فہمی ہو گی کہ جب مرنے کا وقت آیا تو بے حد پرسکون انداز میں اس کا

www.pdfbooksfree.pk

استقبال کرو گے۔ مگر میرا خیال ہے کہ جب پولیس کے محافظ تمھیں گھسیٹتے ہوئے..."

"تجوری کھولو ورنہ میں تمھیں گولی مار دوں گا۔" اس کی آواز شدید غصے سے کانپ رہی تھی۔

میں بہت زور سے ہنسا اور بولا "واہ مسٹر، خوب لطیفہ سنایا۔ جب تک تجوری بند ہے تم میرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ہم دونوں کو معلوم ہے، اگر میں نے تجوری کھول دی، تو تم یقیناً مجھے گولی مار دو گے۔"

ماحول میں گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ تقریباً آدھے منٹ بعد اس نے کہا "آپ اس گلاس کا کیا کریں گے؟"

"اگر تم مجھے گزند پہنچائے بغیر یہاں سے چلے گئے جس کا اب مجھے پورا یقین ہے، تو میں یہ گلاس ایک سراغ رساں ادارے کے پاس لے جاؤں گا تاکہ گلاس سے تمھاری انگلیوں کے نشانات اتار کر محفوظ کر لیے جائیں۔ پھر میں تمھاری انگلیوں کے نشانات آج کی تاریخ کے ساتھ ایک لفافے میں بند کر ان کے حوالے کر دوں گا۔ انھیں ہدایت کروں گا کہ اگر میری موت غیر فطری طور پر واقع ہو، تو وہ لوگ میرا لفافہ اسی طرح پولیس کے حوالے کر دیں۔"

وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا "اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" آخر وہ گہری سانس لے کر بولا "میں آج سے جانے کے بعد دوبارہ بھی تمھیں شکل نہیں دکھاؤں گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا "تمھاری اس یقین دہانی کے باوجود میں اپنے منصوبے ہی کو ترجیح دوں گا کیونکہ اس طرح مجھے مستقبل کا تحفظ بھی مل جائے گا۔"

وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر سر اٹھا کر بولا "آپ

کام کی باتیں

☆ ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔

☆ لوگوں سے ڈرنے کی بہ نسبت اللہ تعالیٰ کا زیادہ حق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

☆ اے مسلمانو! تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ایک عمدہ نمونہ ہے۔

☆ لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا۔

☆ جنھوں نے ہماری راہ میں کوشش کی، ہم ان کو اپنا راستہ بتا دیں گے۔

☆ لوگو! تم ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور نہ اسے بطور رشوت حاکموں کے پاس پہنچاؤ۔

☆ ہر شخص جو بھی کوئی عمل کرتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔

☆ اے نبی ﷺ کہہ دو کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تم کو دوست بنا لے گا۔

☆ کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کرو۔

☆ نہ تم ظلم کرو اور نہ ہی تم پر کوئی ظلم کیا جائے گا۔

(محمد شہزاد، ملتان)

پولیس سے ابھی رابطہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

"اس کی بھی چند وجوہ ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے اپنے ریوالور کی طرف دیکھا پھر اسے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا، بولا "آپ کی بیوی قتل کے لیے کسی دوسرے کی خدمات بھی تو حاصل کر سکتی ہے؟"

"ہاں تمھاری آج کی کارکردگی سے مایوس ہو کر وہ ضرور کوئی نیا آدمی تلاش کرے گی۔"

www.pdfbooksfree.pk

"پھر سراغ رساں ادارہ آپ کا خفیہ طور پر پولیس کے حوالے کر دے گا۔ پولیس آپ کے قتل کے الزام میں مجھے گرفتار کر لے گی اور عدالت بھی مجھے موت کی سزا دے گی۔"

"کمال ہے، بہترین منصوبہ۔" میں نے اپنا تبصرہ پیش کیا۔

آصف خاموشی سے میرے قتل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کہا "تم سب کچھ سچ کہتے ہو۔ آصف! شرطیہ میری بیوی ہی نے آپ کی خدمات حاصل کرنے کے لیے کہا ہے۔" میں مسکرایا "کیا میری بیوی نے تمھیں یہ بتایا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "جی ہاں۔ صرف یہ بتایا کہ وہ کسی سراغ رساں کے گھر میں ہے۔ وہاں سے وہ دس بجے رات کو واپسی کے لیے نکلیں گی۔ انھوں نے کہا تھا کہ مجھے یہ کام دس بجے سے پہلے پہلے ختم کرنا ہو گا۔"

"پیارے بچے! تم تو بہت تاریکی پھیلا رہے ہو۔ اب بھی آج کی رات بہت تاریک ہے۔ کیا تمھیں اس سراغ رساں کا مکان معلوم ہے؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا "نہیں۔"

میں نے اسے اس سراغ رساں کا پورا پتہ تفصیل سے بتایا تاکہ وہ آسانی سے وہاں تلاش کر سکے۔ پھر کہا "ابھی پونے نو بجے ہیں۔ کافی وقت ہے۔ تم اطمینان سے وہاں پہنچ سکتے ہو۔"

ہم دونوں آدھے منٹ تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہے۔ میں نے کہا "ابھی صرف دس منٹ ہیں۔ اپنے مستقبل کی حفاظت کے لیے تمھیں یہ کام کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ وقت کے بارے میں غور کرنے لگا۔ پھر بولا "پیارے بچے! آپ کہاں ہوں گے اس وقت؟"

"میں اپنے کلب میں پانچ دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہا ہوں گا۔ وقت آنے پر وہ دوست پولیس کو حلفیہ بیان دیں گے کہ میں پورے وقت ان کے ساتھ تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے تم یہ کام پوری دیانت داری سے کرو گے؟"

"اس کا انحصار مناسب حالات اور موقع محل پر ہے۔" اس نے کہا۔

"تم نے سراغ رساں کا مکان نہیں دیکھا۔ میں بتا دوں، وہاں تمھیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

وہ کچھ سوچتا رہا، پھر دھیرے سے مسکرایا۔ "آپ کو اپنی بیوی سے محبت تو ہو گی؟"

میں نے میز پر رکھا ہوا ایک قیمتی گلدان اٹھا کے کہا "جب میں نے اسے خریدا تو مجھے یہ بہت پسند تھا۔ میں اسے ہر زاویے سے دیکھتا رہتا۔ لیکن اب مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ سوچ رہا ہوں کہ اسے کوڑا دان میں ڈال دوں اور اس کی جگہ نیا گلدان خرید لاؤں۔"

* * *

آصف کے رخصت ہوتے ہی میں نے میز پر رکھا گلدان اٹھایا اور سیدھا ایک سراغ رساں ادارے کے دفتر پہنچا۔ گلدان حوالے کرتے ہوئے میں نے انھیں آصف کی انگلیوں کے نشانات حاصل کرنے کی ہدایت کی اور اپنے کلب چلا گیا۔ وہاں پانچوں دوست پہلے ہی میرا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے آصف کے سامنے تجوری میں جو گلدان رکھا، وہ میں نے توڑ دیا کیونکہ اس پر میری انگلیوں کے نشانات ثبت تھے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

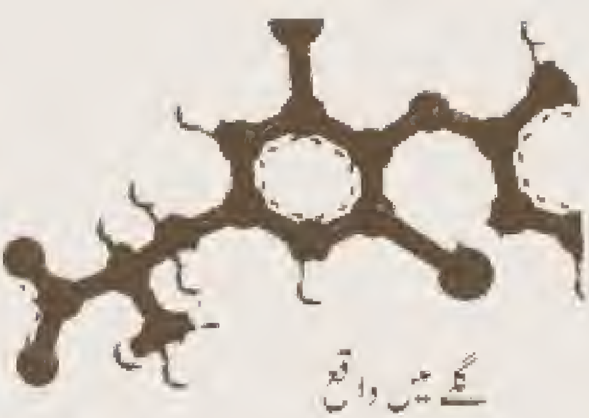

گلے میں واقع

انسانی جسم کا ایک اہم غدہ

اس غدے کی خرابی میں تھکن، کمزوری اور سستی کا شکار بنا دیتی ہے

عالیہ فاطمہ

۴۰ سالہ عالیہ چند ماہ سے تھکن کا شکار تھی۔ جب بھی اٹھتی، تو سر اور دوسرے ... اس کی یادداشت بھی کمزور ہو گئی۔ ... ہوئے بھی دشواری محسوس کرنے لگی۔ جب یہ تکلیف دہ کیفیت کا ... ہوئی تو اس نے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر بیماری کی وجہ ... کرائے۔

عالیہ کی ایک ... تھی۔ وہ بھی ... غدہ درقیہ یا تھائرائیڈ (Thyroid) کے ایک عارضے کا شکار ہوئی۔ ... حالات میں ... جن سے عالیہ واقف تھی ... ماہر امراض غدود (Endocrinologist) کے پاس پہنچی۔

ماہر امراض غدود نے عالیہ کو بتایا کہ وہ غدہ درقیہ سے خارج ہونے والے ہارمونوں کو ٹیسٹ کرائے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ہارمونوں کا اخراج معمول کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں۔

جب غدہ درقیہ کے ٹیسٹ ہوئے، تو انکشاف ہوا کہ عالیہ ہائپوتھائرائیڈزم (Hypothyroidism) میں مبتلا ہو چکی۔ غدہ درقیہ کی اس بیماری میں وہ بہت کم ہارمون خارج کرتا ہے۔ اس خلل سے ... انسان کئی مسائل کا شکار ہو جاتا ہے جن میں کمزوری، تھکن، قبض، نیند آنا، جلد خشک ہونا، چہرے کی سوجن، یادداشت کی کمی، وزن بڑھنا، آواز بیٹھنا اور عضلات میں اکڑن شامل ہیں۔

مرض کی تشخیص کے بعد ماہر امراض غدود عالیہ کا علاج کرنے لگا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ مرض ابتدائی حالت میں تھا، اسی لیے وہ جلد تندرست ہو گئی۔

www.pdfbooksfree.pk

خدانخواستہ وہ پی بیماری ناقابلِ علاج رہتی، تو موت کے منہ میں بھی جا سکتی تھی۔

٭٭٭

پاکستان میں کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے جسم میں غدہ درقیہ اہم ترین غدود میں سے ایک ہے۔ تتلی کی شکل والا یہ غدہ ہمارے گلے میں واقع ہے۔ یہ تقریباً پانچ سینٹی میٹر لمبا ہے۔ ہمارے بدن میں اس غدے کی بنیادی ذمے داریاں یہ ہیں:

جسم کو غذائی توانائی جذب کرنے میں مدد دینا ہے۔ ہمارا پروٹین بنانے میں حصہ لیتا ہے۔ نیز اور یہ کنٹرول کرتا ہے کہ ہمارا جسم دیگر ہارمونوں کے ساتھ کس طرح توازن رکھے۔ نیز جسمانی درجہ حرارت معتدل اور دل تندرست رکھنے میں بھی اس کا اہم کردار ہے۔

غدہ درقیہ ہارمون خارج کر کے درج بالا ذمے داریاں انجام دیتا ہے۔ ان میں سے دو ہارمون اہم ہیں: ٹرائیوڈوتھائرونین (Triiodothyronine) اور تھائروکسن (Thyroxine)۔ یہ دونوں ہارمون کئی جسمانی اعضا کی نشوونما اور دیگر نظاموں کے عمل میں حصہ لیتے ہیں۔ ان دونوں کو مختصراً بالترتیب ٹی ۳ (T3) اور ٹی ۴ (T4) کہا جاتا ہے۔

غدہ درقیہ سے ہارمون کم خارج ہوں گے یا زیادہ، اس امر کو تھائرائڈ اسٹیمولیٹنگ نامی ہارمون کنٹرول کرتا ہے۔ یہ ہارمون ہمارے دماغ میں واقع غدہ نخامیہ (Pituitary Gland) سے خارج ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ درج بالا ہارمون کی پیداوار بھی تھائروٹروپین ریلیزنگ نامی ہارمون کنٹرول کرتا ہے۔ یہ ہارمون دماغ ہی میں واقع ایک اور عضو ہائپوتھیلمس (Hypothalamus) چھوڑتا ہے۔

غیر صحت مند طرزِ زندگی اور دیگر مسائل کے باعث غدہ درقیہ چار امراض کا نشانہ بن سکتا ہے۔ ان میں ہائپر تھائروڈزم، تھائروڈیٹس، ہائپوتھائروڈزم اور سرطانی یا غیر سرطانی رسولیاں شامل ہیں۔ ان چاروں امراض کی وجہ سے غدہ درقیہ گلہڑ (Goiter) میں مبتلا ہوتا ہے۔

ہائپوتھائروڈزم کے بارے میں آپ اوپر پڑھ چکے۔ ہائپر تھائروڈزم کا شکار ہونے پر غدہ درقیہ معمول سے زیادہ ہارمون خارج کرتا ہے۔ اس غیر معمولی کیفیت کی بنا پر جسم انسانی میں یہ علامات جنم لیتی ہیں: گھبراہٹ، درد و تردد، عضلات میں کمزوری، وزن میں کمی اور پیاس لگنا۔

تھائروڈیٹس میں غدہ درقیہ سوزش زدہ ہو جاتا ہے۔ جبکہ سرطانی رسولی جنم لینے پر جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ گلہڑ جنم لے، تو غدہ درقیہ پھول جاتا اور تکلیف دیتا ہے۔ ان تمام بیماریوں کا علاج موجود ہے۔

خرابی کی نمایاں علامات

اگر انسان کا وزن کم یا زیادہ ہو جائے، طبیعت میں تبدیلیاں آئیں، خون کا دباؤ کم یا زیادہ رہے، بال گرنے لگیں، جلد خشک ہو جائے اور نظر کمزور ہونے لگے، تو سمجھ جائیے کہ آپ کے غدہ درقیہ میں خرابی پیدا ہو چکی۔ اب ڈاکٹر مرض کی تشخیص کر کے دیکھے گا کہ کس قسم کا علاج کرنا ہے۔

ایک طبی رپورٹ کی رو سے پاکستان میں تقریباً دو کروڑ مرد و زن غدہ درقیہ کی کسی نہ کسی خرابی میں مبتلا ہیں۔ اکثر لوگوں کو بیماری نہیں چل پاتا کہ وہ غدہ درقیہ میں نقص کی وجہ سے بیمار ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ پاکستانی غدہ درقیہ سے متعلق کم ہی معلومات رکھتے ہیں۔

اگر خدشہ ہو کہ آپ کا غدہ درقیہ خراب ہے، تو کسی اچھے ہسپتال میں جائیے۔ وہاں غدود کی تندرستی جاننے کے لیے مختلف طبی ٹیسٹ ہوں گے۔ ممکن ہے کہ ان کی

www.pdfbooksfree.pk

اسکیننگ بھی ہوتا کہ مرض کا پتا چل سکے۔ اگر غدود درقیہ ناقابل علاج ہو، تو اسے نکال دیا جاتا ہے۔

لاہور کے ایک ممتاز معالج، ڈاکٹر زمان شیخ کا کہنا ہے "جب کسی انسان میں غدود درقیہ کام نہ کرے، تو کئی لحاظ سے اس کی صحت پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔ وجہ یہ کہ غدود درقیہ کی خرابی ڈپریشن، امراض قلب، بے چینی، بال گرنا، بانجھ پن وغیرہ کو بڑھاوا دیتی ہے۔ لہٰذا یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ غدود درقیہ ٹھیک کام کر رہا ہے یا نہیں۔"

قدرتی علاج

کئی لوگ ادویہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے بعض قدرتی علاج سے غدود درقیہ کو صحت مند رکھنا ممکن ہے۔ اگر غدود خراب ہو، تو سفید آٹا، پھلیاں، چینی، گوبھی، ناشپاتی اور آڑو معتدل مقدار میں استعمال کیجیے۔ یہ اشیا زیادہ کھانے کی صورت میں غدود درقیہ کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، روزانہ ایسی غذا کھایئے جس میں ۸۰ فیصد پھلوں و سبزیوں پر مشتمل ہو۔

غدود درقیہ کی خرابی کا شکار لوگ گلوٹین سے دور رہیں۔ یہ شے غدود کا فعل متاثر کرتی ہے۔ جبکہ زنک، تانبا، سیلنیم اور وٹامن اے رکھنے والی غذائیں کھایئے۔ یہ معدن اور وٹامن غدود درقیہ کو تندرست رکھتے ہیں۔

غدود درقیہ کے ہارمونز کی پیدائش کے لیے آئیوڈین عنصر کا جسم میں ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے آئیوڈین کی کمی سے غدود خراب ہو جاتا ہے۔ یہ کمی آئیوڈین ملا نمک کھانے سے دور کرنا ممکن ہے۔

جسم میں چکنائی کے ضروری تیزاب (Essential fatty acids) بھی ہونے ضروری ہیں۔ یہ غدود درقیہ کے ہارمونز کی پیداوار میں حصہ لیتے اور جسمانی سوزش گھٹاتے ہیں۔ السی کا تیل ان تیزابوں کا خزانہ ہے۔

انسانی جسم میں کیلشیم اور میگنیشیم بھی وافر ہونا چاہیے۔ یاد رہے، یہ دونوں اپنے افعال انجام دینے کی خاطر ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اگر جسم میں میگنیشیم کی کمی ہو، تو کیلشیم صحیح طرح جزو بدن نہیں بن پاتا۔ عام طور پر ۱۰۰۰ ملی گرام کیلشیم کے لیے ۳۳۵ ملی گرام میگنیشیم کی ضرورت ہوتی ہے۔

◆◆◆

کوئی مہرباں سا ہے

ہر ایک نقش ترے پاؤں کے نشاں سا ہے
ہر ایک راہگزر تیرا آستاں سا ہے
کہیں سمٹ کے نہ رہ جائے ہمت پرواز
کہ شاخ شاخ پہ پنہاں اک آشیاں سا ہے
ابھی گلوں کی نظر سے نظر نہیں ملتی
ابھی فضائے چمن میں دھواں دھواں سا ہے
زمانے شوق کی وہ رات کٹ گئی کیسے؟
ہر ایک لمحہ جہاں عمر جاوداں سا ہے
اجڑ گئی ہے مری کائنات دل، پھر بھی
مری نگاہ میں آباد اک جہاں سا ہے
زباں پہ نام بھی آتا ہے تیرا رک رک کر
ہر ایک تار نفس دل کا پاسباں سا ہے
یہ کس نے آج جگائی ہے بزم رفتہ کی یاد
یہ کون دل کے قریں آج نوحہ خواں سا ہے
لگے ہیں دل سے ابھرنے وفا کے افسانے
یہ اپنے حال پہ پھر کوئی مہرباں سا ہے

(صوفی تبسم)

www.pdfbooksfree.pk

ہماری حاضر جواب اور بذلہ سنج

بیٹی گھر کی رونق بن گئی

ایک فخر مند باپ اپنی ہونہار دختر کی کامیابیاں بیان کرتے ہیں

انور احمد علوی

تین بچے ہیں: عمیر، سارہ اور حفصہ۔

ہمارے تینوں کی قدر مشترک یہ ہے کہ وہ مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ ان سے کسی غریب کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔ یہ ابھی بچے ہیں اور سیاست نہیں جانتے۔ اس لیے عملی قدم اٹھاتے اور تصویر بھی نہیں کھنچواتے! پتا اس وقت چلتا ہے جب وہ بار وجیب خرچ دینے کا مطالبہ کریں۔

ایک مرتبہ عمیر نے پندرہ سو روپے مانگے۔ ہم نے چپ چاپ دے دیے۔ ہمیں تو خیر کوئی پریشانی لاحق نہ ہوئی لیکن اس کا کیا کیجیے کہ ماؤں کو ایسے مواقع پر تشویش ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اہلیہ کو شک گزرا کہ بیٹا لڑکیوں کے ساتھ پڑھتا ہے، کہیں کوئی چکر تو نہیں چلا رہا؟ اگر کبھی تنخواہ دینے میں دیر ہو جائے، تو یہی شک انھیں ہم پر بھی ہوتا ہے اور وہ خود میں لگ گئیں۔

جب عمیر کے دوستوں سے رابطہ کیا، تو پتا چلا، مالی بابا کی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے اور عمیر اسکول کے بچوں کے ساتھ مل کر ان کے لیے خطیر رقم کا بندوبست کر رہا ہے۔

تینوں بچوں کی انفرادی خصوصیات بالکل مختلف ہیں۔ عمیر تابع فرمان اور ذمے دار ہے۔ ہر وقت اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ گھر میں کب کس چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ سارہ کھلے دل کی مالک اور شاہ خرچ ہے۔ وہ خوشی کے موقع پر (کوئی توقع رکھے بغیر) دل کھول کر تحائف دیتی ہے۔ یہ نہیں سوچتی کہ ماضی میں اسے کس نے کیا دیا تھا۔ بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور برجستگی میں حفصہ کا جواب نہیں۔ اس سے پہلے کہ حفصہ کا ذکر کریں، عمیر اور سارہ کے بچپن کا

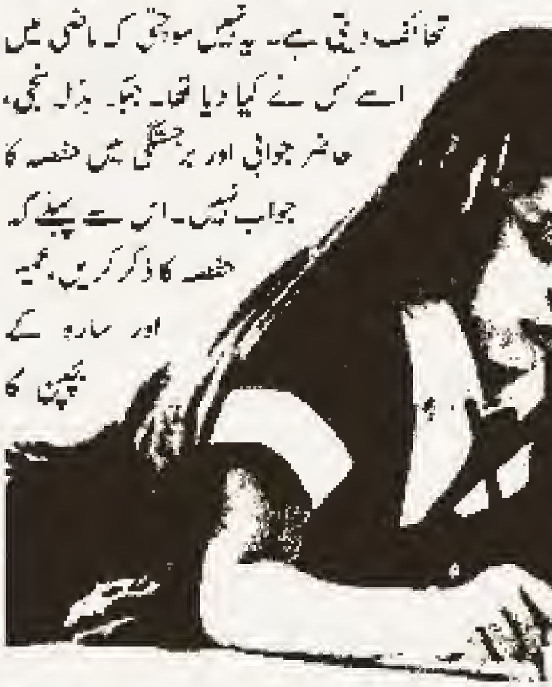

www.pdfbooksfree.pk

ایک ایک دلچسپ واقعہ سنتے چلیں۔

ایک مرتبہ ہم لوگ گھر سے باہر جانے لگے۔ تمیمہ سے کہا "حالات اچھے نہیں لہٰذا کوئی دروازہ کھٹکھٹائے تو باہر دیکھنا۔ صرف دادا کو ہی اندر آنے دینا۔"

اتفاق سے اسی دوران ہمارے بڑے ماموں آ گئے۔ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا، اپنا نام بتایا اور تمیمہ سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ تمیمہ (جو اس وقت چار سال کی تھی) کہنے لگی "نانا ابا، میں گھر میں اکیلی ہوں۔ ابو نے کہا ہے کہ دادا آئیں تو دروازہ کھولنا!"

ایک بار ہم سے اس نے بڑی فرمائش کر ڈالی۔ ہم نے کہا "ہم غریب آدمی ہیں، تمھاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتے۔" وہ سمجھتی تھی۔ ہمیں سخت ملال ہوا۔ اسے بہلانے کی غرض سے شام کو ہم نے تفریح کا پروگرام بنایا۔ اہلیہ نے سادہ سے تیار ہونے کو کہا، تو انتہائی معصومیت سے بولی "آپ لوگ چلے جائیں، مجھے غریبوں کے ساتھ گھومنے نہیں جانا۔"

٭٭٭

میری بیٹی حفصہ ۲۲ اگست ۱۹۹۱ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ وہ گھر میں سب سے چھوٹی ہے اور بے حد حساس۔ اس نے ننھے بچپن کی عمر میں انگریزی زبان میں خط اور نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ بچپن میں جب کسی کی کوئی بات ناگوار گزرتی تو زبان سے کچھ نہ کہتی، غصے میں دروازہ بند کر اپنے کمرے میں بیٹھ جاتی۔ کچھ دیر بعد ایک لفافہ باہر پھینک دیتی۔ ہم لوگ لفافہ کھول کر خط پڑھتے۔ خطوط ہوتے اور اسے شکوہ کر دیتے۔ دلیل میں وزن ہوتا تو اس کی بات مان بھی لیتے۔ ان یادگار خطوط کا مجموعہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد اور دلچسپ انگریزی کتاب "Warning Letters to Parents" (والدین کے لیے تنبیہی خطوط) کے نام سے شائع ہو چکا۔

یہ وہ نظمیں ہیں، جو بچے بڑے ہو کر حد ادب کی وجہ سے نہیں کر سکتے۔ یہ خطوط اس کی حساس طبیعت کا عکس ہیں اور طنز و مزاح کا خوب صورت امتزاج۔ ان میں پایا جانے والا مزاح فطری ہے۔ یہ مزاح زیادہ تر اس کی منفرد شخصیت سے پیدا ہوتا۔ وہ جو کچھ دیکھتی، سوچتی، محسوس کرتی، اسے "پرنس اینڈ پلیٹیشن آرڈیننس" کی پروا کیے بغیر معصومیت سے لکھتی جاتی۔ اسے کسی پابندی سے کام نہیں تھی۔

یہی وجہ ہے اپنے خطوط میں وہ کہیں ہم میاں بیوی کو دھمکیاں دیتی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات یاد کراتی اور کہیں اپنے بڑے بھائی کی تربیت کرتی نظر آتی ہے۔ اس نے یہ خطوط آٹھ سے بارہ برس کی عمر کے درمیان لکھے تھے۔ یہ ایک بچی کے احساسات و جذبات ہیں، اسی لیے ان میں زبان و بیان اور گرامر کی غلطیاں تلاش نہ کی جائیں۔

حفصہ کی ایک اچھی عادت یہ ہے کہ وہ اپنے کام ترتیب سے کرنے کی عادی ہے۔ خود پریشان ہوتی ہے نہ دوسروں کو تنگ کرتی ہے۔ دبئی میں پیدا نہ ہونے کے باوجود نہاری، پائے اور پلاؤ اس کے پسندیدہ کھانے ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہمارے ہاں مشرقی کھانے پکانے کی روایت برقرار ہے ورنہ عمیر اور سارہ بدمزہ مغربی کھانوں اور فاسٹ فوڈز کے دلدادہ ہیں۔ اسکول جاتے وقت اہلیہ کو باقاعدہ دھمکی دے کر جایا کرتی "امی آج فلاں چیز بنایئے گا ورنہ بتایئے گا، میں کیا کرتی ہوں؟"

اب حفصہ کے چند مزید واقعات جنھیں پڑھ کر

www.pdfbooksfree.pk

آپ کو یقیناً لطف آئے گا:

ایک رات حفصہ نے اسکول جاتے ہوئے پچاس روپے مانگے۔ اہلیہ نے ڈانٹ دیا کہ اتنے پیسوں کا کیا کرو گی؟ اسے پندرہ بیس روپے دیے اور اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد حفصہ ایک بڑی سی چادر اوڑھے باورچی خانے میں داخل ہوئی اور کپکپاتی آواز میں بولی "اے باجی... اے باجی! تیرے بچے سدا جئیں... مجھ غریب کو پچاس روپے دے دے!" یوں اپنی ذہانت سے امی کو ہنسا کر پچاس روپے لے لیے۔

ہماری بڑی بیٹی سارہ کو بلی پالنے کا شوق ہے۔ ایک بار وہ کہنے لگی "ابو اس مرتبہ نتیجہ آنے پر آپ مجھے تحفے میں بلی دیجیے گا۔ امی، بھائی اور حفصہ کی مرضی، وہ جو بھی دیں۔"

حفصہ، جو اسکول کا کام کرنے میں مصروف تھی، دور ہی سے چلائی "سارہ کوئی بھی تمہیں تحفے میں بلی نہیں دے سکتا۔"

"کیوں نہیں دے سکتا، میں تو ابو سے بلی ہی لوں گی۔"

"ابو تمہیں تحفے میں بلی نہیں دے سکتے۔"

"کیوں نہیں دے سکتے؟"

"پاگل، وہ بلی کو ڈبے میں پیک کیسے کریں گے؟"

ایک بار ہمارے ایک ادیب دوست آئے۔ ہم نے حفصہ سے کہا کہ ان پر اچھی سی نظم لکھ دو۔ اگلے ہفتے انھیں اپنے ہاں ادبی نشست میں بلائیں گے، تو پڑھ دینا، خوش ہو جائیں گے۔ انھیں گئے ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ حفصہ دوڑی آئی اور کہنے لگی "ابو، ابو! آپ کے دوست پر ایک شعر تو ہو گیا آپ... جلدی سے نوٹ کر لیں، کہیں میں بھول ہی نہ جاؤں۔"

ہم نے اسی وقت کاغذ پنسل اٹھائی تو بولی:

His colour is very fair,
But his head is without hair!

(ان کا رنگ تو اجلا ہے مگر سر بالوں سے صفا ہے)

اسی طرح ایک دن حفصہ نے ہاتھ میں پرچی لا کر دی کہ میں بھائی پر نظم لکھ رہی ہوں، ابھی ایک شعر ہوا ہے، یہ اپنے پاس رکھ لیں، مجھ سے کہیں گم نہ ہو جائے۔ ہم نے شعر پڑھا تو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ لکھا تھا

My brother is thin
Just like a common pin!

(میرا بھائی پتلا ہے، کامن پن سے جیسے)

ہمارے ایک دوست محمد سرور عالم دفتر کے ساتھی ہیں۔ ہمیں جب کچھ رقم درکار ہو، ان سے تذکرہ کر دیتے۔ وہ ہمیں رقم دے ڈالتے، کبھی انکار یا بہانہ نہ کرتے۔ ایک روز رات کے کھانے پر اسکول سے متعلق کسی بڑے خرچے کا ذکر ہوا۔ ہم نے کہا "ہمارے پاس تو اتنی رقم ہے نہیں، کل دفتر میں 'سرور' سے بات کریں گے۔"

حفصہ نے سنا تو چھوٹتے ہی بولی "ابو جی ی ی ی! 'سرور' تو سینے میں ہوتا ہے!"

ہمارا بیٹا ماشاء اللہ ایکچوئری (Actuary) ہے۔ ایکچوئری کا شمار بھاری معاوضہ لینے والے ماہرین میں ہوتا ہے۔ حفصہ کو معلوم ہوا کہ ایکچوئری کو بہت زیادہ تنخواہ ملتی ہے تو اس کے معصوم ذہن میں ایک خدشہ پیدا ہوا۔ پریشان ہو کر امی سے کہنے لگی "امی... امی! بھائی جب ایکچوئری بنا، تو اس کی تنخواہ ابو سے زیادہ ہو جائے

www.pdfbooksfree.pk

گی۔ تب کہیں ہمیں ابو اس سے جلیں گے تو نہیں؟"

ایک بار حفصہ چھٹیوں میں کسی عزیزہ کے ہاں رہنے گئی۔ خاتون خانہ نے کسی بات پر اپنی ملازمہ کو مارا تو وہ رونے لگی۔ حفصہ سے چھوٹی سی بچی کو مارنا اور اس کا رونا نہ دیکھا گیا۔ شام کو جب وہ بچی بچوں کو لیے پارک میں گئی، تو راستے میں حفصہ اس سے کہنے لگی "نصرت! سب سے پہلے تو تم یہ ملازمت چھوڑ دو تاکہ تمھیں مار نہ پڑے۔ پھر کسی اچھے اسکول میں داخلہ لو۔ تمھاری زندگی بن جائے گی۔"

حفصہ بے چاری کو کیا پتا کہ اگر بچی کے والدین کے پاس وسائل ہوتے، تو وہ غریب کھیل کود کی عمر میں ملازمت کرنے کے بجائے کسی اسکول میں پڑھ رہی ہوتی۔

> حفصہ آسمان کی طرف منہ کیے دعا مانگ رہی ہے "اللہ میاں! ہمارے لیے بھی اوپر سے ایک گاڑی پھینک دیں۔"

ایک بار اہلیہ نے کسی بات پر اسے ڈانٹا، تو کہنے لگی "میں نے بہت صبر کر لیا۔ اب مزید برداشت نہیں کر دوں گی۔ آپ ٹھیک ہو جائیں ورنہ میں آپ کے رویے پر ایک نظم لکھ دوں گی۔"

حفصہ کو بچپن میں بیر بہت پسند تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ "بیر" کو "فیر" کہتی اور صوتی بڑی۔ گھر میں جب کوئی مہمان آتا، تو اس سے کہتی "آپ کو پتا ہے، ہمارے فریج میں 'فیر' رکھی ہے، ابو لائے تھے۔"

جو بھی سنتا مشکوک نظروں سے ہمیں گھورنے لگتا۔ تب ہمیں اپنے گھر میں رکھی 'بیر' دکھانی پڑتی۔

ایک روز بازار سے ہم مہینے کا سودا لے کر آئے۔ حفصہ کارٹن سے مختلف اشیا نکال نکال کر اہلیہ کو دینے لگی۔ اچانک اس کی نظر ہاربک کنگھی پر پڑی، جو سودا سلف میں نیچے کہیں دبی تھی۔ جس طرح املی یا کھٹائی کے ذکر سے منہ میں پانی بھر آتا ہے، کنگھی دیکھ کر اسے اپنے سر میں کھجلی محسوس ہونے لگی۔ سر کھجاتے ہوئے بولی "امی، امی کنگھی آئی، کھجلی شروع۔"

ایک دن بولی "ابو ہمارے اسکول میں سب بچے گاڑی پر آتے ہیں، آپ بھی خرید لیں۔"

ہم نے کہا "اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ ہمیں گاڑی دے دیں۔"

کچھ دیر بعد بالکونی میں چڑے اپنے کپڑے اتارنے گئے، تو دیکھا حفصہ آسمان کی طرف منہ کیے دعا مانگ رہی ہے "اللہ میاں! ہمارے لیے بھی اوپر سے ایک گاڑی پھینک دیں۔"

ایک روز اس کے ہاتھ پر چوٹ لگ گئی اور وہ سرخ ہو گیا۔ غصے میں بھری ہمارے پاس آئی اور کہنے لگی "ابو، ابو، امی کو دیکھیں، مجھے ہرا جوڑا پہنا رہی ہیں۔ میں کہہ رہی ہوں کہ لال جوڑا پہنائیں، میری چوٹ اس سے میچ کرے گی، مگر امی مجھے نہیں دے رہیں۔"

ایک مرتبہ دونوں بہنیں اپنے اپنے کمروں کا موازنہ کرنے لگیں کہ میرے کمرے میں یہ ہے، تمھارے میں وہ نہیں۔ دونوں میں کافی دیر بحث چلتی رہی۔ سارہ کے کمرے میں زیادہ چیزیں نکلیں۔ حفصہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی "میرے کمرے میں تو [illegible] بھی ہیں۔" سارہ یہ سن کر مسکرائی اور لاجواب ہو گئی۔

اب ذرا حفصہ کے چند معصوم مشورے ملاحظہ

www.pdfbooksfree.pk

قرآن کے بچوں نے آنکھیں حیران کر دیا۔

منصورہ چار برس کی ہوئی، تو ہم نے اسے اسکول میں داخل کروا دیا اور آنے جانے کے لیے وین کا بندوبست کر دیا۔ پہلے دن اسکول سے واپس آئی، تو ہم نے پوچھا "اسکول کی وین میں مزہ آیا؟"

کہنے لگی "ہاں بہت مزہ آیا۔ مگر اس میں وہ آدمی تو تھے ہی نہیں جن کے ہاتھ میں بہت سارے پیسے ہوتے ہیں اور جو بار بار دروازے پر ہاتھ مار کر شور مچاتا رہتا ہے صدر صدر (صدر صدر)۔"

ایک مرتبہ منصورہ کی طبیعت خراب ہوئی۔ رات دو بجے کے ہاں گئی، تو وہاں کوئی بچی تھی اور بہت دیر سے آئی۔ اگلے روز اس نے دوپہر کو ان کے ہاں پہنچ کر کہا، تو کہنے لگی "امی! میں نماز مغرب پڑھنے کی چلیں۔ ان کے ہاں تو جو نہیں ہوگا، شاید اس وقت ساری عمر میں اپنے بیٹوں کو چھوٹے سے ہی ہو گی۔"

ہمارے ایک ہم زلف بچوں اور بڑوں میں ہیں۔ ہم نے ایک روز ان کو جاتے ہوئے کہ بیل گاڑی روکی۔ وہاں گاڑی میں پیچھے لگے والے گھوڑوں کے منہ پر کالک لگی تھی۔ منصورہ نے دیکھا تو انھیں حیرت ہوئی کہ یہ کالے کالے سے کیسے ہیں۔ پھر حیران ہو کر امی سے کہنے لگی "امی! یہ ہمارے خالو بھی گاڑیوں میں کھچڑی کھاتے ہیں؟"

میں نے دفتر جانا شروع کیا، تو امی اس کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ وہ صبح چلی گئی، شام کو تھکا ہارا گھر آتا اور پھر رات بھر پڑھتا رہتا۔ منصورہ نے محسوس کیا کہ امی ہمارے مقابلے میں بھائی کا زیادہ خیال رکھتی ہیں۔ اس سے نہ رہا گیا اور معصومیت سے بولی "امی! آپ ابو کی طرح بھائی کا بھی خیال رکھتی ہیں، ہمارا بھی اسی طرح خیال رکھیں گی؟"

ہمارے بچے کو دفتر کی طرف سے انگلینڈ میں ملازمت ملی، تو ہم لوگ علامہ اقبال ایئرپورٹ سے الوداع کرنے گئے۔ ہم نے منصورہ سے کہا "تم تو اچھا ہے۔ مگر تمھیں بہت دور ہے۔ ہماری بچی کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" منصورہ نے کہا "تو بھائی کو ہم بھیجیں گے۔" وہاں جانے کا پروگرام تو نہیں بنا۔ اس نے اسی وقت انھیں دو صفحات پر مشتمل ایک خط لکھا جس میں پہلے تو آپ اللہ تعالیٰ کے وعدے یاد دلائے اور پھر انھیں ہماری حیثیت بتائی۔ اس خط کا آخری جملہ یہ تھا:

"ابو آپ لاکھ نصیحت میں چھوٹا سا نصیب ہی چاہیے۔"

ایک مرتبہ ہم نے ایک صاحب کو دوران گفتگو بے وقوف کہہ دیا۔ وہ آگے بڑھے اور کہنے لگے "تم پاگل تو بہت سے لوگوں نے کہا ہے مگر بے وقوف ابھی تک کسی نے نہیں کہا تھا۔" اچھا اب ہم انھیں کیسے یقین دلائیں اور کچھ سمجھ نہ آیا۔ ہمارا خط لکھا اگر اسے بات پر تو ہم نے پڑھا تو شرمندہ ہو رہے، کیونکہ اپنے اس خط میں ہم نے انھیں "مرزا" کا خطاب دیا تھا۔

اسی طرح منصورہ نے کتاب آنے کے بعد خط لکھنے چھوڑ دیے۔ اب اگر کبھی ہماری کوئی بات ناگوار گزرے، تو چپ چاپ اٹھ کر کمرے میں جاتی اور اپنی کتاب میں ایک رقعہ رکھ کر ہماری طرف بڑھا دیتی ہے۔ مثلاً "آپ ذرا کتاب کے صفحے ۱۸ اور ۴۵ پڑھ لیجیے۔"

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

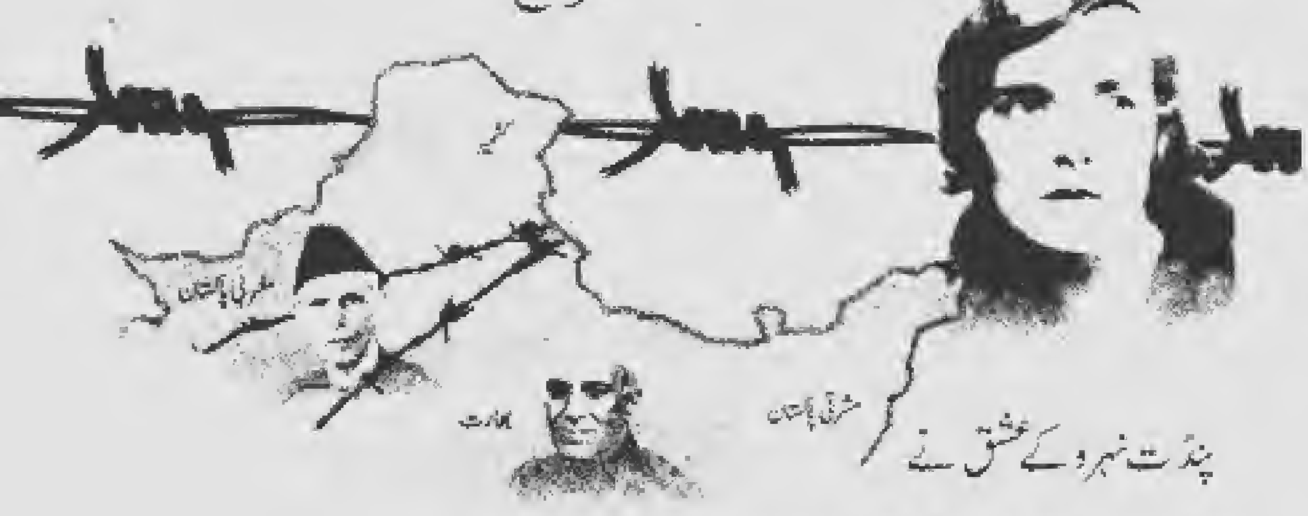

پنڈت نہرو کے عشق نے

پاکستان کو مسلم اکثریتی علاقوں سے محروم کر دیا

انگریز ہندو ملی بھگت کی چشم کشا داستان

مجی الدین منیر

تقسیمِ ہند کا باضابطہ اصول طے پا چکا تو ادارہ

جب ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم محمد علی جناح، مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کی باہمی رضامندی سے ریڈکلف باؤنڈری کمیشن تشکیل دیا جس کا مقصد دونوں ملکوں کی سرحدوں کی حد بندی کرنا تھا۔ بحث مباحثے سے بچنے کی خاطر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم سے پہلے ہی حکومت نے ان کمیشن کے فیصلے پر رضامند ہیں گے۔

لیکن جون ۱۹۴۷ء سے آخر تک بھی کمیشن کا کوئی مستقل سربراہ نہیں آ سکا۔ کمیشن کا چیئرمین ریڈکلف تھا جس کے نام پر ہی باؤنڈری کمیشن کا نام بھی رکھا گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ شخص ۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو ہندوستان پہنچا۔ وہ پاک بھارت علاقوں کے جغرافیے سے بالکل ناواقف تھا۔ ایک اور حیران کن بات یہ کہ ریڈکلف نے اپنا ایوارڈ اس وقت سنایا جب پاک بھارت تقسیم عمل میں آ چکی تھی یعنی ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو۔

دو ممالک وجود میں آ چکے تھے لیکن ان کی سرحدیں کہاں تک ہیں، اس کی کوئی وضاحت ۱۵ اگست تک موجود نہیں تھی۔ فیصلے میں تاخیر کیوں ہوئی، ساری داستان اس کی وجہ میں پوشیدہ ہے۔ باؤنڈری کمیشن اس لیے بنایا گیا تھا کہ دونوں ممالک کے علاقے متعین ہو جائیں اور پڑوسی کی حیثیت سے پاک بھارت چل سکیں۔ کمیشن کا مقصد مستقبل کے سرحدی تنازعات کا خاتمہ

www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ لیکن جو کچھ سامنے آیا وہ توقعات اور مقصد کے بالکل برعکس تھا۔ سازشی ہندو اور مکار انگریزوں نے پاکستان کو کمزور کرنے کے حالات بنانے کی خاطر ایک طرف تو مسلم اکثریتی علاقے غیر قانونی طور پر بھارت کو عطا کر دیے۔ دوسری جانب کشمیر کا شعلہ جوالا مستقبل کے لیے سلگتا چھوڑ گئے۔

معروف دانشور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اپنی تحقیقی کتاب "جدوجہد پاکستان" میں لکھتے ہیں "ایسا وقت ایک مدت تک [illegible] ہندو اپنا [illegible] کا حق [illegible] تھے مسلمانوں سے [illegible] آنے دیا [illegible] [illegible]

[illegible]

ہندوستانی کے معاملات سے [illegible] تاریخ [illegible] یعنی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء [illegible] کی۔ [illegible] کے پیش نظر سردار پٹیل نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مشورہ دیا کہ انتقال اقتدار کی طویل مدت خطرناک ہوگی۔ (بحوالہ کتاب فریڈم ایٹ مڈنائٹ۔ Lorry Collins اور Lappierre ص ۱۹۳)

یہ دونوں حقائق واضح کرتے ہیں کہ پاکستان کے خلاف سازشیں شروع ہی سے جاری تھیں۔ [illegible] اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "عبوری انتقال اقتدار [illegible] کا تعین باؤنڈری کمیشن سے [illegible] جانا چاہیے تھا [illegible]

[illegible]

اشتی قوت بن چکا۔ قاضی عبدالرحمان لکھتے ہیں: ہندو، انگریز سازش تو پاکستان کے راستے میں بارودی سرنگ بچھانے کے مترادف تھی۔ اسی مقصد کے تحت پاکستان کی سرحدوں میں کاٹ چھانٹ کی گئی۔ اس سے آبپاشی نظام کا کنٹرول تو ہوا ہی، اس سے دفاعی ساز و سامان (اسلحہ، توپوں وغیرہ) کو منتقل کرنے میں [illegible]" (ص۔ ۵۵۹)

"انتہائی کے وقت پیدا ہونی ہے" یہ کہنا کہ [illegible] دیا کام انتہائی رازداری سے انجام دیا [illegible] بہت سے ہندو یا مسلم ریاستوں کو نہیں معلوم تھا کہ ان کو علاقہ پاکستان میں شامل ہوگا یا انھیں بھارت کی مملکت میں شامل ہوگا۔ بنگال کے علاقے مرشد آباد اور مالدہ کے لوگوں کی اکثریت (۶۵ فیصد) مسلمان تھی اور ان کا یقین تھا کہ انھیں [illegible] پاکستان میں شامل ہو جائے گا اور وہ اس کے شدید خواہش مند بھی تھے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ اپنے علاقوں میں جوش و خروش سے [illegible] پرچم لہراتے رہے [illegible] علاقے بھارت سے [illegible] آبادی کی [illegible] فیصد [illegible] سے [illegible] بھارت [illegible] ریاستوں کا [illegible] تک ریاستوں [illegible] ہندو [illegible] گئے۔

[illegible] پاکستان [illegible] [illegible] [illegible]

تعارف مصنف

رضی الدین سید کراچی کے معروف مصنف و کالم نگار ہیں۔ ان کے تحقیقی و مدلل مضامین پاکستان کے تقریباً تمام بڑے اخبارات و رسائل بشمول انگریزی روزنامہ ڈان اور دی نیوز وغیرہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ [illegible] اب تک [illegible] ۱۲ [illegible] تحقیقی موضوعات پر [illegible] (۱) [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible] (۶) [illegible] اور (۷) "تحریک حقوق [illegible]" شامل ہیں۔

[illegible] (۳۵، ۳)

ان سے [illegible] [illegible] [illegible]

یہ ہے کہ اس ضمن میں اقوام متحدہ کو بھی بیچ میں نہیں ڈالا گیا۔" (حالانکہ تقسیم ہند کے بعد نہرو نے کشمیر کا معاملہ اقوام متحدہ ہی کے سپرد کیا)۔ انسائیکلوپیڈیا مزید لکھتا ہے:

"ایوارڈ میں دوران خندق تبدیلیاں کی گئیں۔ اگرچہ رپورٹ انتہائی خفیہ رکھی گئی لیکن نہرو، پٹیل اور مینن کی وساطت سے اس کے بارے میں کئی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔"

وکی پیڈیا کا مضمون وضاحت کرتا ہے کہ ریڈکلف کے اعلان اور پھر واپس لندن روانگی کے بعد سر ریڈکلف نے اس ایوارڈ کے تمام کاغذات جلا کر ضائع کر دیے۔

ان حقائق کے بعد اب یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ۱۶ اگست کو جب ریڈکلف فیصلہ (ایوارڈ) سامنے آیا اور جس میں بددیانتی سے پاکستان کا رقبہ کم کر دیا گیا تو قائداعظم نے اسے خاموشی سے کیسے برداشت کر لیا اور بھارت کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہ کی؟

جواب یہ ہے کہ جب پاکستان معرض وجود میں آیا، تو وہ کمزور، مفلوک الحال، اقتصادی ابتری کا شکار اور فوجی ساز و سامان سے یکسر محروم تھا۔ اس وقت سوائے زبانی کلامی احتجاج کے اور دوسرا کوئی اقدام اٹھانا ممکن نہ تھا۔ عقل بھی تسلیم کرتی ہے کہ اس وقت کوئی فوجی کارروائی کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوتا۔ تاہم ایوارڈ آنے کے بعد قائداعظم نے اس پر احتجاج ضرور کیا۔ اس ضمن میں برطانیہ میں پاکستانی سفارت خانے کے سابق سیکرٹری اطلاعات قطب الدین عزیز حقیقت احوال سے واقف ہیں۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ ترمیم میں یہ تبدیلی سر ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کی خفیہ سازشوں کے تحت ہوئی۔ ان دونوں کا خفیہ معاشقہ مدت سے جاری تھا۔ (اس کی تائید ڈاکٹر مشتاق حسین قریشی نے بھی اپنی مذکورہ کتاب میں کی ہے)۔ اسی دوستی کے باعث لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے ایوارڈ میں تبدیلی کے لیے اپنے وائسرائے شوہر پر دباؤ ڈالا۔ قطب الدین عزیز مزید کہتے ہیں کہ پنجاب کا علاقہ فیروزپور ایک بہت بڑا فوجی ڈپو اور آبپاشی نظام کا ہیڈ ورکس تھا۔ اسی باعث یہ علاقہ بھی پاکستان کے نقشے سے مٹا دیا گیا تاکہ اسے ناقابل بیان نقصان پہنچایا جا سکے۔

قائداعظم تک جب یہ فیصلہ پہنچا تو وہ سکتے میں آ گئے۔ قطب الدین عزیز بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر راہنمائے قوم نے ردعمل میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا "ہمیں مختصر حد تک سکیڑ دیا گیا ہے۔ باؤنڈری کمیشن نے ہم پر یہ آخری وار کیا ہے۔ اس ایوارڈ کو سراسر غیر منصفانہ، ناقابل تصور اور متعصبانہ فیصلہ ہی گردانا جائے گا۔ لیکن چونکہ ہم نے باؤنڈری کمیشن کے ایوارڈ پر اپنی تائید و منظوری کا سرکاری اعلان کر دیا تھا، اس لیے اب اسے تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں۔ اس آخری جھٹکے کو بھی ہم ان شاء اللہ استقلال، جذبے اور امید کے ساتھ باعزت برداشت کر لیں گے۔" (دیکھیں قطب الدین عزیز کی کتاب Jinnah and the Battle of Pakistan، کراچی۔ باب ۱۰)

باؤنڈری کمیشن کے ایک مسلم رکن منیر احمد اپنی فطرت کے اعتبار سے لبرل تھے اور جو بعد میں چیف جسٹس آف پاکستان بھی مقرر ہوئے۔ ہماری مراد چیف جسٹس منیر احمد سے ہے۔ نجانے متنازع ایوارڈ پر انھوں نے دستخط کیوں کر دیے؟

یہ واضح ہے کہ ایسے موقع پر قائداعظم کی جگہ کوئی اور سربراہ بھی ہوتا تو احتجاج کے علاوہ کچھ اور نہ کر پاتا کیونکہ اس وقت پاکستان معاشی و عسکری لحاظ سے کمزور حالت میں تھا۔ اس لیے باؤنڈری کمیشن کے معاملے میں قائداعظم پر نکتہ اٹھانا حقائق سے ناواقفیت، مطالعے کی کمی اور تعصب و جانبداری کا مظہر ہے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

سچا واقعہ

کسی کے سامنے چال چلنے والی

مردہ دُلھن زندہ ہوگئی

انسانی جذبات کی پُراسرار بھول بھلیوں میں جنم لینے والا حیرت انگیز ماجرا

ناہید ہاشمی

یہ واقعہ غیر معمولی نوعیت کا تو نہیں پھر بھی اس کی صداقت پر قدرے شبہ ہو جاتا ہے۔ یہ شبہ دور کرنے کے لیے میں بہ حسن کوشش کروں گی۔ نانی مرحومہ بیان کرتی تھیں کہ یہ واقعہ حق ہے۔ اس کے علاوہ ابھی اس واقعے کے چند عینی شاہد زندہ ہیں جن میں میرے نانا جان بھی شامل ہیں۔

اس وقت نانی اماں بانو کی عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ الھڑ، اچھی تھی اس لیے اپنی سب رشتے دار بہنوں سے بڑی نظر آتیں۔ والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ آٹھ بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کے ناتے وہ گھر بھر کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ اللہ نے صورت کے ساتھ سیرت بھی اچھی دی۔ ساتھ ہی دولت بھی گھر کی لونڈی تھی۔

یوں سمجھیں کہ نہ جانے کتنے لڑکے ان کے دیوانے تھے۔ ہر گھر کی یہی خواہش تھی کہ بانو ان کے گھر کی بہو

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ ساتھیوں دوستوں کی شادی ہو چکی تھی لیکن نہ ہوئی تو بانو کی۔ دراصل جس رشتے کے لیے ہامی بھرتے، دوسرا خواہشمند رشتہ دار فتنہ پردازیاں شروع کر دیتا۔ مجبوراً ان کے ابا کو اس رشتے کا خیال چھوڑنا پڑتا۔ وہ چچا کے ہاں ہامی بھرتے، تو تایا بگڑ جاتے۔ تایا کو خوش کرنا چاہتے، تو اماں کے ننھیال والے منہ پھلا لیتے۔

جھگڑوں میں رشتہ کرنے کو دل نہ مانتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بانو کی عمر بڑھتی گئی۔ ساتھ والیوں کی گود میں بچے کھیلنے لگے لیکن بانو کی شادی کہیں نہ ہو سکی۔ بانو پہلے دن تو بہت ہنستی کھیلتی رہیں پھر لکڑی کی طرح اندر ہی اندر سلگنے لگیں۔ اس زمانے میں منہ سے بولنا بے مروتی تھا۔ اس لیے میاں کی کالی ہونے کا خطاب پا کر لڑکی چپ چاپ والدین کی خوشی قبول کر لیتی۔

یہی بانو کے ساتھ ہوا۔ آخر یوں جوں جوں یہ مسئلہ طویل ہوتا گیا، بانو گھن کی طرح کھوکھلی ہوتی چلی گئیں اور پھر بیٹھے بیٹھے دورے پڑنے لگے۔ ہر وقت بخار رہنے لگا۔ چہرے کی ساری شادابی رخصت ہوئی۔ بخار اور کھانسی نے راستہ دیکھ لیا۔ جب دیکھو بانو سر پر پٹی باندھے چارپائی پر لیٹی رہتیں۔

پہلے پہل تو گھر والوں نے زیادہ توجہ نہ دی مگر جب چہرہ مرجھا کے پھول کی طرح پیلا پڑ گیا، تو ابا کا دل دھڑکنے لگا اور اماں بھی چونک گئیں۔ حکیم کو دکھایا۔ اس نے انھیں بتایا کہ لڑکی کو دق ہو گئی ہے۔ یہ سن کر گھر والوں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ حکیم کا منہ بھر کر اسے یہ بات چھپانے سے منع کیا۔ لیکن یہ مرض بھی عارضی دواؤں سے ٹھیک ہوا ہے؟ صحت ہونے کے بجائے حالت اور بگڑتی چلی گئی۔ یہی کہ وہ جیتے جی اندر ہی اندر گھلتی ہوئی مرنے لگیں۔

آخر یہ بات سب تک پہنچی، سارے رشتے داروں میں پھیل گئی۔ اب تو سارے امیدوار لڑکوں نے اپنی اپنی دکان بڑھانے کی سوچی۔ اب دور دور تک کوئی لڑکا ایسا نظر نہ آتا جو بانو سے شادی کی خواہش رکھتا۔ بانو کے بڑے بھائی فوج میں ملازم تھے۔ وہ جب لمبی چھٹی لے کر گھر آئے، تو بانو کی حالت دیکھ کر گھر والوں پر برس پڑے۔ انھوں نے شہر سے اپنے دوست ڈاکٹر کو بلا لیا۔

ابا کی مخالفت کے باوجود بانو کا ڈاکٹری علاج شروع ہو گیا۔ مریض پر دواؤں سے زیادہ توجہ اثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر کی توجہ نے بانو کے دل میں جینے کی امنگ پیدا کر دی۔ تھوڑے دنوں کے اندر اندر گلابی صورت پر بہار کے آثار نظر آنے لگے۔ ڈاکٹر کی محبت بھی گہری ہوتی چلی گئی۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ ڈاکٹر صاحب سے جب معاملہ پوچھا گیا، تو انھوں نے کس چیز کا نذرانہ لینا چاہا۔ گو بانو مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئی تھی مگر ڈاکٹر صاحب شادی کے بعد انھیں باہر لے جانا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں تبدیلی آب و ہوا کے بعد وہ مکمل ٹھیک ہو جائیں گی۔

مگر اس انکشاف نے خاندان میں آتش فشاں پہاڑ کا منہ کھول دیا۔ منجھلے بھائی سے لے کر ابا تک نے زہر کھا لینے کی دھمکی دے ڈالی۔ اماں نے تو قسم کھائی کہ اگر ایسا ہوا، تو وہ چھت سے کود کر مریں گی۔ مختصر یہ کہ سوائے بڑے بھائی الطاف کے اور کوئی اس رشتے پر راضی نہ تھا۔

گھر والے ڈاکٹر صاحب کا علاج چھڑا کر فوراً بانو کی شادی کی کوشش میں لگ گئے۔ اماں کا لاڈلا بھانجا جائداد کی خاطر اب تک بانو سے شادی کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ اماں نے اسی سے جھٹ منگنی کر دی۔ بانو بیچاری منہ سے پھر بھی کچھ نہ بولی۔ لیکن عین نکاح والے دن ایسا

www.pdfbooksfree.pk

واقعہ پیش آیا جس کے متعلق یقین دلانے کے لیے میں ان کی حلفیہ قسم اوپر بتا چکی ہوں۔

گھر میں شادی کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ برات آنے میں صرف ایک پہر باقی تھا۔ بڑے بھائی الطاف ڈاکٹر دوست کے ساتھ شہر چلے گئے۔ انھوں نے شادی میں شریک نہ ہونے کی قسم کھائی تھی۔ نجانے ان کی اس دھمکی کا بھلا کس پر اثر ہوتا تھا؟ سہ پہر کو اچانک بانو کا دل بری طرح گھبرایا۔ انھوں نے سب سہیلیوں کو چلے جانے کی التجا کی۔ پھر سب کے دیکھتے ہی دیکھتے تیورا کر گریں اور پھر نہ اٹھیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ خوشیاں لٹ گئیں۔ دل کی دھڑکن تھم چکی تھی۔ وہاں تو ایک لاش تھی۔ بانو سب کو چھوڑ کر جا چکی تھیں۔

اب گھر والوں کی آنکھیں کھلیں۔ اماں ابا اپنی ہٹ دھرمی پر پشیمان ہوئے۔ اپنی لاڈلی کو اب آنے کے واسطے دے کر روتے تھے۔ رشتے دار الگ شرمندہ نظر آتے تھے۔ بھائی بچارے پچھتاوے کھاتے دکھائی دیتے۔ سب کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ شام برات آنے کے وقت سے پہلے ہی میت کو نہلا دھلا کر کفن پہنا دیا۔ خوشی پر پھولوں کی چادر ڈال دی۔ ایک آدمی بڑے بھائی کو بلانے شہر گیا ہوا تھا۔ ان کے آنے تک جنازہ اٹھانا ممکن نہ تھا۔ صبح تک لاش اسی حالت رکھی رہی۔

صبح چار بجے بھائی الطاف بھی آ گئے۔ اس غریب نے اپنی لاڈلی بہن کی پھولوں میں لپٹی نعش دیکھ کر سر پیٹ ڈالا۔ سب اس سوگوار جلوس نے بڑے اہتمام سے میت اٹھائی اور صبح پانچ بجے تک قبرستان پہنچے۔ وہاں ایک عجیب واقعہ ظہور میں آیا۔ قبر کھودنے کے بعد الطاف بھائی لحد میں اترے۔ بہن کی لاش کو سہارا دیتے ہوئے ہی انھوں نے سر کے نیچے ہاتھ رکھا لاش میں ایک دم حرکت سی پیدا ہوئی۔

ایک لمحے کے لیے الطاف بھائی چونک گئے۔ انھوں نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ دوسری بار بھی ان کا ہاتھ بڑھا ہی تھا کہ بانو کا جسم بری طرح کانپنے لگا۔ یوں لگا جیسے کسی بیمار پر غشی کا دورہ پڑ گیا۔ یہ خوفناک منظر دیکھ کر سارے لوگ الٹے قدموں بھاگ لیے۔ قبرستان میں صرف الطاف بھائی اکیلے رہ گئے۔

ان کا بیان ہے کہ انھوں نے جلدی سے کفن کا کپڑا ہٹا کر دیکھا کہ بانو پوری کوشش سے جسم سے اس کو الگ کرتے ہوئے کپڑے ہٹا رہی ہیں۔ بھائی کو سامنے دیکھ کر انھوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ایک ٹک دیکھنے کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ بھائی نے سہارا دے کر انھیں اٹھایا اور گھر واپس لے آئے۔ جہاں ماتم چھوڑ کر خوف کی دبی دبی سرگوشیوں میں بدل چکا تھا۔

جب غم سے نڈھال والدین نے اپنی لاڈلی کے زندہ ہونے کی خبر ملی اور انھوں نے اسے اپنے قدموں سے بھائی کے ہمراہ گھر آتے دیکھا تو آپ سوچ سکتے ہیں ان لوگوں کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ خوف سے بے نیاز ہو کر سب بانو سے لپٹ گئے۔ یہ کہنا اب فضول ہے کہ بانو تھی ہماری تائی اماں کے شوہر وہی ڈاکٹر صاحب تھے جو اب ہمارے دادا جان کہلاتے ہیں۔ بقول ان کے بانو کو سکتہ ہو گیا تھا۔ پھر انھیں نئی زندگی انھی کے لیے ملی۔

بات کچھ بھی ہو، یہ حقیقت ہے۔ یوں بیٹی کی جدائی کا یہ غم بڑے ڈرامائی انداز میں خوشی میں بدل گیا۔ تائی اماں یہ واقعہ سنانے کے بعد ہمیشہ خوابوں میں کھو سے جاتیں جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

خاکہ

ادیبوں کی آئی ایس آئی اور

اُردو ادب کے محتسب اعلیٰ

دودھاری کاٹ والا تلواری قلم رکھنے والے مشفق خواجہ المعروف بہ خامہ بگوش کا منفرد تذکرہ

راشد اشرف

کراچی کے علاقے ناظم آباد میں پہاڑی کے قریب ایک چھوٹی سی گلی اور اس میں ایک چھوٹا سا مکان جس کے دروازے پر یہ تختی لگی رہتی تھی:

"پیشگی اطلاع کے بغیر زحمت نہ کریں۔"

تختی پر لکھے ہوئے یہ الفاظ ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کے بعد غیر مؤثر ہو گئے کیونکہ مکان کا مکین پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کے قبرستان میں جا سویا جہاں اب اس سے کسی ملاقاتی کو ملاقات سے قبل پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ تختی کے نیچے سے شروع ہونے والے اس فون نمبر ۴۲۸۰۴۱۰ پر اب فون کیجیے، تو ایک خاص انداز میں بولنے والے کی آواز بھی وہاں نہیں ملتی کیونکہ مکان کے مکین بدل چکے۔

کسی کی قبر اس ایک جملے سے ساتھ ہو تو قبروں تک اپنی تحریر سے لے جاتی۔

معروف نقاد مظفر علی سید نے مشفق خواجہ کی تحریروں کے بارے میں لکھا تھا "تیر کتاب کے جنگل میں ہے کہ کہیں کوئی نہ کوئی سید چھپا ہوتا ہے۔" خامہ بگوش کی

www.pdfbooksfree.pk

نظریں نہایت تعلّی سے اس کیفیت کو برآمد کرتیں۔

بقول محمد ذاکر "خواجہ صاحب کے اندر چھپا ہوا مسخرا بچوں کی بات و مذاق اپنے انداز میں ایسے بیان کر دیتا کہ لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی۔" ایک اور موقع پر مشفق حسین کہتے ہیں: "ان کی کاٹ دار گہری رودھاری ہوتی ہے۔ پہلو داری کا کمال ہی کچھ ہے کہ ادھر ادھر کا پہلو نظر نہ آئے لیکن جب دونوں طرف بار کر نکلے تو پتا چلتا ہے کہ دونوں زد میں آ گیا۔"

محمد عمر (لاہور) میں ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کو دنیا میں پیدا ہونے والے مشفق کی دنیا کے اردو ادب میں مشفق خواجہ کے نام سے جانے گئے اور ادبی حلقوں میں وہ خامہ بگوش کے نام سے مشہور تھے۔ مشفق خواجہ کے انتقال کے بعد یوں محسوس ہوا کہ ایک عہد انہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ بقول انور سدید "مشفق خواجہ کے انتقال پر ادب زیادہ روئے کہ خامہ بگوش نے زیادہ تحت کا لکھے تھے کہ جنہیں ہر بار اپنے کالم کا موضوع بنایا انہیں فخر ہے کہ اب ایسے شگفتہ انداز میں ان کا تذکرہ اپنے کالموں میں کون کرے گا۔"

مشفق خواجہ کے چھوٹے بھائی خواجہ عبدالرحمٰن طارق کے مطابق انھوں نے بھائی کی موت پر خبروں کو بھی چھوٹے چھوٹے کر دیے لیکن مشفق خواجہ کے بعد شہر کراچی سے علم کا سایہ اٹھ گیا۔ بقول تھے، شہر کا حافظہ کھو گیا۔ وہ اپنے محدود مالی وسائل سے ہر وقت ضرورت مند سے مفلوک اور بے روزگار ادیبوں و شاعروں کی مالی مدد کرتے ہے مرحومین کی بیواؤں اور بچوں کی مالی اعانت بھی کیا کرتے تھے۔

ایک ادارے نے ان کا وظیفہ دس ہزار روپے مقرر کیا تھا جو بعد میں یک مشت ادا کیا جاتا۔ خواجہ طارق بیان کرتے ہیں کہ یہ رقم وہ تھی جو ان کے بھائی پہلے ہی سے مرتب شدہ فہرست کے مطابق اسے مستحق احباب میں تقسیم کر دیا کرتے۔ خواجہ عبدالرحمٰن طارق کے بقول مشفق خواجہ کے پاس اتنی رقم کے قریب ایسے مقالات تھے جنھیں وہ خود شائع کرانا چاہتے تھے۔

خواجہ طارق نے اپنے ایک مضمون میں اپنے بڑے بھائی کے بارے میں کئی دلچسپ باتیں بیان کی ہیں۔ ان میں مشفق خواجہ کی کالم نویسی کے متعلق سے ایک پریشان کن پہلو سے بھی قارئین کو آگاہ کیا۔ پہلے مشفق خواجہ کا اپنی کالم نویسی سے متعلق یہ تبصرہ ملاحظہ ہو: "جس قسم کے خطوط (کم دو اور دھمکی آمیز) ہمارے نام آتے ہیں، اگر کسی دوسرے کے آئیں تو کالم نویسی ترک کیا شہر بھی چھوڑ دے اور کسی جنگل میں جا کر باقی زندگی یاد الٰہی میں گزار دے۔"

ایک مرتبہ مدیر ظرافت اشتیاق قاضی مرحوم خواجہ صاحب کے پاس اپنا مجموعہ کلام بغرض تبصرہ (فلیپ پر لکھوانے) لائے۔ بقول مشفق خواجہ انھوں نے کلام دیکھ تو لیا لیکن کسی بات سے بے نیاز رہے۔ قاضی صاحب کے شدید اصرار پر خواجہ صاحب نے لکھ کر ان کے حوالے کیا۔ پڑھ کر انھیں کلام پر کسی شاعر پر بھی آتی۔ انھوں نے ایک ایک کالم پر محنت کی ہے جو ان کی بساط سے باہر ہے۔ اس پر اشتیاق قاضی باقاعدہ طور پر مشفق خواجہ سے ناراض ہو گئے۔

مشفق خواجہ کراچی سے اخبار جسارت اور ہفت روزہ تکبیر میں خامہ بگوش کے قلمی نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔ ۲۲ مارچ ۱۹۹۷ء کو اپنا آخری کالم لکھنے کے بعد انھوں نے مستقل طور پر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ خواجہ صاحب نے کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۵۸ء میں بی

www.pdfbooksfree.pk

اے (آنرز) اور ۱۹۵۹ء میں ایم اے (اردو) کیا۔ ۱۹۵۷ء میں انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۷۳ء تک اس ادارے میں خدمات انجام دیں۔

انجمن میں انہیں مولوی عبدالحق کے ساتھ کئی برس کام کرنے کا موقع ملا۔ اردو مخطوطات پر کام کیا۔ یگانہ چنگیزی کی کلیات مرتب کی۔ انجمن ترقی اردو کے جرائد ہفت روزہ ہماری زبان، سہ ماہی اردو اور ماہنامہ قومی زبان کی ادارت کی۔ جریدہ [illegible] کے مدیر بھی رہے۔ برصغیر کے اہم کتب خانوں میں مشفق خواجہ کا کتب خانہ اہم ترین شمار کیا جاتا ہے۔ اس کتب خانے سے ہندو پاک کے [illegible] افراد بشمول مشاہیر ادب نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے سلسلے میں استفادہ کیا ہے۔

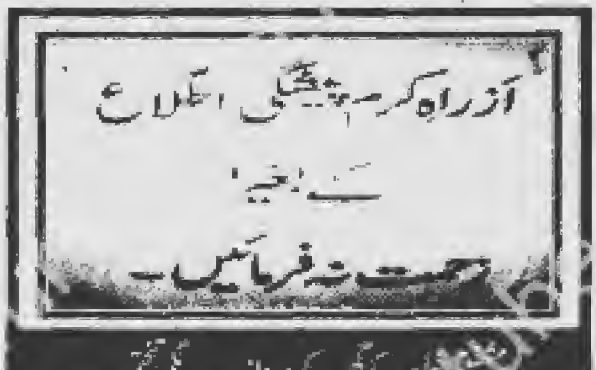

مشفق خواجہ کے گھر کے دروازے پر لگی تختی

مذکورہ کتب خانے میں تقریباً پچاس ہزار کتب اور چھ ہزار سے زائد رسائل و جرائد موجود ہیں۔ [illegible] کے مطابق مشفق خواجہ ہزاروں روپے کی کتابیں خرید کر ہندوستانی لائبریریوں کو بھجواتے تھے۔ ان میں خدا بخش لائبریری پٹنہ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، جامعہ ملیہ لائبریری دہلی اور مولانا آزاد نیشنل لائبریری حیدرآباد دکن شامل ہیں۔ اس بات کا تذکرہ اہم ہے کہ مذکورہ کتب خانے میں مشفق خواجہ کے خطوط، ان کی غیر مطبوعہ تحریریں، ذاتی ڈائریاں، تصویریں اور مخطوطات اب موجود نہیں۔ یہ خزانہ اب ان کے اہل خانہ کے پاس ہے۔ ان کے مستقبل کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جا سکتی۔ (مشفق خواجہ کی اہلیہ ان دنوں شدید علیل ہیں۔)

شاعر مشفق خواجہ کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

پیچھے ہوتے در و دیوار دیکھتے واہ
اسے بھی دیکھو جو اک عمر یاں گزار گیا
پیچھے تو تازہ ہوا آتی تھی کمرہ اس پر ستم
گھر کی دیواروں کو ہم نے اور اونچا کر دیا
راہ کے مصائب سے تھک کے بیٹھنے والے
زندگی سفر میں تھی، زندگی سفر میں ہے

کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ مشفق خواجہ نے اپنی زندگی میں اپنا نادر روزگار کتب خانہ محفوظ کرنے کی خاطر اردو ریسرچ لائبریری کنسورشیم (او یونیورسٹی آف [illegible] کنسورشیم) سے ایک معاہدہ کیا تھا۔ اس کی رو سے مذکورہ کتب خانہ لائبریری کنسورشیم کو فروخت کر دیا گیا۔ ان کے انتقال کے بعد [illegible] کتب خانے کے معاملات کے نگران ہیں۔

کتابوں کی کیٹلاگنگ کا کام اس وقت سے مستقل جاری ہے۔ کتب خانے کا نیا نام مشفق خواجہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر قرار پایا ہے۔ یہ کتب خانہ ۲۰۰۸ء میں وقف کے طور پر ریسرچ سنٹر بنا دیا گیا۔ علم و ادب سے شغف رکھنے والے احباب کے لیے یہ خوشی کی خبر ہوگی کہ اس کتب خانے کو آن لائن کیے جانے کے منصوبے پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ کام کی تکمیل کے بعد دنیا میں کسی بھی جگہ سے اس سے استفادہ کیا جا سکے گا۔

مشفق خواجہ نجی محفلوں میں بھی اپنے شگفتہ تبصروں کی

www.pdfbooksfree.pk

بہت سے مرکزِ نگاہ رہتے۔ راشد شیخ سے روایت ہے کہ ایک محفل میں ایک صاحب کافی دیر سے اپنی تعریف میں باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے بے اختیار انھیں اپنا ماضی یاد آ گیا اور فرمانے لگے ''ہمارے بچپن کا زمانہ بھی کیا سستا زمانہ تھا، دایہ بچہ جنوا تھوڑا سا گُڑ اور آٹھ آنے لے کر خوش ہو جاتی تھی۔''

مشفق خواجہ ان صاحب کی باتیں پچھلی صف میں بیٹھے سن رہے تھے۔ یہ جملہ سنتے ہی انھوں نے بے اختیار کہا ''اور آٹھ آنے میں بچے بھی آپ جیسے ہی پیدا ہوتے تھے۔''

لطف علی خاں، ادا جعفری، مشفق خواجہ اور نورالحسن جعفری

عطا الحق قاسمی نے ایک مرتبہ مشفق خواجہ سے پوچھا کہ دوزخ مذکر ہے یا مونث؟ خواجہ صاحب نے جواب دیا ''میرا خیال ہے مونث ہے کیونکہ لوگ اس کے عذاب سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔''

خواجہ صاحب خود پر بھی فقرہ کسنے سے نہ چوکتے۔ مبین مرزا بیان کرتے ہیں کہ ایک بار ہندوستان سے ایک خاتون اور ان کا شوہر ملنے آئے۔ دونوں تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے اور پہلی مرتبہ مشفق خواجہ سے ملے۔ تھوڑی دیر تک تو فضا میں اجنبیت اور تکلف کا تناؤ سا رہا۔ پھر خاتون نے ذرا بے تکلفی اختیار کرتے ہوئے کہا ''خواجہ صاحب ہم تو آپ کے پاس آتے ہوئے ڈر رہے تھے۔''

مشفق خواجہ نے دریافت کیا ''کیوں؟''

خاتون بولیں ''ہم نے تو سنا تھا کہ آپ پنجابی ہیں لیکن آپ سے مل کر اطمینان ہوا۔ آپ کے لب و لہجے، مزاج اور لباس سے کسی طرح ایسا نہیں لگتا۔''

خواجہ صاحب نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے جواب دیا ''ابھی بس تھوڑی دیر بعد دیکھیے، میری حرکتوں سے معلوم ہو جائے گا۔''

مشفق خواجہ نے اپنے کالموں میں جن مشاہیرِ ادب کو نہایت تواتر کے ساتھ تختۂ مشق بنایا، ان میں سرِفہرست جوش ملیح آبادی، نظیر صدیقی، مظہر امام، انور سدید، منظر علی خاں منظر، قمر جمیل، انیس ناگی، باقر مہدی، بشیر بدر، استاد اختر انصاری اکبر آبادی، سلطان جمیل نسیم اور ساقی فاروقی شامل ہیں۔ باقر مہدی اور مظہر امام تو باقاعدہ طور پر مشفق خواجہ سے ناراض ہو گئے۔ اتنے کہ خواجہ صاحب کو ان سے معذرت کرنی پڑی۔

واضح رہے مشفق خواجہ کے کالم طنز و مزاح سے بھرپور ہوتے تھے۔ کوئی ایک کالم بھی ایسا نہیں جس میں کوئی کٹیلا پن نہ چھپا ہو۔ لیکن چند کالم ہی ایسے تھے جن میں محض دنیا سے گزر جانے والوں کی دل کی گہرائیوں سے توصیف کی گئی۔ ان شخصیات میں کہ صلاح الدین، منظر علی خاں منظر، استاد اختر انصاری اکبر آبادی کی وفات پر لکھے کالم شامل ہیں۔

کالموں کے تیر اثر جملے

مشفق خواجہ کے قلم سے نکلے چند یک سطری تبصرے ملاحظہ ہوں جنھیں ان کے شگفتہ کالموں سے منتخب کیا گیا۔ یہ وہ کالم ہیں جو ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۷ء تک کراچی

www.pdfbooksfree.pk

کے اخبار جسارت اور ہفت روزہ تکبیر میں شائع ہوئے۔

☆ مہذب ملکوں میں جن کاموں پر سزا دی جاتی ہے، ہمارے ہاں انھی کاموں پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جاتی ہے۔

☆ کتاب کو ایک نشست میں پڑھ ڈالا، یہ سوچ کر کہ جو گزرنی ہے وہ ایک ہی مرتبہ گزر جائے۔

☆ ہم نے آج تک کسی محقق کے چہرے پر مسکراہٹ اور ہاتھوں میں کوئی معقول کتاب نہیں دیکھی۔

☆ جب ابن انشا کو اپنی کوئی تازہ نظم پسند نہیں آتی تھی، تو اس پر یہ لکھ دیتے "چینی زبان سے ترجمہ کی گئی ہے۔"

☆ ایک زود نویس ادیب سے کسی نے پوچھا "آپ اتنا لکھتے ہیں، کبھی تھکتے نہیں؟" انھوں نے فرمایا "یہ کام میرے پڑھنے والے کرتے ہیں۔"

☆ مظہر علی خاں مظہر کی ہر نئی کتاب کا بوجھ کتابوں کے بوجھ سے زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ کتاب کو نہ صرف پڑھنا بلکہ اس پر کالم لکھنا پڑتا ہے۔

☆ یہ دن بھی ہمیں دیکھنا تھا کہ جن کتابوں پر مقدمات ہونا چاہیے، ان پر اب انعامات ملتے ہیں۔

☆ ایک زمانہ تھا کہ لوگ دور دراز مقامات کے سفرنامے لکھتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ بعض لوگ اپنے مکان کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جائیں، تو سفرنامہ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

☆ محقق اکرام چغتائی سے ہم نے عرض کیا "آپ نے واجد علی شاہ کی بیویوں پر کچھ زیادہ ہی تحقیق کروائی، اتنی تحقیق تو ان پر خود واجد علی شاہ نے نہیں کی تھی۔"

☆ جب نوٹ زیادہ تعداد میں چھپتے ہیں تو افراطِ زر کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کتابیں زیادہ تعداد میں چھپتی ہیں تو ادب افراط و تفریط کے مسئلے سے دوچار ہو جاتا ہے۔

☆ مطالعۂ تاریخ کے تقاضے بہت الجھے ہوئے ہیں۔ مطالعہ تو حضرت والا بھی آ جاتے ہیں لیکن قاری کو واپسی کا راستہ نہیں ملتا۔

☆ راغب مراد آبادی کا کلام عروضی غلطیوں اور غیر عروضی خوبیوں سے پاک ہوتا ہے۔

☆ جوش کے کلام سے صحت زبان کی سند تو لی جا سکتی ہے، ذہنی صحت مندی کے لیے کوئی راہنمائی نہیں ملتی۔

☆ اقبال اکیڈمی کو کراچی بدر کر کے لاہور سے پیوستہ کر دیا گیا، حالانکہ اس شہر میں اقبال کا مزار پہلے سے موجود تھا۔ اقبال اکیڈمی کی وجہ سے ایک ہی شہر میں علامہ کے دو مزار بن گئے۔

☆ افتخار عارف کو قاموس الالفاظ خود مرتب کرنی چاہیے۔ یہ کام ان کے لیے نسبتاً آسان ہوگا۔ اس کے لیے مثالیں تلاش نہیں کرنی پڑیں گی، اپنے کلام ہی سے مل جائیں گی۔

☆ قمر علی عباسی کے کالم جس اخبار میں چھپتے ہیں، اس میں جرائم کی خبروں کے بعد بھی ایک پڑھنے کی چیز ہوتی ہے۔

☆ آج کل بیشتر مزاحیہ ادب فلیپوں اور دیباچوں کے ذریعے منظر عام پر آتا ہے۔

☆ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی میں اگر صلح ہو گئی تو اوراق اور فنون کیا کریں گے؟ ان کے پاس تو مضامین چھاپنے کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں رہے گا۔

☆ ملی مرکزی ادارے علاقائی نہیں، بیچ بیچ کے مزار ہیں جن میں موجود فنون لطیفہ کے سیاسی مرکزیوں سے مراکز میں تبدیل کر دیا گیا اور لوگوں کی وابستگی مزید میں ترقی دے کر مجاور بنا دیا گیا ہے۔

☆ احمد فراز کی صحت مندی کی انتہا ہے کہ فیض کے انتقال کے بعد بھی وہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی

کام نہیں کرتے۔

☆ انیس ناگی بے مثال دیدہ دلیری سے سچ بولتے ہیں، ایسی دیدہ دلیری تو پیشہ ور جھوٹ بولنے والوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔

☆ عہد میر میں صرف دلی میں پانچ ہزار شاعر تھے اور آج لاہور کے تھانہ انارکلی کی حدود میں اس سے زیادہ شاعر مل جائیں گے۔

☆ غزل کی صنف پر شاعروں نے جو ستم توڑے ہیں اگر انھیں بیان کیا جائے، تو چنگیز اور ہلاکو کے مظالم کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ چنگیز اور ہلاکو ظلم کرتے کرتے کبھی تھک بھی جاتے تھے، غزل گو ہر لحظہ تازہ دم رہتے ہیں۔

☆ عام ادبی تحریریں پڑھنے سے پہلے ہم عموماً آنکھیں بند کر لیتے ہیں، لیکن کوئی تحقیقی شذرہ دیکھ کر آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔

☆ جس طرح سرکاری ملازموں کو ناکارکردگی کی بنا پر جبری ریٹائر کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ادب میں بھی جبری ریٹائرمنٹ کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔

☆ جو شعرا کسی مروجہ صنف شعر میں کمال نہیں دکھا سکتے، وہ ہائیکو کے ذریعے صاحب کمال بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم انصاری نے مشفق خواجہ کے اسلوب کے بارے میں کیا خوب بات کہی تھی، وہ ادب دوست، لاہور کے جون ۲۰۰۰ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:

رسالہ کتاب نما دہلی میں مشفق خواجہ کا یہ جملہ ان کی ہر تحریر کے آغاز میں درج تھا:

"خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا لطف اٹھائیے۔"

آخری سفر

اردو زبان و ادب کے اس محتسب اعلیٰ اور بقول شخصے ادیبوں کی آئی ایس آئی، مشفق خواجہ نے ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء رات ساڑھے دس بجے کراچی کے آغا خان اسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کا جنازہ ۲۲ فروری کو ڈیفنس کراچی میں واقع ان کی بڑی بہن کے گھر سے اٹھایا گیا۔ عصر کے وقت سوسائٹی کے قبرستان میں اپنے والدین کے پہلو میں تدفین ہوئی۔

پرستاروں کی بڑی تعداد تدفین کے وقت موجود تھی۔ وہ علم و دانش کے پیکر کو سپرد خاک کرنے آئے تھے۔ لوگوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، کچھ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ محسن مرزا بیان کرتے ہیں:

خواجہ صاحب، ہاشم رضی، اختر شوق اور محسن مرزا کے ساتھ

"نماز جنازہ کے لیے وضو کر کے آتے ہوئے میں نے دو آدمیوں کو گفتگو کرتے سنا۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا "یار! اگر اب اردو اور ادب کے بارے میں کچھ پوچھنا پڑا، تو کس کے پاس جائیں گے؟""

مشفق خواجہ کا قطعہ تاریخ وفات ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے کہا

تھا بلاشک غنیمت وہ مشفق خواجہ
کیسے نہ کریں ماتم مشفق خواجہ
بے سر ہوا علم اور بے پا تحقیق
ہاتف جو پکارا غم مشفق خواجہ

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

پُراسرار کہانی

قبر کی ہولناک تاریکی سے

مُردے کا ٹیلی فون

وہ لالچ و ہوس میں ایسے اندھے ہوئے کہ عقل سے پیدل ہو کر
گورکنارے جا سوئے..... حیرت و اسرار کے پردوں میں لپٹی کتھا

سلیم راشد

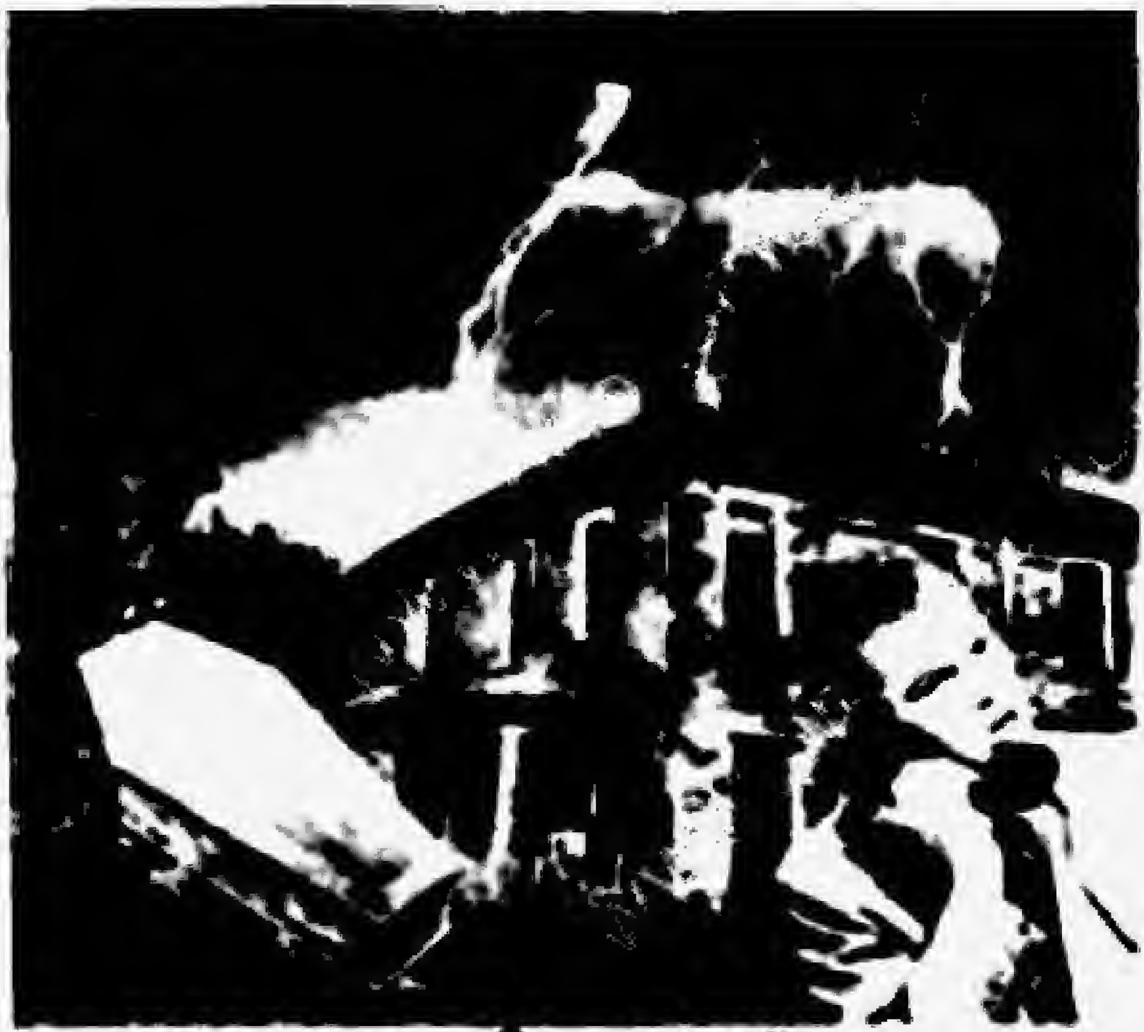

2015

www.pdfbooksfree.pk

ہم منزل پر آ پہنچے۔"

"جمیلہ!" کار جس ویران راستے پر رکی وہاں خودرو گھاس نے پگڈنڈی کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ [illegible] آنکھوں میں [illegible] ہوتے ہوئے کہا [illegible] بچوں کی [illegible] اور [illegible] ہیں۔" [illegible] چودہ سال کی عمر میں گھر سے [illegible] ہیں۔"

[illegible]

جھیل ختم ہوئی، یہ قصبہ کا اختتام ہے۔ اس کے بعد آبادی ختم ہو جاتی ہے اور آگے صرف جنگل اور دلدلی زمین ہے۔" [illegible]

اس نے [illegible] اٹھ کے [illegible] اس نے [illegible] سے اٹھا لیا۔ [illegible] تھی۔

[illegible]

www.pdfbooksfree.pk

تب وہ دونوں مجھے دیکھ کر ششدر رہ جائیں گی کیونکہ وہ تو مجھے مردہ سمجھ چکی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ٹھوکر سے دروازہ کھولا۔

بند کمرے میں عجیب سی گھٹن اور بو تھی۔ قد آدم طرز کے شیشوں والے پلنگ، پرانی وضع کے طاق، فرسودہ پردے، کمرے کی ہر شے عہد پارینہ کا نشان تھی۔ دونوں بڑھیوں نے حیرت سے انھیں دیکھا۔ خالہ بے نور آنکھوں سے انھیں گھور رہی تھی مگر اس کی ناتواں چچی نے بڑے سکون سے دریافت کیا۔ "تم کون ہو؟ اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

جبار نے اپنے بارے میں بتایا۔

وہ اسی طرح پرسکون لہجے میں بولی "جبار... وہ تو کب کا مر چکا۔ پانچ سال پہلے ایک ڈاکے میں دیہاتیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ ستار نے یہ خبر خود اخبار میں سے پڑھ کر ہمیں سنائی تھی۔"

جبار بولا "چچی، یہ تو محض غلط فہمی ہے۔ دیکھ لیں میں آپ کے سامنے زندہ سلامت کھڑا ہوں۔ یہ حمیلہ ہے میری بیوی۔"

"آداب چچی۔" حمیلہ نے قریب آ کر جھک کر سلام کیا۔

"ہوں۔" اس کی خالہ نے نہ دیکھنے والی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

حمیلہ نے کچھ کہنا چاہا مگر چچی کی بات شروع ہو چکی تھی۔ "حمیلہ میری بہو۔" وہ اس سے مخاطب ہو کر اسے اتار رہی تھی۔ "بہت ہی اچھی ہے..." حمیلہ نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر چچی پھر بول رہی تھی۔ "حمیلہ بہت خوبصورت تھی مگر جوانی میں... افسوس کی بات ہے کہ وہ بھی مر چکی۔"

یہ سن کر حمیلہ تو آپے سے باہر ہو کر بولی "مجھے مردہ کہنے سے تمھارا کیا مطلب؟ جبار، یہ تو پاگل ہے۔ یہ کس پاگل خانے میں لے آئے ہو مجھے؟"

مگر چچی نے جیسے چوٹ نہ کھائی، وہ اسی پرسکون لہجے اور کھوکھلی آواز میں کہے جا رہی تھی۔ "جبار مر چکا۔ آج سے پانچ برس قبل ایک ڈکیتی میں مارا گیا تھا... چچی تم اس بات کو کیوں نہیں سمجھتیں کہ زندوں کے ساتھ زندہ اور مردوں کے ساتھ مردے رہتے ہیں... اگر وہ مر چکا، تو تم بھی مردہ ہی ہو گا۔"

حمیلہ وحشت سے پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جبار نے کہا "چچی اب بس کرو اس ڈرامے کو۔ ہم دونوں زندہ ہیں اور تم دیکھ بھی رہی ہو۔"

"ہوں۔" خالہ جیسے اپنی بے نور آنکھوں سے دیکھ کر بولی۔

چچی جیسے فتح یابی کے احساس سے چہکی۔ "اگر تم واقعی زندہ ہو، تو پھر یہاں کیا لینے آئے ہو؟ تمھیں یاد نہیں کہ آوارگی کی وجہ سے تمھارے باپ نے تمھیں گھر سے نکالا تھا اور کیا تمھیں یہ بھی یاد نہیں کہ اس نے کہا تھا، تم زندہ اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ تو کیا تم یہاں لینے آئے ہو؟"

جبار چیخ کر بولا "چچی! ہم دونوں زندہ ہیں اور تم زندہ جنازوں کو دفنانے میں... میں تو اپنی وراثت کی رقم لینے آیا ہوں۔" اس نے تمام تفصیل بتا دی۔ "ستار مر چکا اور اب تمام وراثت پر صرف میرا حق ہے۔"

خالہ کی موٹی سی اپنی چندھی آنکھیں لیے خوفزدہ بلی کی طرح بیٹھی تھی۔ چچی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "ہاں! ستار مر چکا۔ تمھیں بھی ستار کی موت کا علم ہو گیا تھا۔ بیچارہ مرنے کے بعد اس کی تم سے ملاقات ہوئی ہو گی، اس نے وراثت کی رقم کے بارے میں بتایا ہو گا۔"

www.pdfbooksfree.pk

اب جبوری کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ چلا کر بولا "بچی! رکو، باتیں بند کرو۔ ہم تھک گئے ہیں اور کس کے حق نے ڈاکٹر بچہ اختیار کر دیا ہے۔" اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر دونوں کو ایسے چبھنے والی نظروں سے گھورا۔ شاہ تو چپ ہی ہو گئی۔ وہ بولا "ہم دوسری منزل کے کمرے میں جا رہے ہیں۔ تم یہیں رہو اور اس کے بعد تم تالا لگا دینا۔" جبوری نے سامان اٹھا لیا۔ پیچھے سے ان کے کانوں میں بچی کی آواز آئی:

"آپ تو اتنی جلدی بوڑھے لگنے لگے۔ اگر نظروں سے زندہ رہنے کو ناممکن رہا رہے ہو تو بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں!" بچی بولی "ابھی تو آپ کی عمر ہی کیا ہے، جوانی میں کیوں مر رہے؟"

وہ دوسری منزل کے کمرے میں پہنچے۔ وہ بھول گئے کہ ان دونوں کو فرش پر گرنا پڑا۔ بچی ہوئی تھی۔ دیکھا دونوں تاثرات سے مرجھائی کی ... تھی۔ اس کی آنکھوں سے بچپن اور شرارت سے تمسخر عیاں تھا۔ جو کمرے کی تنہائی میں وہ سکتے سے ہم میں دوا کا احساس ہوا تھا مگر خاندان اور زارا کے چہرے نے دونوں کی طبیعت کو بحال کر دی۔ جمیل کے اعصاب کا تناؤ کم ہو گیا مگر مکمل طور پر نہیں کیونکہ ابھی تک وہ زارا کی نامانوس آواز سے چونک اٹھتی۔ ملحل پر کسی منافی کی بات کے جواب میں اس کی آواز سے اس کا دل دہل جاتا۔ وہ بولی "جبوری! ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں؟ مجھے تو اس سے وحشت ہو رہی ہے۔ تم جانتے ہو کہ مجھے بند اور تنگ والے کمروں سے کتنی نفرت ہے۔"

وہ پکار کر بولا "ہمیں صرف ایک رات ہی تو گزارنی ہے۔ صبح ہم اس سے اپنی رقم وصول کریں گے اور پھر اس کے بعد اس جگہ کی جگہ نکلتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ پولیس والوں کو قتل کے مقدمے میں اب تک میری تلاش ہے۔ پچاس ہزار کی رقم سے ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ہمیں پاسپورٹ بنوا کر ملک سے باہر جا سکتے ہیں۔ ایک نئی زندگی شروع ہو سکتی ہے۔"

"وہ ٹھیک ہے۔" جمیل نے جھجکتے ہوئے کہا "مگر بچی کی فکر بہت ہو رہی ہے۔" وہ ایک مرتبہ پھر چونکی۔

"اب بچی نہیں ہے۔" وہ اسے تسلی دینے کے انداز میں بولا "ہم نے سنا ہے اپنے خاندان کے بارے میں دو چیزیں ... تو نے اس پر غور نہیں کیا۔ میرے پردادا ... کی ملک کے ساتھیوں میں سے تھے۔ جب ان کو موت آئی تو وہ تمام مال و متاع لے کر اس دور کی بستی میں آ گئے۔ اب تو پرانا زمانہ تھا۔ تب ان کو زمین اور دولت اور زندگی سب کچھ سے پیار تھا۔ انہوں نے اسی جگہ ... ملی ... اس کا ذکر اور مال سے ان کی ... سے ایک ... زارا کی ... اس کے بعد میرے باپ نے ... میں ... کی ... اس سے ایک ... کا پتا ہو گا۔ ان ... کے ... سے ... میں کسی کی ... پتا نہیں چلا۔"

"تمام دولت تمہاری بچی کے قبضے میں ہے اور یہ کمبخت بڑھیا ہمیں ایک دھیلا بھی نہیں دے گی۔"

"وہ مجھے کیسے روک سکتی ہے؟" اس کے لہجے اور چہرے پر اب عجیب سی نخوت اور مکاری تھی۔ "ضرورت پڑنے پر میں ان دونوں "مرغیوں" کی گردنیں مروڑ بھی سکتا

www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔"

"قتل؟" وہ سرگوشی میں بولی۔

"اور کیا، قتل کیا، یہ تو دنیا سے ان کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہوگا۔ ویسے بھی چچی اور میں نے کبھی ایک دوسرے کو پسند نہیں کیا بلکہ یوں سمجھو کہ بارہ برس کی عمر سے ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ وہ میری سالگرہ کا دن تھا اور اسی دن میرے دادا کا انتقال ہوا۔ وہی دادا جنھوں نے اپنے تابوت میں کروٹ بدلی تھی۔"

"جبار!" جمیلہ چلا اٹھی۔

"خاموش! گھبراؤ نہیں، ہمارے خاندان سے ایسی بہت سی پراسرار روایات وابستہ ہیں۔"

"نہیں۔"

"ہاں جمیلہ! یہ حقیقت ہے۔ مثلاً میرے باپ نے اپنے تابوت میں بجلی فون رکھوایا تھا۔ تحقیق کیں فون! وہ بجلی فون جو درست حالت میں ہو اور جسے کام میں لایا جا سکے۔ یہ اس لیے کہ اگر وہ بھی تابوت میں کروٹ بدلے یا وہاں سے باہر نکلنا چاہے تو اسے کسی قسم کی دقت نہ ہو۔"

"کیا کہتے ہو؟"

"ہاں ہاں! یہ سب کچھ ان کی وصیت میں تھا۔ اور کھڑکی کے قریب آؤ۔" اس نے کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ گھر کے عقب سے درختوں کی قطاریں تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر خشک زمین نے دلدل کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ ابتدائی تاریکیوں کے چاند کی ہلکی روشنی میں خشکی اور پانی ملے جلے سے تھے۔ گھر سے سو گز کے فاصلے پر اس نیم دلدلی زمین پر ایک ننھی عمارت نظر آ رہی تھی۔

"یہ تابوت خانہ ہے۔" جبار نے عمارت کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ وہ دونوں سحر زدہ سے خاموشی سے کھڑے اس تابوت خانے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ چرچراہٹ کے ساتھ اس کا دروازہ کھلا۔ جمیلہ نے ریڑھ کی ہڈی میں خوف کو سرد لہر کے مانند محسوس کیا۔ تابوت خانے کے دروازے سے ایک دراز عورت نکلی جو اس بے نور چاندنی میں کسی جنگلی روح کی پرچھائیں معلوم ہو رہی تھی۔ وہ گھر کی طرف ہی آ رہی تھی۔

"چچی صاحبہ!" جبار کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "مگر یہ اس وقت تابوت خانے میں کیا کر رہی ہے۔"

"تابوت خانہ!" جمیلہ نے کپکپاتی آواز میں دہرایا۔

"ہاں! اس دلدلی زمین میں مردے دفن نہیں ہو سکتے، اس لیے یہ عمارت تابوت خانے کے طور پر بنوائی گئی۔ اسے تم بھی قبرستان ہی سمجھ لو۔ گو ہمارے خاندان ہی کے تمام لوگ یہیں دفن ہیں۔ پھر بھی خاصی جگہ باقی ہے۔ دراصل اس کے فرش کو آب روک بنایا گیا ہے۔"

دور بجلی چمکی جس سے ایک لمحے کے لیے یہ وحشت ناک منظر چمک گیا اور ساتھ ہی دور بادلوں کی گرج سنائی دی۔ چند ہی لمحوں میں چاند کا دیا بڑھتے سیاہ بادلوں میں بجھنے والا تھا۔ جبار بڑبڑایا۔ "طوفان آ رہا ہے۔"

کھڑکی سے ہٹ کر وہ دونوں پھر کھانے کی میز پر آ بیٹھے۔ جبار اسے بتانے لگا "جب بارش آئے تو دلدل میں پانی کی سطح ایک دو فٹ کے لیے اونچی ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات نالوں میں سیلاب آ جاتا ہے اسی لیے اس مکان کی کرسی بہت اونچی رکھی گئی۔ چنانچہ یہ پانی سے محفوظ رہتا ہے۔ تب بارش کی وجہ سے اس گھر میں چند دنوں کے لیے ٹھہرنا پڑ جاتا ہے۔"

"لیکن جبار!" وہ گھبرا کر بولی۔ "میں اس گھر میں ایک رات سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتی۔ یہ قطعی ناممکن ہے۔"

"گھبراؤ نہیں، بھلا تمھیں زیادہ دیر تک ٹھہرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہاں تو میں تمھیں چچی صاحبہ سے

www.pdfbooksfree.pk

بارے میں بتا رہا تھا۔ جب ہم اپنے دادا کو دفن کر کے آئے تو چچی نے نکلنے میں دیر لگا دی۔ میں نے یہ سمجھ کر دروازے پر تالا لگا دیا کہ سبھی نکل چکے۔ گھر چونکہ عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھرا تھا، اس لیے اگلی صبح تک کسی نے چچی کی کمی محسوس نہ کی۔

آخر رات کو چچی نے دادا کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے سنا تو انھوں نے اسے جواب بھی دیا۔ دادا نے التجا کی کہ وہ اسے یہاں سے نکلنے میں مدد دے۔ مگر چچی نہ مانی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دادا مردہ ہے۔ اس دن کے بعد سے چچی کو یہ وہم ہو گیا کہ وہ مردوں سے بات چیت کر سکتی ہے۔"

جمیلہ کا رنگ اڑ چکا اور ہونٹ زرد ہو رہے تھے۔ وہ حلق میں لعاب نگل کر بولی "تم..."

جبار مسکرا کر بولا "یہ تو صرف مذاق تھا۔ ابھی یہ قصہ پورا نہیں ہوا ہے۔ پہلے پہل تو کسی کو چچی کی بات پر یقین ہی نہ آیا۔ مگر پھر میرے والد کو بھی تجسس ہوا چنانچہ سب نے مل کر تابوت کھولا، تو واقعی دادا کی نعش کروٹ کے بل پڑی تھی۔ یہی نہیں بلکہ منہ بھی یوں کھلا تھا جیسے وہ مدد کے لیے پکارتے پکارتے جان گنوا بیٹھے۔ ان کی آنکھیں بھی کھلی تھیں حتیٰ کہ ادھر ادھر کھرچنے کی وجہ سے انگلیوں کے ناخن بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔"

"خدا کے لیے جبار! کیوں میری جان نکال رہے ہو۔"

"جمیلہ! اس قصے کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ دراصل ہمارے آبا میں سے کسی کو سکتے کا مرض لاحق تھا، اس لیے امکان ہے کہ دادا کو بھی سکتہ ہوا ہو۔ اس بات سے میرے ابا بہت خوفزدہ ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے پیش بندی کے طور پر اپنے تابوت میں ٹیلی فون لگوایا۔"

"جبار!" وہ کپکپا کر بولی۔

"سچ ہے پیاری!" وہ زور دے کر بولا۔ "چنانچہ میرے ابا کو ان کی وصیت کے مطابق فون کے ساتھ تابوت میں ڈالا گیا تاکہ کبھی ان کی آنکھ کھل جائے تو وہ مدد کے لیے لوگوں کو بلا سکیں۔"

"اف خدایا!"

"اچھا چلو چھوڑو اس قصے کو، میں تو چچی صادقہ سے معاملے کی بات کرنے کا خواہاں ہوں، لیکن ٹھہرو! تجوری ابا کی تصویر کے پیچھے ہوتی تھی۔ دیکھیں تو بھلا یہ اب تک وہیں ہے!"

اس نے جب دیوار کے پاس جا کر ایک تنومند، سرخ چہرے اور باہر کو نکلی آنکھوں والے شخص کی تصویر اٹھائی تو تجوری کے پٹ وا ہو گئے۔ جمیلہ کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ لیکن کھلی تجوری دیکھ کر خوف اور پریشانی کے احساسات ختم ہو گئے۔ جبار نے خوشی سے چیختے ہوئے نقدی رکھنے والا ڈبا باہر نکال کر جب اسے توڑا تو اس میں سے ایک کاغذ نکلا۔ وہ بے تابی سے اسے پڑھنے لگا۔ جمیلہ بھی پنجوں کے بل اونچی ہو کر اس کے کندھے پر سے دیکھا کرنے لگی۔ دونوں تحریر پڑھنے میں محو تھے اور سیاہ حروف ان کا منہ چڑا رہے تھے۔

اس دن کے بعد سے چچی کو یہ وہم ہو گیا کہ وہ مردوں سے بات چیت کر سکتی ہے۔"

پشت پر چوبی تختے کی چرچراہٹ ہوئی، تو دونوں نے یکبارگی گردنیں گھمائیں۔ دروازے پر چچی صادقہ کھڑی گھور رہی تھی۔ جبار چلا کر بولا "یہ کاغذ کہہ رہا ہے کہ ابا کے بعد تم ساری دولت کی وارث ہو۔"

"پھر!"

"پھر یہ کہ یہ میری دولت ہے اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔ بتاؤ وہ سب مال تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

"جبار بیٹے! وہ سب محفوظ ہے بالکل محفوظ۔ اگر تم اسے

www.pdfbooksfree.pk

ہی بے تاب ہو تو اسے تلاش کیوں نہیں کر لیتے۔"

"بے فکر رہو چچی! میں یہی کروں گا۔" ایک دو لمحوں تک دونوں خاموش کھڑے ایک دوسرے کو گھورتے رہے پھر وہ بولا "اور ہاں! اتنی رات گئے تم تابوت خانے میں کیا کرتی پھر رہی ہو؟"

"میں تمھارے بھائی ستار سے باتیں کرنے جاتی ہوں۔ وہ اپنی "ٹھنڈی قبر" میں تنہائی محسوس کرتا ہے۔ میری باتوں سے اس کی طبیعت بہل جاتی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ مردے خود تو چل کر آنے سے رہے۔ اسی لیے میں ہی اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔"

جمیلہ خوف سے کانپ رہی تھی مگر چچی صادقہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی۔ "اسی طرح جیسے تم نے پچھلے تمھارے دادا اور پھر ابا سے بات چیت کی تھی۔ جبار! تمھیں دادا والی بات تو نہ بھولی ہوگی؟"

جمیلہ دہشت سے چیخ اٹھی۔ مگر جبار نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ چچی سے پوچھ رہا تھا۔ "مگر چچی تم اتنی دولت کا کیا کرو گی؟ تم تو مردہ ہو اور مردوں کا دولت سے کیا کام؟"

اب وہ چلا کر بولا "چچی! ختم کرو اس پاگل پن کو۔ تم مجھے تنگی پر مجبور کر رہی ہو۔ میں تمھیں رسی سے باندھ کر جلتے سگریٹ کے ٹکڑے کھلاؤں گا۔ پھر میری زندگی کا یقین آئے گا تمھیں۔"

وہ اطمینان سے بولی "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں دراصل اس وقت ستار کے پاس تمھارے ہی بارے میں مشورہ کرنے گئی تھی۔"

"اچھا؟" وہ بے اعتباری سے بولا۔

"ہاں! اور اس نے کہا کہ تمھیں دولت کا بتانے میں کوئی حرج نہیں، آخر تم اپنے ہی تو ہو۔ اب یہ اور بات ہے کہ دادا سے مر چکے۔"

وہ بے تابی سے بولا "کہاں ہے؟"

"تابوت خانے میں۔" وہ فاتحانہ لہجے میں بولی۔

"ہاں! ہاں! تابوت خانے میں ایسی جگہ پر جہاں کسی چور کا وہم و گمان بھی نہیں جا سکتا۔ تابوت خانے میں جہاں اس خاندان کے تمام لوگ سو رہے ہیں۔ جہاں تمھارا دادا، باپ اور بھائی ہے اور جہاں تمھارے لیے بھی ایک تابوت تیار ہے۔ وہ دولت تمھاری خالی "قبر" ہی میں رکھی ہے۔"

جبار نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "پچاس ہزار روپے میری قبر میں۔ واہ! کیا خوب مذاق ہے چچی۔ ہاہاہا! جمیلہ اب تمھیں اندازہ ہوا کہ ہمارا خاندان کتنا پہنچا ہوا ہے۔ ہاہاہا!"

"جبار!" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "خدا کے لیے تم اٹھو اور جلد از جلد اس پاگل خانے سے نکلنے کی کرو۔ میرے اعصاب جواب دے رہے ہیں۔"

"ہاں!" چچی نے کہا۔ "تمھیں یہ کام جلد کرنا ہوگا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی شب میں زبردست بارش ہو چکی ہے جس کے بعد دلدلوں میں پانی چڑھ رہا ہے۔ تابوت خانے کا فرش بھی درست حالت میں تھا مگر اب وہ بات نہیں رہی۔ اب میں فرش پر ایک ایک انچ پانی دیکھ کر آرہی ہوں۔"

"چچی! تم جانتی تو ہو لیکن یہ جھوٹ ہوا تو ..."

"بچے! مجھے مردوں سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت؟ تم بڑے ضدی ہو، بات مانتے ہی نہیں۔ اگر تم خود بھی مردہ ہو جاؤ تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ ہم سب بڑے اطمینان سے رہ سکتے ہیں۔ پھر میں، تم اور ہم سب خوب مزے سے گفتگو کیا کریں گے۔"

دولت کے تصور نے جبار کے جسم میں نئی توانائی بھر دی تھی۔ چنانچہ اب اسے چچی کی باتوں پر غصہ آیا بلکہ وہ ہنس دیا۔ جمیلہ نے بھی اس ہنسی میں شریک ہونے کی کوشش کی۔

www.pdfbooksfree.pk

جب گھر سے کلہاڑی اور ٹارچ لیے وہ تابوت خانے کی طرف جا رہے تھے، تو ان کے سر پر بادل ایک مرتبہ پھر گرجے۔ فضا تاریک تھی۔ تیز ہوا جیسے درختوں پر چابک برسا رہی تھی۔ موٹے موٹے قطرے زبردست بارش کا پیغام لا رہے تھے۔ تابوت خانے میں خاموشی اور گھٹن کے ساتھ ساتھ سیلن کی سردی بھی تھی اور ہوا جیسے مردہ جسموں کی بو سے بوجھل ہو۔ اس تاریکی میں ٹارچ کی روشنی کا دائرہ ماحول کو اور بھی خوفناک بنا رہا تھا۔

اس بند جگہ جبار کی آواز گونجی اور اس کی گونج خوفناک تھی۔ جمیلہ تو ایک دم اچھل پڑی۔ "اس کے نیچے ایک تہ خانے میں ہمارے بزرگ آرام کر رہے ہیں۔ اس کا راستہ پتھر کی ایک سل سے بند کیا گیا ہے۔ تم ذرا یہ ٹارچ پکڑو، میں اسے کھولتا ہوں۔"

وہ ایک کونے میں جھک کر دیوار کے ساتھ پتھر ٹٹولتا رہا پھر ہلکی سی "کھٹک" کی آواز آئی۔

> جمیلہ کی چیخ سے تابوت خانہ گونج اٹھا۔ جبار کے حواس بھی جاتے رہے۔

جب اس نے اپنے پاؤں کا دباؤ ڈالا، تو ایک مدھم شور سے گویا احتجاج کرتی سیاہ سل اوپر اٹھ گئی۔ نیچے تاریکی منہ پھاڑے جھانک رہی تھی۔ جبار نے سل پکڑ کے اوپر کر دی اور "کھٹک" کی دوسری آواز کے ساتھ سل اپنے بالائی خانے میں پیوست ہو گئی۔

ٹارچ کی روشنی تنگ اور پتلی سیڑھیاں ظاہر کر رہی تھی۔ نیچے تہ خانے سے متعفن اور سرد ہوا کے تیز جھونکے ہی سے جمیلہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ منت کرتے ہوئے بولی "میں باہر رکتی ہوں، تم نیچے اتر جاؤ۔ اندر گھٹن اور سیلن ہوگی اور یہ مجھے ناپسند ہیں۔"

وہ ہنس کر بولا "ذرا سی گھٹن سے مت گھبراؤ، چلو! آخر ٹارچ بھی تو کسی نے پکڑنی ہے۔"

جبار نے احتیاط سے سیڑھیوں پر قدم رکھا، تو اندر سے شوں کرتی کوئی چیز اس کے منہ سے چھوتی گزر گئی۔ جمیلہ کی چیخ سے تابوت خانہ گونج اٹھا۔ جبار کے حواس بھی جاتے رہے۔ چند سیکنڈ دونوں خاموشی سے کھڑے کانپتے رہے۔ جبار کے کپکپاتے ہاتھوں سے ٹارچ کی تھرتھراتی روشنی میں سیڑھیاں اور بھی ویران نظر آ رہی تھیں۔ اتنے میں ویسی ہی ایک اور چیز آئی، تو جبار نے دیکھا، وہ چمگادڑ تھی۔ وہ ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "اوہ! کم بخت چمگادڑ نے تو جان ہی نکال دی۔" مگر جمیلہ خاموش تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن ابھی تک قابو میں نہ تھی۔

جبار نے پھر اترنا شروع کیا۔ جمیلہ نے اعصابی تناؤ اور خوف سے دونوں مٹھیاں اس زور سے بھینچ رکھی تھیں کہ ناخن ہتھیلیوں میں چبھ رہے تھے۔ وہ کانپتی ہوئی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے اترنے لگی۔ سیڑھیاں انھیں بالائی کمرے سے مشابہ کمرے میں لے آئیں۔ فرش پر وہ اونچی پٹی تھا جو سیاہ معلوم ہوتا۔ جمیلہ آخری سیڑھی پر رک گئی۔ بولی "میں اس سے نیچے نہ اتروں گی، یہیں سے روشنی ڈالتی رہوں گی۔"

"بہت اچھا۔" وہ گرم جوشی سے بولا اور ٹارچ اسے پکڑا کر آگے بڑھا۔ "چلو یہیں سے روشنی ڈالتی رہو۔ اور ادھر ادھر۔ اب ذرا دیکھو تو۔" روشنی کے دائرے میں تابوتوں کے کتبے اور تعویذ چمک اٹھے۔ "یہ ہیں میرے پردادا ... اور یہ ... یہ ہیں میرے دادا، انھوں نے تابوت میں کروٹ بدلی تھی۔ یہ دیکھو ان کا کتبہ "عبدالغفار، پیدائش ۱۸۵۴، وفات ۱۹۳۰" اور یہ رہا میرے والد کا تابوت۔ یہ اچھا، یہ ان کا کتبہ ہے "عبدالوہاب پیدائش ۱۸۸۵،

www.pdfbooksfree.pk

وفات ۱۹۲۵ء۔ اور یہ ہاں! یہی تو ستار کی قبر ہے۔ اور یہ ارے یہ کیا؟..... یہ خالی تابوت اور اس پر ایک کتبہ بھی ہے۔

"ارے!" وہ ایک لمحے کو حیرت سے چپ رہا۔

جمیلہ گھبرا کر چیخی۔ "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، یہ میرے لیے ہے۔"

"کیوں؟"

"ہاں! یہ قبر میرے لیے ہے بلکہ اس پتھر پر میرا نام بھی لکھا ہے۔"

"نام؟"

"ہاں! ہاں! یہ دیکھو۔ عبدالجبار پیدائش ۱۹۲۵ء، وفات ۲۱ نومبر ۱۹۵۹ء" وہ خود سے بولا۔ "دیکھو چچی کی مکاری، یہ آج ہی کی تاریخ ہے۔"

"اف خدایا!" جمیلہ جیسے کراہی۔

"معلوم ہوتا ہے شاید وہ یہی لکھنے آئی تھی کیونکہ یہ کوئلے سے لکھا ہے۔ میں اس منحوس بڑھیا کے مزاج درست کر دوں گا۔"

"خدا کے لیے یہ کام ختم کرو اور جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔"

"ٹھیک ہے! ٹھیک ہے!" وہ جیسے بے صبری سے بولا۔ "کنجی کسی جگہ میں پڑی ہے۔" اس نے تابوت پر سے پتھر کی سلیں اٹھائیں۔ دونوں کی نگاہیں اس کی تہ میں کھبی جا رہی تھیں مدھم روشنی میں واقعی نوٹ پڑے تھے۔ بہت سلیقے سے بنڈل قطار در قطار رکھے تھے۔ جمیلہ کی سانس تیز تھی۔ جبار بھی خاموشی سے گھور رہا تھا۔

بالآخر وہ بولا۔ "تو گویا چچی ٹھیک کہہ رہی تھی مگر اب یہ سب کچھ کیسے لے کر جائیں گے؟" پھر خود ہی جیب کر اپنا کوٹ اتارا اس کے بٹن بند کیے، بازوؤں کو گرہ دے کر اسے ایک تھیلے میں تبدیل کر دیا اور جمیلہ سے مخاطب ہوا۔ "اب تم ادھر آجاؤ اور اس میں نوٹ ڈالتی جاؤ۔"

"اوں اوں۔" جمیلہ جیسے منمنائی۔

"شاباش!" وہ خوشدلی سے بولا۔ "خطرے سے نہ گھبراؤ، پچاس ہزار کے نوٹوں کی کافی گرمی ہوتی ہے۔"

کسی نامعلوم جگہ سے آنے والا پانی بتدریج بڑھ رہا تھا۔ جمیلہ نے کانپتے ہوئے سیاہ پانی میں پاؤں ڈالا تو وہ اس کے ٹخنوں تک آ رہا۔ ابھی اس نے چند ہی قدم اٹھائے تھے کہ شور کے ساتھ اوپر راستے کی سل دوبارہ اپنی جگہ پر آ گئی۔ جمیلہ نے چیخ ماری جس کے جواب میں مردہ ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے مشابہ چچی کی ہنسی سنائی دی۔

"چچی!" جبار پوری قوت سے چیخ اٹھا۔

وہ پانی میں سے شڑاپ شڑاپ کرتا گزرا اور سیڑھیاں چڑھ کر پوری قوت سے سل اٹھانے لگا۔

"چچی!" اب اس نے زور سے آواز دی۔

زور لگانے سے چہرہ سرخ ہو گیا اور گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔ "چچی، چچی!"

لیکن سل اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"چچی! خدا کے واسطے! چچی۔" وہ ایک مرتبہ پھر چلایا۔

جواب میں دوبارہ وہی ہنسی آئی جو اب بتدریج دور ہو رہی تھی۔ وہ دوبارہ چیخا "چچی!"

مگر اب چاروں طرف خاموشی تھی۔ دور سے بادل گرجنے کی آواز آ رہی تھی اور فرش پر بڑھتے پانی کی۔

"جبار!" اب جو جمیلہ بولی تو اس کی کپکپاتی آواز محض ایک سرگوشی تھی۔ "اس خبیث بڑھیا نے ہمیں یہاں بند کر دیا ہے۔ ان مردوں کے ساتھ۔ جبار اب ہم کبھی یہاں سے باہر نہ نکل سکیں گے۔" وہ اب خوف سے چیخ رہی تھی۔ "کبھی نہیں! جبار! کبھی نہیں۔"

اچانک وہ خاموش ہو گئی کیونکہ جبار ایک ہی جست

www.pdfbooksfree.pk

میں اس کے پاس تھا۔ اس نے وحشت کے عالم میں جبار کو تھپڑ مارا اور پھر ایک اور، پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ۔ جمیلہ نے سکتے کے عالم میں اپنی انگلیوں سے گالوں کو چھوا۔ اس کی پھیلی پتلیاں جبار پر مرکوز تھیں۔

وہ چلائی، "بند کرو یہ سب۔"

وہ گھور کر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ پھر وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ "چیخنے چلانے سے کچھ نہیں بنے گا، وہ گئی ہے۔ بعد میں ہمیں نکال دے گی لیکن ہمیں اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے پاس کلہاڑی ہے۔ تم ٹارچ کو ٹھیک طرح سے پکڑے رکھو۔"

اس نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ جب وہ کسی پر کلہاڑیاں برسا رہا تھا تو نیچے پانی کا شور اور بھی بڑھ چکا تھا۔ وہ چار ہاتھ ہی مارے تھے کہ کلہاڑی کا پھل دستے سے نکل کر پانی میں جا گرا۔ جبار کے حکم پر جمیلہ پانی میں اسے تلاش کرنے لگی۔

"مجھے نہیں مل رہا۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ "مجھے نہیں مل رہا جبار!"

اب جبار خود بھی مختلف جگہ اسے تلاش کرنے لگا۔ وہ سرد پانی کو بھول چکا تھا، پانی میں کسی گدھے کی طرح ہاتھ اور پاؤں کے بل جھک کر فرش ٹٹول رہا تھا۔

"چلو تم بھی جھکو۔" وہ اب غضب ناک تھا۔ "مجھے کوئی پروا نہیں کہ پانی کتنا سرد ہے۔ زندگی گزرنے سے ٹھنڈ لگنے کا ڈر ہے۔ زندہ رہنا چاہتی ہو تو اسے تلاش کرو۔"

بڑبڑاتی ہوئی جمیلہ بھی اس کے ساتھ پانی میں تھی۔ ہاتھوں سے پانی میں ٹٹولنے لگی۔ دونوں سر تک بھیگ چکے تھے۔ بالآخر جمیلہ کی ٹھنڈ سے سن انگلیوں نے کلہاڑی کا پھل تلاش کر لیا۔ جبار نے جھپٹ کر پھل لیا۔ اب وہ سیڑھیوں پر تھا۔ اس نے رومال میں پھل کو سرا لپیٹا اور لکڑی کے دستے میں مخصوص تیز قوت سے تابوت پر وار شروع کر دیے۔ حتیٰ کہ سانس پھول گئی۔ پسینے میں شرابور اور تھکن سے چور ہو گیا۔ جب ہاتھ روک کر دیکھا تو تابوت پر ایک نشان بھی نہ تھا۔

"یہ قیمتی اور مضبوط لکڑی ہے۔" اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ "قیمتی ہے!"

وہ دونوں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ جمیلہ کا گیلا لباس اس کے جسم اور منتشر بال اس کے گالوں سے چپکے تھے۔ جبار کا جسم اور چہرہ گندا ہو رہا تھا، مگر آنکھوں میں اضطراب چمک رہی تھی۔ پھر اچانک وہ قہقہے لگانے لگا۔ وہ ہنستا رہا حتیٰ کہ اس کی ہنسی کسی پاگل کی چیخوں میں تبدیل ہو گئی۔ ایسے لگتا جیسے وہ ہنستا ہنستا نیچے لڑھک جائے گا۔ جب وہ خاموش ہوا تو بولا "ابا۔" وہ ابھی تک ہنس رہا تھا۔ "ابا، ابا!"

> کفن میں لپٹی نعش کے سامنے آتے ہی کافور کی مردہ بو ان کے نتھنوں میں سرایت کر گئی۔

"کیا ہوا؟" جمیلہ چیخی۔

"ابا کا تابوت، میں تو بھول ہی گیا۔ وہ دیکھو وہ رہا!" وہ اسی وحشیانہ ہنسی کے ساتھ پانی سے ہوتا ہوا اپنے باپ کی قبر کی طرف گیا۔ "تم بھی آ جاؤ۔" وہ چیخا۔ "دونوں مل کر کھولتے ہیں۔"

"مگر کیوں؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟"

وہ ہنس کر بولا "نہیں۔ لیکن تم فون بھول گئیں۔ چلو ادھر آؤ! تابوت میں ٹیلی فون ہے۔"

دونوں پاگلوں کی طرح کلہاڑی سے تابوت کی چولیں ادھیڑتے رہے۔ آخر گھنٹوں کی مشقت کے بعد اسے کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ کفن میں لپٹی نعش کے سامنے آتے ہی کافور کی مردہ بو ان کے نتھنوں میں سرایت کر گئی۔ مردہ جسم کی بو اس پر مستزاد تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

حمید کی آنکھیں بند تھیں۔ "دیکھا؟" وہ فاتحانہ انداز سے چیخا۔

"میں نے کیا کہا تھا۔ یہ ہیں تمہارے پاگل بزرگ! میرا باپ زندگی میں مجھ سے نفرت کرتا رہا مگر اب وہی مجھے موت سے نجات دلائے گا۔"

اس نے چونگا اٹھا لیا۔ "کوئی پاگل ہی اپنی قبر میں فون رکھ سکتا تھا۔ مگر تم نے اعلان کر دیا ہے۔ پولیس خود ہماری مدد کو پہنچے گی۔ سارا قصبہ تمہاری حماقتوں سے واقف ہے۔" وہ بولا۔

"مگر اتنے طویل عرصے بعد تار میں "

حمید نے اس کی بات کاٹی۔ "گھنٹی تو بج رہی ہے۔"

"ہاں ہے۔"

"ہاں! ہاں! والد!" وہ پرجوش آواز میں چلایا۔

"آپ کا جواب دے رہے ہیں۔ ابا! ابا!" وہ چلایا۔

"ابا جی! کیا آپ میری آواز صاف سن رہے ہیں؟"

"ہاں۔"

"ابا جی میں حمید بول رہا ہوں۔ اس نے اپنے گھر کا پتا بتایا۔ "کیا تمہیں قبر کا علم ہے؟""

"ہاں۔"

"مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ آپ قصبے میں اعلان کرائیں اور پولیس کو بتائیں کہ میں اپنے خاندانی تابوت خانے کے تہ خانے میں بند ہوں۔ کیا سمجھ گئے؟"

"ہاں۔"

"انھیں جلد آنے کا کہیں۔ ہم خاصی دیر سے اندر بند ہیں۔ ویسے بھی ہم صرف چند گھنٹے ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ تہ خانے میں پانی بڑھتا جا رہا ہے، جلدی کرنا۔"

"اچھا۔"

حمید نے ایک مرتبہ اسے پھر سمجھایا۔ "دیر نہ کرنا۔"

"اچھا۔"

اور ٹیلی فون بند ہو گیا۔

کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس نے چونگا اپنے باپ کی نعش کے پاس رکھ دیا۔

وہ حمید کو سمجھا رہا تھا۔ "بس ابھی پولیس پہنچ جائے گی۔ اتنی دیر تک ٹارچ کی روشنی بھی ختم نہ ہو گی۔ یہ بہترین ٹارچ ہے۔ اب خود پر قابو پائے رکھو۔ اس کے بعد دولت کی ریل پیل ہو گی جہاں میں تمہاری ہر فرمائش پوری کروں گا۔ ساری عمر عیش و عشرت سے بسر ہو گی۔ بس تھوڑی دیر کے لیے صبر کرو۔"

* * *

اونچے قصبے کے پرانے مکان میں بیٹی نے بڑی آہستگی سے چونگا ٹیلی فون پر رکھ دیا اور تھکی تھکی آواز میں کہنے لگی۔ "یہ کیا ہوا تھا۔ ابھی تک اسے مرنے اور دفن ہونے کے بعد والی زندگی کی عادت نہیں پڑی۔ وہ مجھے کسی لیے مخاطب کر رہا تھا۔ اس نے مجھے کیا سمجھا۔ اب بھلا میں یہ ظلم کیسے کروں کہ اسے بتاؤں تمہارے گھر اور تمہاری بیوی مر چکے۔ اس لیے تمہارے بچانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے یہ امید دلا دی کہ ابا اس کی مدد کو پہنچ رہے ہیں۔ اس سے ان دونوں کا دل بہلا رہے گا۔ پھر جب کئی برسوں تک وہ دونوں نعش ہو جائیں گے تو میں ان سے گفتگو کروں گی۔ اب تو وہ اتنی افراتفری میں ہے کہ ڈھنگ سے بات بھی نہ ہو سکی۔"

خالہ ارجمند بے نور آنکھوں سے بیٹی کو گھور رہی تھی۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور دلدل پر گھٹاؤں جیسا برس رہا تھا۔ بیٹی دھیمے سروں میں گنگنانے لگی:

"میرے مولا مدینے بلا لو مجھے۔"

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

نیکی اور اخلاق کے مرقع

پانچ عظیم پاکستانی

ان عام پاکستانیوں کا تذکرہ جاں فزا
جن کے دم قدم سے خیر و بھلائی کا بول بالا ہوا

حبیب اشرف صبوحی

پاکستانیات

کہا جاتا ہے انسان کو دو مواقع پر آزمانا چاہیے جب وہ اقتدار میں ہو یا اس کے پاس دولت آ جائے۔ دیکھنا چاہیے کہ تب اس کا رویہ ماتحتوں، غریب رشتے داروں اور دوستوں کے ساتھ کیسا رہتا ہے۔ وہ اگر اعلیٰ عہدیدار ہے تو انصاف کے تقاضے پورے کر رہا ہے یا نہیں کیونکہ دولت اور عہدہ تو آنی جانی چیزیں ہیں۔ صرف انسان کا اخلاق اور نیکی یاد رہ جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں پانچ کردار میری زندگی میں آئے جنھیں ضبطِ تحریر میں لا رہا ہوں۔

شریف النفس انسپکٹر

میں ایک ادارے میں بطور منیجر کام کر رہا تھا اور میری تعیناتی شیخوپورہ میں تھی۔ فاروق آباد، ننکانہ صاحب، شاہکوٹ وغیرہ میں

www.pdfbooksfree.pk

ہمارے دفاتر تھے اور ان کی نگرانی بھی میرے ذمے تھی۔

ایک دفعہ مجھے اطلاع ملی کہ شاہ کوٹ کے دفتر میں رات کو ایک ڈاکو آیا۔ محلے کو یرغمال بنا کر ان سے نقدی و موٹر سائیکل چھینی اور فرار ہوگیا۔ واردات کی رپورٹ شاہ کوٹ تھانے میں کرادی گئی۔ کچھ دنوں بعد پتا چلا کہ مجرم موٹر سائیکل سمیت گرفتار ہوچکا اور پولیس کی تحویل میں ہے۔

پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انسپکٹر سے ملاقات کے بعد ہی دفتر کی موٹر سائیکل مل سکے گی۔ چنانچہ ایک روز میں اپنے ماتحت کے ساتھ شاہ کوٹ تھانے پہنچا۔ پہلے عملے سے بات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ موٹر سائیکل صرف انسپکٹر کی اجازت سے ملے گی۔ پتا چلا کہ وہ آرام کر رہے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹا ان کا انتظار کیا۔ جب وہ نہیں آئے تو ہمت کرکے ان کے کمرے تک گیا اور دستک دی۔

میرا خیال یہی تھا کہ میرا استقبال مغلظات سے ہوگا جس کے لیے میں ذہنی طور پر تیار تھا، لیکن جب انسپکٹر نے مجھے اندر آنے کی اجازت دی تو مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میں نے اخلاقاً معذرت کی کہ ان کی نیند اور آرام میں خلل ڈال دیا۔ انھوں نے بڑے شائستہ طریقے سے بتایا "یہ میرا سونے کا وقت نہیں، آپ نے اچھا کیا کہ مجھے اٹھا دیا۔ دیر تک سونے کی وجہ یہ تھی کہ میں ساری رات گشت پر تھا۔ اس لیے نیند پوری نہ ہوسکی۔ دوسرے میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

میں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ آپ کے عملے نے ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے مجرم کو گرفتار کرلیا ہے۔ یہ آپ کی احسن ذمے داری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اب آپ یہ مہربانی کریں کہ ہماری موٹر سائیکل واپس کروا دیں۔

انھوں نے اس سلسلے میں کچھ تحریریں وغیرہ لکھوائیں اور بتایا کہ کل ان شاء اللہ آپ کو موٹر سائیکل مل جائے گی۔ اس کے بعد ملازم کو چائے لانے کا کہا۔ جب چائے آگئی تو انھوں نے الماری میں سے مٹھائی کا ڈبا کھول کر رکھ دیا۔ میں نے معذرت کی اور بتایا کہ میں شوگر کا مریض ہوں، مٹھائی نہیں کھا سکتا۔ یہ سن کر انھوں نے اپنے بستر کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی میز نکالی جس پر ایک پیزا رکھا تھا۔ کہنے لگے "اس سے تو انکار نہیں ہوگا؟"

میں نے کہا "انسپکٹر صاحب! میں حیران ہو رہا ہوں، کہیں خواب میں؟! میری آنکھیں اور کان گونگوں کی کیفیت میں ہیں۔ ہمارے معاشرے میں تھانے اور تھانیدار کا جو تصور ہے، آپ اس سے ہٹ کر نظر آتے ہیں۔ کاش ہمارے ملک کی ساری پولیس آپ جیسی شائستہ اور فرض شناس ہوجائے تو تمام جرائم قریب ختم ہوجائیں گے۔"

وہ کہنے لگے "اچھے اور برے انسان ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اس فانی دنیا کی حقیقت سمجھ لے تو برائی کا خیال اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے اور ہمیں اگلے جہان میں اپنے ہر قول و فعل کا جواب دینا ہے۔"

انسپکٹر کی باتیں اتنی دل نشیں تھیں کہ میں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جب میں نے ان سے نام پوچھا تو انھوں نے جو نام بتایا اس کے آخر میں "عاصی" (یعنی گناہ گار) آتا تھا۔ میں نے پوچھا کیا آپ شعر و شاعری کرتے ہیں کہ یہ تخلص رکھا ہے؟

کہنے لگے "میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنی طبیعت میں عاجزی اور انکسار پیدا کروں۔ اسی وجہ سے نام کے ساتھ "عاصی" کا اضافہ کرڈالا۔"

www.pdfbooksfree.pk

بعد میں جب محکمے سے انسپکٹر کے متعلق پوچھا تو کسی نے بتایا کہ وہ انتہائی نیک دل، خدا ترس اور انصاف کے تقاضے پورے کرنے والا افسر ہے۔ بدمعاش، چوروں اور اخلاقی مجرموں کے لیے سخت گیر ہے۔ اپنے عملے کا بہت خیال کرتا اور ان سے عزت سے پیش آتا ہے۔ تمام عملہ اس سے بہت خوش ہے۔ میں اس انسپکٹر کی شخصیت اور کردار کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

ایمان دار چیف انجینئر

چند سال قبل بجلی کے محکمے کے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور بتایا "میٹر ریڈر نے یہ پیغام بھجوایا ہے کہ آپ سب لوگ ایک ہزار روپے مہینا مجھے دیا کریں تو آپ کو بجلی کا بل آدھا آیا کرے گا۔" میں نے ان لوگوں سے معذرت کی اور کہا کہ میں آپ کی اس غیر قانونی حرکت میں شریک نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے ایک دو دفعہ مزید کہلوایا لیکن میں نے ہر بار انکار کر دیا۔ اس پر مجھے میٹر ریڈر کی طرف سے پیغام آیا کہ آپ کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میں نے کہلوایا کہ میں نقصان اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔

کچھ عرصہ بعد گرمیوں کی چھٹیوں میں بچوں کے ساتھ دو ماہ کے لیے کراچی چلا گیا۔ واپس آیا تو ایک روز محکمہ بجلی کا آدمی آیا اور کہنے لگا "آپ کا میٹر بہت آہستہ چل رہا ہے اور دو ماہ سے آپ کا بل کم آ رہا ہے۔"

میں نے اسے بتایا کہ ہم لوگ کراچی گئے ہوئے تھے۔ آپ محلے والوں سے پوچھ لیں۔ دفتر والوں سے بھی تصدیق کروا دیتا ہوں کہ میں لاہور نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ ہماری معائنہ ٹیم نے چھاپہ مارا ہے اور آپ کے میٹر کی سیل ٹوٹی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ بجلی چوری کرتے ہیں۔ وہ یہ پیغام دے کر چلا گیا۔

دوسرے روز محکمے کی طرف سے ایک خط آیا کہ ہماری معائنہ ٹیم نے آپ کے گھر چھاپا مارا تھا۔ آپ کے میٹر کی سیل ٹوٹی ہوئی پائی گئی۔ لہٰذا آپ کو ۱۸۰۰۰ روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ یہ نوٹس دیکھ کر میں بہت تلملایا۔ محکمہ کے ایس۔ ڈی۔ او سے ملا اور ساری صورت حال سمجھائی لیکن اس نے بے بسی ظاہر کی اور کہا کہ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ کو یہ رقم بھرنی پڑے گی۔ میں ایکسین سے ملا تو انھوں نے بھی ہاتھ اٹھا دیے۔

آخر میں چیف انجینئر کے پاس چلا گیا۔ انھیں گزشتہ پانچ سال کے بجلی کے بل دکھائے اور بتایا کہ میرا خاندان صرف تین افراد پر مشتمل ہے۔ میرے گھر دو میٹر لگے ہوئے ہیں۔ ہم بہت محتاط طریقے سے بجلی استعمال کرتے ہیں۔ اب ہم پر میٹر کی سیل توڑنے کا الزام لگا کر ۱۸ ہزار روپے جرمانہ کر دیا گیا تو سراسر ناانصافی ہے۔

> آپ بھی اس پریشانی کی تکلیف اٹھائیے۔ آپ میرے جیسے کئی شریف آدمیوں کو تنگ کرتے رہے ہیں، یہ آپ کی سزا ہے۔

انھوں نے تمام باتیں تفصیل سے سنیں۔ اس کے بعد متعلقہ ڈیپارٹمنٹ کے تمام عملے کو بلوایا اور انھیں کہا "میں نے ساری بات سن لی۔ ان پر ۱۸ ہزار کا جرمانہ سازش کے تحت ڈالا گیا ہے۔ یہ جرمانہ آپ لوگ دیں گے، یہ صاحب نہیں۔" پھر خاص طور پر میٹر ریڈر سے کہا کہ آدھا جرمانہ آپ دیں اور باقی آدھا جرمانہ عملہ مل کر دے۔ یہ فیصلہ سن کر وہ لوگ بہت پریشان ہوئے۔ جب ہم باہر نکلے تو وہ مجھ سے معافیاں مانگنے لگے۔

میں نے کہا کہ یہ فیصلہ آپ کے افسر نے کیا ہے۔ میں جس طرح پریشان رہا ہوں، آپ بھی اس پریشانی کی تکلیف اٹھائیے۔ آپ میرے جیسے کئی شریف آدمیوں کو

www.pdfbooksfree.pk

تنگ کرتے ہوں گے۔ آپ کی سزا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ان کی یونین والے آ گئے اور منت سماجت کرنے لگے کہ آپ چیف انجینئر سے کہہ کر مسئلہ ختم کروا دیجیے۔ وہ آپ کی سفارش ضرور مانیں گے۔ آخر میں چیف انجینئر سے پھر ملا اور کہا کہ وہ اپنی غلطی مان گئے ہیں، اب ان پر نظرِ کرم کیجیے۔

انھوں نے متعلقہ لوگوں سے تحریر لکھوائی کہ آئندہ ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ہم اپنا کام ایمانداری اور محنت سے کریں گے۔ تب انھوں نے جرمانہ معاف کر دیا۔ چیف انجینئر کا نام رانا محمد اسماعیل تھا۔ ایسے نیک لوگوں کا وجود صارفین کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ اس شخصیت کا میں احسان مند ہوں اور ان کی نیکی کبھی نہیں بھول سکتا۔

نمود سے بے نیاز پیر

میں اپنے دفتری کام کے سلسلے میں ایبٹ آباد مقیم تھا۔ میرے ایک ساتھی جو پیروں اور فقیروں کو ماننے والے تھے، ایک روز مجھ سے کہنے لگے "ہری پور میں ایک پیر صاحب کی نیکی و پارسائی کے واقعات زبان زدِ عام ہیں۔ ان کے پاس پاکستان کے صدر غلام اسحاق خان بھی اکثر آتے تھے۔ ان سے ملا جائے۔

چنانچہ ایک روز راولپنڈی جاتے ہوئے راستے میں ہم نے ان سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ لوگوں سے پوچھتے ہوئے ان کے پیر خانے تک پہنچ گئے۔ بہت بڑے احاطے میں پیر خانہ تھا۔ جب ہم گاڑی سے اترے تو ان کا ایک ملازم بھاگا ہوا آیا اور کہا کہ آپ کس سے ملنا ہے اور کہاں سے آئے ہیں؟ ہم نے بتایا، ایبٹ آباد سے آئے ہیں اور پیر صاحب سے ملنا ہے۔ اس نے کہا کہ پیر صاحب کا حکم ہے کہ جو کوئی بھی آئے، پہلے اسے کھانا وغیرہ کھلاؤ اور اس کے بعد مجھ سے ملواؤ۔

ملازم نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا۔ تھوڑی دیر میں پانی وغیرہ لے کر آیا اور کہا کہ آپ لوگ منہ ہاتھ دھو لیں، میں کھانا لے کر آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد کچھ لوگ اور آ گئے۔ انھیں بھی ہمارے ساتھ بٹھایا گیا۔ دسترخوان بچھا تو اس پر گوشت اور سبزی کا سالن چن دیا گیا۔ دونوں سالن تازہ پکے ہوئے تھے۔ جلد گرما گرم روٹیاں بھی آ گئیں۔ کھانا بڑا ذائقے دار تھا۔ کھانے کے دوران کچھ لوگ اور آ گئے۔ وہ بھی شاملِ طعام ہوئے۔ کھانے کے بعد حلوہ پیش کیا گیا اور آخر میں سبز چائے۔

جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو پیر صاحب کے ملازم نے کہا کہ اب نماز عصر کا وقت ہو چکا، آپ سب لوگ مسجد پہنچیں۔ پیر صاحب وہیں آئیں گے۔ اسی احاطے میں ایک خوبصورت مسجد واقع تھی۔ ہم لوگ وہاں پہنچے۔ پیر صاحب نے ہمارے ساتھ نماز ادا کی، پھر سب سے فرداً فرداً مصافحہ کیا۔

نماز کے بعد سب لوگ پیر صاحب سے ملنے ان کے کمرے میں گئے۔ کمرا انتہائی سادہ تھا۔ جب سب لوگ آ گئے تو پیر صاحب نے مختصر تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ سب سے بڑی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ عزت اور ذلت وہی دیتا ہے۔ اسی کی ذات سب کی مشکل کشائی کرتی ہے۔

اس کے بعد انھوں نے اجتماعی دعا مانگی جو بڑی رقت آمیز اور دل نشیں تھی۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اپنے مسائل مختصر ترین الفاظ میں بتائیے۔ وہ فرداً فرداً سب کو پابندیٔ نماز کی تلقین کرتے اور اللہ کا کلام بتاتے کہ یہ پڑھیے۔ کسی کو کوئی مشورہ دینا ہوتا تو وہ بھی دیتے۔

مجھے سب سے زیادہ اس بات نے متاثر کیا کہ ان

www.pdfbooksfree.pk

کے سامنے نہ تو کوئی صندوقچی رکھی ہوئی تھی کہ نیاز یا نذرانہ اس میں ڈالا جائے اور نہ وہ کسی سے کوئی رقم لیتے تھے۔ بلکہ واضح الفاظ میں جگہ جگہ لکھا تھا: "یہاں نذر اور نیاز دینے کی کوشش نہ کریں۔" میں نے زندگی میں پہلا ایسا مزار دیکھا جو ان تمام چیزوں سے مستثنیٰ تھا۔ ورنہ بیشتر مزاروں کا یہ اصول ہوتا ہے کہ آؤ گے تو کیا لے کر جاؤ گے تو کیا دے کر جاؤ۔ میں یہ کردار بھی نہیں بھول سکتا۔

غریب دوست صنعت کار

کچھ عرصہ قبل اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ لاہور کے ایک پسماندہ علاقے بوالی باغ میں ایک صنعت کار نے واٹر منرل پلانٹ ایک کروڑ روپے کی لاگت سے لگوایا ہے جس کا مقصد لوگوں کو صاف شفاف پانی مہیا کرنا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ لوگ ان تمام بیماریوں سے بچ سکیں جو صاف پانی کے نہ ملنے کی وجہ سے پھیلتی ہیں۔ یہ پانی اہل علاقے کو مفت ملتا ہے۔

خبر میں یہ بھی لکھا تھا کہ لوگوں کی سہولت کے لیے کین بھی بالکل مفت مہیا کیے گئے ہیں تاکہ پانی لے جانے میں آسانی ہو۔ اس صنعت کار نے اپنا نام پوشیدہ رکھا۔ بجلی جانے کی صورت میں دو عدد بڑے جنریٹر بھی لگائے گئے تاکہ آنے والوں کو پانی لینے میں دشواری نہ ہو۔

خبر میں یہ بھی بتایا گیا کہ صنعت کار نے پہلے وہاں کے اہل ثروت لوگوں سے مدد مانگی لیکن جب کسی نے تعاون نہ کیا اور کوئی دلچسپی نہ لی تو انھوں نے تنہا ہی اس کام کا بیڑا اٹھا لیا۔ پلانٹ جدید ترین مشینری سے مزین ہے۔

پلانٹ پر جو عملہ دن رات اس کام میں مصروف ہے، وہ بھی خدمت خلق کے جذبے سے عوام الناس کی خدمت کر رہا ہے۔ میرے ایک دوست اس محلے میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ پلانٹ ہمارے علاقے کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ہم اس صنعت کار کا احسان کبھی نہیں بھول سکتے۔

اتفاق سے کچھ عرصہ قبل اس علاقے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ دیکھا کہ پانی لینے والوں کی پرسکون قطاریں لگی ہیں اور لوگ بڑے اطمینان سے پانی بھر رہے ہیں۔ اس صنعت کار سے بھی ملاقات ہوئی جن کا نام محمود رمضان بٹ ہے۔ وہ بہت مخیر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ لاہور میں دو اور جگہوں پر ایسے پلانٹ لگا رہے ہیں۔ ایک جوڑے پل پر اور دوسرا [illegible] کی بستی رحمان آباد میں۔

جوڑے پل پر پلانٹ کے لیے ۳۲ لاکھ روپے کی زمین خریدی جا چکی اور وہاں بجلی کے لیے بندوبست ہو رہا ہے۔ رحمان آباد میں چند ہفتوں تک کام شروع ہو جائے گا۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں کسی نیک کام کا ارادہ کروں تو اللہ تعالیٰ میری مدد کرتا اور مجھے غیبی امداد ملتی ہے۔

میں اس شخصیت سے بہت متاثر ہوا کہ ان کا اوڑھنا بچھونا "خدمت خلق" ہے۔

کراچی کا بے نام مخیر

چند سال قبل میں نے ایک خبر پڑھی تھی کہ کراچی میں ایک شخص نے اپنے دو بنگلے جو ڈیفنس میں واقع ہیں اور جن کی مالیت کئی کروڑ روپے ہے، ایدھی ٹرسٹ کو تحفتاً دے دیے اور کہا ہے کہ اس کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔ بعد میں بنگلوں کی تصاویر اخبارات میں آئیں اور ان کی تفصیل بھی۔ ان بنگلوں میں جدید ترین آرائش کی گئی ہے۔ اس کے فرش ٹیک کی لکڑی کے ہیں اور تمام درآمدی سامان لگا ہوا ہے۔

حکم ہے کہ اللہ کے نام پر وہ چیز خیرات کرو جو تمھیں سب سے زیادہ عزیز ہو۔ عظیم اور یادگار ہیں ایسے لوگ جو "خدمت خلق" کا جذبہ رکھتے ہیں۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

دورِ جدید کا انوکھا دھندا

تہمت لگا، پیسا کما

ایک بیروزگار اپنا ضمیر مار کر عجب انداز میں روکڑا کمانے لگا

کنہیا لال کپور

ہمارا خیال ہے آپ ہم سے غائبانہ طور پر متعارف ہوں گے۔ اگر نہیں تو پھر آپ اس شہر میں نہیں رہتے یا آپ کی واقفیت کا دائرہ ضرورت سے زیادہ محدود ہوگا۔ دراصل ہم بھی کوئی معمولی انسان نہیں، ہفت وار "تہمت" کے ایڈیٹر ہیں۔

ہم نے یہ اخبار کیوں نکالا؟ یہ مت پوچھیے۔ نہایت دردبھری داستان ہے۔ بی اے میں چار بار فیل ہونے کے بعد جب ظالم سماج نے ہمیں چپراسی تک کی نوکری دینے سے انکار کیا، تو تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ہم نے ہفت وار "تہمت" کا ڈیکلریشن حاصل کر لیا۔ پچھلے تین سال سے یہ اخبار نکال رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ بڑے آرام سے ہیں۔ اب سوچتے ہیں کہ شروع سے یہ دھندا اختیار کیا ہوتا، تو اب تک ایک ڈی لکس امریکن کار کے مالک ہوتے۔ خیر اب گھوڑا گاڑی ہی غنیمت ہے۔ ان شاء اللہ کار اگلے سال خرید لی جائے گی۔

ہمارے اخبار میں صرف تہمتیں چھپتی ہیں۔ تہمت میں یہ خوبی ہے کہ کسی بھی شخص پر لگایا جا سکتا ہے۔ آخر ذات خدا کے علاوہ کون عیوب سے مبرا ہے؟ بڑے سے بڑے درویش بھگت کو ناکارہ بھگت ثابت کیا جا سکتا ہے۔ وہ صاحب جنھوں نے یتیم خانہ کھول رکھا ہے، ان کے متعلق لکھا جا سکتا ہے کہ موصوف خود یتیموں کی کمائی پر پل رہے ہیں۔

امید ہے اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم آئے دن کس لیے سنسنی خیز انکشافات کرتے رہتے ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ ہم محض سنسنی پھیلاتے ہیں، تو یقیناً آپ حق بجانب نہیں۔ اسی طرح اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارا مقصد لوگوں کو بے نقاب کرنا ہے، تو اس ضمن میں عرض

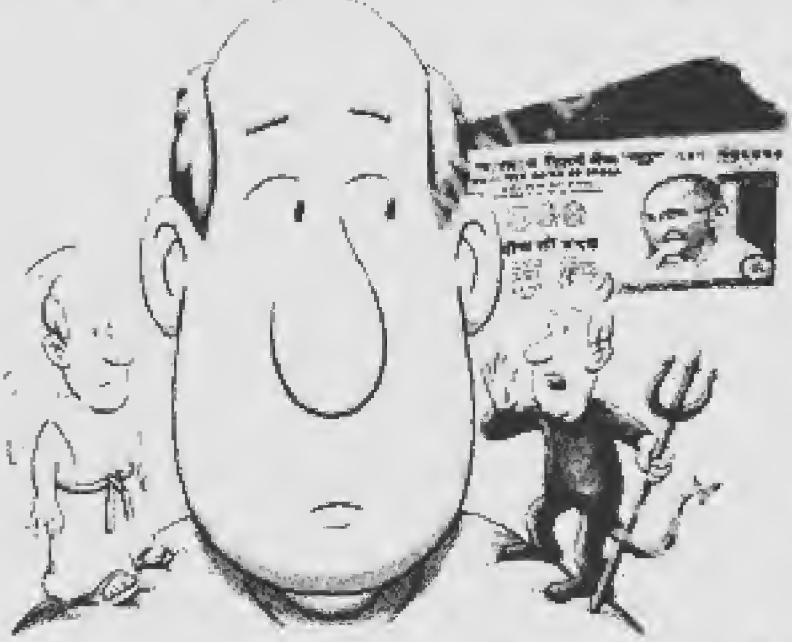

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ ہم واعظ نہیں شدہ ہیں۔ ہم تو فقط ایک کاروباری آدمی ہیں اور ہر سمجھدار بیوپاری کی طرح زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانا ہمارا نصب العین ہے۔

ہم روپیہ کس طرح حاصل کرتے ہیں؟ یہ بھی سن لیجیے۔ اس بڑے شہر میں جہاں ہم اور آپ رہتے ہیں، سیکڑوں اشخاص ایسے بھی ہیں جن کے اعصاب پر اسکینڈل کا خوف سوار رہتا ہے۔ جنھیں ہر وقت پولیس یا خفیہ پولیس کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ یہی لوگ ہمارے ان داتا ہیں کیونکہ ہم ان کی نفسیات خوب سمجھتے ہیں۔ آپ شاید ہمارا مطلب نہیں سمجھے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

چند مہینے ہوئے ہم نے جلی حروف میں ایک سرخی چھاپی: "شہر کے معزز ترین شخص کی کارستانی۔ انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے جعلی رجسٹر۔" اس سرخی کے تحت ہم نے اپنے خاص نامہ نگار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا (یاد رہے، ہم خود ہی اپنے اخبار کے خاص نامہ نگار، منیجر اور ایڈیٹر بھی ہیں) کہ ہم نے انکشاف کیا کہ ایک رئیس پچھلے پانچ سال سے محکمہ انکم ٹیکس والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ حالانکہ اس کی آمدنی دو لاکھ سے بھی زیادہ ہے لیکن اس نے افسروں کو دھوکا دینے کے لیے جعلی رجسٹر بنا رکھے ہیں۔ سازش میں اس کی بیوی کے علاوہ بیٹا بھی شامل ہے۔ ممکن ہے اس کی بہو کا بھی ہاتھ ہو۔ مزید انکشاف کی توقع ہے۔

جس دن یہ خبر چھپی، خدا جھوٹ نہ بلوائے، ایک رئیس روسا اخبار "تہمت" کے دفتر میں (جو ہمارا غسل خانہ بھی ہے) ہم سے ملاقات کرنے آپہنچے۔ لطف یہ کہ ان میں سے ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ وہ شہر کا معزز ترین شخص تھا۔ قریب قریب ہر ایک نے ملاقات کے سلسلے میں درخواست کی "ہمارا نام اور پتا اخبار میں شائع نہ کریں، نہیں تو غضب ہو جائے گا۔"

اس سے پیشتر کہ ہم اس خدمت کا معاوضہ طلب کرتے، ہر کسی نے بڑی شرافت سے معقول رقم نذر کرتے ہوئے کہا کہ میری عزت آپ کے اخبار "تہمت" کے ہاتھ میں ہے۔

دو ہفتے قبل کا ذکر ہے، ہماری اس سرخی نے قیامت برپا کر دی: "نوجوان بہو کو قتل کرنے کی خطرناک سازش۔" دو کالمی اس چٹ پٹی خبر میں ہم نے ایک فرضی سسر اور ساس کا ذکر کیا جو روپے کے لالچ میں اپنی نوجوان اور خوبصورت بہو کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہم نے لکھا "اطلاع ملی ہے کہ وہ بدبخت جہیز میں موٹر کے بجائے اسکوٹر لانے کی بنا پر ساس اور سسر اس کا قصہ تمام کرنا چاہتے ہیں۔ قارئین تفصیل کا انتظار کریں۔"

یہ خبر پڑھ کر ایک معزز صاحب ہانپتے کانپتے وارد ہوئے۔ گھبراہٹ کا یہ عالم کہ ماتھے سے پسینے چھوٹ رہے تھے، حالانکہ دسمبر کا مہینا تھا۔ لجاجت بھرے انداز میں کہنے لگے "ایڈیٹر صاحب! خدا کے لیے اس خبر کی تفصیل چھاپنے سے احتراز کیجیے، نہیں تو میری آبرو مٹی میں مل جائے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ کبھی اپنی بہو کو تنگ نہیں کروں گا۔ اسے واقعی بیٹی کی طرح رکھوں گا۔ اگر وہ جہیز میں موٹر کے بجائے اسکوٹر لائی ہے تو میں اس پر قناعت کر لوں گا۔"

ہم نے کہا "بجا آپ جو فرماتے ہیں، لیکن آپ کو معلوم ہے، جب اخبار "تہمت" اپنی زبان کھولتا ہے تو اسے خاموش کرانے کے لیے ... آپ ہمارا مطلب سمجھتے ہیں نا ... جی۔"

"جی ہاں! میں آپ کو منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔ فی الحال پچاس ہزار روپے کی حقیر رقم حاضر ہے۔ اگر یہ کافی نہیں تو بتا دیں۔"

www.pdfbooksfree.pk

''اس کتاب کو بچوں سے دور رکھیے، ورنہ وہ بھی شاعر
ہو جائیں گے۔''

آپ شاید یہ پوچھنا چاہیں گے کہ ہمارے قارئین نے اس کتاب کا مزید تفصیلی جائزہ پڑھنے پر کیوں اصرار نہیں کیا؟ تو صاحب، وجہ یہ ہے کہ ہم نے اگلے شمارے میں اس سے کہیں زیادہ دلچسپ کتاب کا ذکر چھیڑ دیا۔ ایک کا عنوان تھا ''چور معشوقوں کی دلچسپ مثالیں۔''

پیشہ ور سے کہا جاتا ہے کہ ''وہ ساری رقم تھی ''فیض نے کہا کہ ہم الحمرا کی کمائی کا استعمال'' کریں گے کہ جب قارئین اور لکھنے والے ساتھ ساتھ خبریں پڑھتے ہیں تو وہ سال اور ماہ کے جھگڑے میں ہیں۔ کاپی میں لکھا ہے کہ فیس ادا کی جائے گی (پی پی ایس) سے ہم نے ایک واقعہ کی فہرست کا جو دعا جاری ہے کہ وہ مرد تھے اور عورتیں ہیں جیسے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہم نے پوچھا یہ دوسرے لوگ کون تھے؟ مشکل سے والی روایتی ہے۔ مولانا ہم نے ایک ایسی تصویر کی نقل حاصل کرتے ہوئے کہا کہ پھر اسے کے لیے انگریزی کی شاعری اب آپ کو تحقیق کی ضرورت نہیں رہے گی اور تعلیم ہم تک پہنچے اور واسطے لوگوں نے ان کے رقاص کی حوصلہ افزائی کی، انھیں کاروبار جاری رکھنے کی اس شرط پر اجازت دی کہ ''تہمت'' کے بھوپال فنڈ میں کم از کم سو روپے چندہ جمع کرائیں۔ ''تہمت بھوپال فنڈ'' ہماری جدت اور ایجاد ہے۔ یہ فنڈ اس ''بھوپال'' کے لیے جمع کیا جا رہا ہے جو کبھی آیا ہے نہ آئے گا۔

تو صاحب! یہ ہے ہمارا دھندا کرنے کا طریقہ! آپ کی دعا ہے ہمارا دفتر بنا رہے کہ یہ دونوں کی شاعریاں حقیقی ہیں۔ قارئین! تسلی رکھیے گا کیوں پڑھنے کا ایسا چسکا پڑ گیا کہ اخبار سے ہی زیادہ ہو جاتے ہیں تو ہم سے کچھ نظر آتے۔ یہ بالکل ایسی ہے جیسے ہونا چاہیے۔ آخر ''تہمت'' سے دو ہی ماہنامے جو انھیں اس پیشے کی برکتیں دے سکتے ہیں ''ایک مسکین پولیس کا تیسرا مواخذہ'' ''دوسرے قانون کی خوابیں بیوی کا پیغام اخبار قانون سے نجات کرنے کا شوق'' وغیرہ وغیرہ۔

ہم چاہتے ہیں آپ سے اس میں یہ سوال پوچھیں سے رہا ہے ہم یہ سب چھاپنے کی اجازت کس طرح دی ہے؟ تو صاحب اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ہم تو معمولی خدا بخشے انھیں ملتان کے رہنے والے ہم نے اس کتاب میں وہ ایک مسلمان کا ترجمہ کر دیا جو ان کے آرام سے گزر رہی ہے۔

دوسری طرف ہم دیکھ جاتے تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ کی قدر سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہمارا دل ان کے علاوہ خدمت گزار ہوتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے ہم دونوں کی ''تہمت'' میں کوئی جگہ تھی اور ہم نے ان میں سے انتظار کیا ہے صاحب کہا کہ نے فیض کی زندہ نے کہا تو خود کرتے رہے۔ زیادہ سے زیادہ کہ آپ کے شعر ہو جائے گا۔

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے، ہم سو کر چلے

اچھا صاحب، تو اجازت دیں، امید ہے آپ یہ تو تسلیم کریں گے کہ بہت اچھا شعر ہے اور اسے چھاپنے کی غرض کا ہمیں ماضی تو دوسروں کو یہ شعر سنانے دیجیے اور خود سکون سے قبر میں آرام کیجیے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ملی شاعر، مفکرِ اسلام اور مصورِ پاکستان ہیں۔ انھوں نے جب شعور کی آنکھ کھولی، عالمِ اسلام تباہ حال تھا۔

اپنے فاضل استاد مولوی سید میر حسن کی فکری راہنمائی میں انھوں نے مسلمانوں کے شاندار ماضی کا مطالعہ کیا اور ملت اسلامیہ کی موجودہ حالتِ زار دیکھ کر گہرا تاثر لیا۔ انھیں مبداءِ فیض سے حسنِ طبع اور شعر گوئی کا وافر حصہ عطا ہوا تھا جسے انھوں نے ملت کی ترجمانی، اتحادِ امت، اسلامی فکر اجاگر کرنے، مغربی فکر اور فرنگی سامراج پر تنقید، مسلمانانِ ہند کو خوابِ غفلت سے جگانے اور انھیں ملی شعور سے آشنا کرنے کے لیے وقف کر دیا۔

علامہ اقبال نے دیکھا کہ [illegible]، ہندوستان، عدن (یمن)، ترکستان، انڈونیشیا، ملایا، الجزائر اور دیگر کئی اسلامی خطوں پر یورپی استعماری اقوام قابض ہو چکی ہیں اور مسلمان اپنی عظمتِ رفتہ کھو چکے۔ اس کا اقبال کو بڑا قلق تھا۔ وہ "ایامِ سلف" سے اپنا دل تڑپاتے تھے اور "تصویرِ درد" میں تمام عالمِ اسلام کا درد ان کے اس شعر میں سمٹ آیا ہے:

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

علامہ نے مسلمانانِ ہند کو اپنے مستقبل کی فکر کرنے، فرقہ آرائی اور تعصب سے بچنے اور "زادِ عمل" میں گامزن ہونے کی تلقین کرتے ہوئے انتباہ کیا:

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

شعرِ اقبال راہنمائے ملت ہے

"بانگِ درا" کے ولولہ انگیز اور سیرت ساز اشعار کا خوبصورت انتخاب

محسن فارانی

www.pdfbooksfree.pk

اقبال کے نزدیک "قوم رسول ہاشمی ﷺ" کی بنیاد عقیدۂ توحید اور دین اسلام ہے۔ چنانچہ وہ وطنیت (نیشنلزم) کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے

علامہ اقبال ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بذریعہ بحری جہاز انگلستان روانہ ہوئے۔ بحیرۂ روم کے اطالوی جزیرے، سسلی (صقلیہ) کے قریب سے گزرے تو وہ بے اختیار وہاں کے اسلامی دور (۸۲۷ء تا ۱۰۹۱ء) کی یاد میں تڑپ اٹھے اور کہنے لگے:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونناب بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
[illegible] ہے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

مغرب کی بے مہار و تخریبی کوششوں پر قوم سے یوں انتباہ کیا:

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زر کم عیار ہو گا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہو گا

علامہ اقبال وطنیت اور قوم پرستی کے شدید مخالف تھے۔ وہ اسے "نئے تراشیدہ تہذیب نو" اور "غارت گر کاشانہ دین نبوی" قرار دیتے۔ ان کے نزدیک وطنیت کا پیرہن مذہب کا کفن ہے، فرماتے ہیں:

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے

"خطاب بہ جوانان اسلام" میں علامہ اقبال "نوجوان مسلم" کو غور و تدبر کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سر دارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارہ
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

انھی دنوں مصطفیٰ کمال پاشا نے ملت اسلامیہ کی وحدت کی علامت عثمانی خلافت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس پر اقبال نے بڑی دردمندی سے کہا:

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

نظم "شمع اور شاعر" میں علامہ نے مسلمانان ہند کے ہندوانہ رسوم اپنانے پر یوں دکھ کا اظہار کیا:

سطوت توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذر برہمن ہو گئیں
وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

اگلے بند میں قوم کو ملت کی اہمیت اور ضرورت کو

www.pdfbooksfree.pk

احساس دلاتے ہیں۔

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

آخری بند میں وہ مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہونے کا منظر یوں دکھاتے ہیں۔

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

توحید اور اس پر کاربند رہنا کلامِ اقبال کا خاص موضوع ہے۔ وہ نظم "مسلم" (جون ۱۹۱۲ء) میں کہتے ہیں۔

ہم نشیں! مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں

علامہ اقبال تصور میں رسالت مآب ﷺ کے حضور پہنچتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ پوچھتے ہیں: "ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے آئے؟" اقبال عرض کرتے ہیں "حضورا ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی

بادشاہی مسجد لاہور کے مجمع میں اقبال نے جب یہ شعر پڑھا تو لوگ چونک اٹھے کہ بھلا وہ کیا شے ہے جو جنت میں بھی نہیں ملتی۔ علامہ نے پھر نہایت دلسوزی سے یہ شعر پڑھا

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

راوی لکھتے ہیں کہ اس شعر پر حاضرین دھاڑیں مار مار کر رونے اور دیواروں سے ٹکریں مارنے لگے کہ انہی دنوں اٹلی نے طرابلس (لیبیا) پر قبضہ کرنے کے لیے وحشیانہ فوجی قوت استعمال کرتے ہوئے ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا تھا۔

علامہ اپنی شہرۂ آفاق نظم، جوابِ شکوہ کے ایک بند میں فرائضِ دین کی پابندی اور اتحادِ ملت کا سبق یوں دیتے ہیں۔

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے، ہاں نیند تمھیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تمھی کہہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے؟
قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

فرقہ بندی اور ذات پات کے افتراق اور تفریق سے نجات پانے کی اس طرح تلقین کرتے ہیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اقبال نہایت دردمندی سے مسلمانوں کو اغیار کے طور طریق اپنانے سے باز رہنے کا احساس دلاتے ہیں۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود!
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

وہ دورِ حاضر کے "سراپا کردار" اخلاق کا "موجودہ" سراپا

گفتار" مسلمانوں سے تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اگلے اشعار میں "ابراہیمی ایمان" رکھنے اور "نورِ توحید" کو دنیا بھر میں پھیلانے کی تاکید کرتے ہوئے فرمانِ الٰہی ان الفاظ میں سناتے ہیں۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں عشقِ محمدؐ سے اجالا کر دے
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

علامہ نے عالمِ اسلام پر مسلط شدہ مغربی نظامِ تعلیم کے مضر اثرات سے نجات پانے پر یوں توجہ دلائی۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم!
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

۱۹۱۲ء ہی میں اقبال نے "فاطمہ بنت عبداللہ" نامی مجاہدہ پر نظم لکھی جو معرکہ طرابلس (لیبیا) میں غازیانِ اسلام کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی تھی۔ اس میں کہتے ہیں۔

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

فردوس میں ایک مکالمہ" میں اقبال جدید مغربی تعلیم کے منفی پہلو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز

۔آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی طائرِ دیں کر گیا پرواز

دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمیں تاز
مذہب سے ہم آہنگیِ افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے، جمعیتِ ملت ہے اگر ساز
باقی نہ رہا زمزمۂ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

"بانگِ درا" کی طویل نظم "خضرِ راہ" میں خضر کی زبانی اقبال نے مروجہ جمہوری نظام پر شدید تنقید کی ہے، ملاحظہ کیجیے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں!
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

جب علامہ نے یہ نظم لکھی، وہ جنگِ عظیم اول (۱۴ـ۱۹۱۸ء) کا زمانہ تھا۔ ترکی جرمنی کا حلیف تھا اور انگریز جاسوس لارنس آف عریبیا نے شریفِ مکہ حسین بن علی ہاشمی اور اس کے بیٹوں عبداللہ، فیصل اور زید کو ترکی کے خلاف غداری پر آمادہ کر لیا جس کے نتیجے میں ترکوں کو حجاز، فلسطین، اردن، شام اور عراق خالی کرنے پڑے اور ان پر برطانیہ اور فرانس نے قبضہ کر لیا۔ البتہ حجاز میں غدارِ ملت حسین ہاشمی کی بادشاہت قائم ہو گئی۔ اس پر اقبال نے "خضرِ راہ" میں کہا۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

www.pdfbooksfree.pk

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

خضر نے اقبال کو "رازِ دوامِ زندگی" بتاتے ہوئے کہا۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
ہے گھڑی محشر کی، تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

خضر "میراثِ خلیل" یعنی بیت المقدس (فلسطین) پر برطانوی صلیبیوں کے قبضے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

ان ناسازگار حالات میں خضر نے مسلمانوں کی نجات کا جو گر بتایا وہ آج بھی اُمت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

سنہری باتیں

☆ اے ایمان والو! تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی۔
☆ بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔
☆ اپنے رب سے گڑگڑا کر چپکے چپکے دعا کرو۔
☆ ہمیشہ انصاف کی بات کرو چاہے تمھارے کسی عزیز کو نقصان نہ پہنچ جائے۔
☆ تم نماز ادا کرو، زکوٰۃ دو اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔
☆ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔
☆ مسلمانو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔

(ماریہ ملک، لاہور)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

"بانگِ درا" کی آخری طویل نظم "طلوعِ اسلام" میں علامہ نے مردِ مسلماں کو تلقین کی ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی
عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

www.pdfbooksfree.pk

ایک بچے کا انوکھا سفر

مجھے سمندر کی تلاش ہے

اس دور کا فسانہ عجب جب انسان کائنات کی وسعتوں میں منتشر ہو چکا

ملک محمد شاہد اقبال

"مجھے سمندر دیکھنا ہے۔ میں اسے دیکھے بغیر گھر واپس نہیں آؤں گا۔" اس نے اپنے آپ سے عہد کیا اور صبح سویرے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ وہ کئی دن سے اس مہم کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ اس نے پوری رات جاگ کر گزاری اور وہ تمام ضروری اشیا اپنے بیگ میں رکھ لیں جن کی طویل سفر میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس کی طبیعت کا ضدی پن والدین کے لیے ہمیشہ پریشانی کا باعث بنا تھا۔ آج بھی ضد اسے سب کچھ چھوڑ کر سمندر دیکھنے گھر سے باہر لے جا رہی تھی۔

صبح پانچ بجے اس نے آہستہ سے اپنا بھاری بیگ کندھے پر اٹھایا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ والدین ابھی سو رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ دونوں سات بجے سے پہلے نہیں جاگیں گے۔ تب تک یقیناً وہ بہت دور جا چکا ہوگا۔

اس کا گھر وسیع میدان پر واقع تھا۔ گھر سے باہر نکل کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ "سمندر کس سمت ہو سکتا ہے؟" اس نے سوچا۔ اسے یاد آیا، کتاب میں پڑھا

www.pdfbooksfree.pk

تھا کہ سورج مغرب میں سمندر کے اندر غروب ہوتا ہے۔ لہٰذا مغرب کی سمت چلنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی بہتر تھا کہ طلوع ہونے کے بعد سورج کی طرف اس کی پشت رہتی۔ یوں وہ سورج کی براہِ راست تمازت سے محفوظ رہتا۔ لڑکے نے فیصلہ کرنے کے انداز میں گہرا سانس لیا اور مغرب کی سمت تیزی سے چلنے لگا۔

اس کی عمر صرف آٹھ سال تھی لیکن آنکھوں میں نوجوان کا عزم صاف جھلکتا۔ اس نے اپنی درسی کتاب میں سمندر کی صرف تصویریں دیکھی تھیں۔ ان کے مطابق سمندر نیلے پانی کا ایسا بڑا ذخیرہ تھا جس کا دوسرا کنارہ نظر نہ آتا۔ اس کے شفاف پانی میں مچھلی اور شارک جیسے دیوہیکل حیوان گھومتے پھرتے۔ اس نے تیرتے آکٹوپس اور رنگ برنگی مچھلیوں کے غولوں کی تصاویر بھی دیکھی تھیں۔ سمندر میں تیرتے لمبے چوڑے بحری جہاز بھی دیکھے جن پر ہزاروں افراد سوار ہوتے۔

> وہ اکثر خواب دیکھتا، ساحل پر کھڑا ہے اور موجیں اس کے پاؤں میں گدگدی کر رہی ہیں۔

وہ سوچتا کہ حدِ نگاہ تک پھیلا پانی، اٹھکیلیاں کرتی موجیں اور ساحل پر بکھری خوبصورت سیپیاں کیسا خوبصورت منظر پیش کرتی ہوں گی۔ وہ اکثر خواب دیکھتا، ساحل پر کھڑا ہے اور موجیں اس کے پاؤں میں گدگدی کر رہی ہیں۔ وہ سوچتا کہ ساحل پر کھڑے ہو کر حدِ نگاہ تک پھیلے سمندر کو دیکھنا کیسا دلکش لگتا ہوگا۔ اس کا ننھا دماغ اتنے زیادہ پانی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اپنے دماغ میں ذخیرہ شدہ سمندر کا تصور لیے وہ پختہ عزم کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

جب قصبے کی حدود سے باہر نکلا تو صبح کا اجالا پھیل چکا تھا لیکن سورج نہیں نکلا تھا۔ قصبے کے باہر اس نے ایک بوڑھے کو دیکھا۔ وہ بیٹھا سڑک کنارے چہرہ آسمان کو تکتا رہتا۔ بوڑھے کو دیکھتے ہی لڑکے کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "شاید یہ مجھے روکنے کی کوشش کرے۔" اس نے سوچا اور قدموں کی رفتار کچھ تیز کر لی لیکن اسی وقت بوڑھے نے بھی اسے دیکھ لیا۔

"اے لڑکے! اتنی صبح کہاں جا رہے ہو؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"سمندر دیکھنے۔" لڑکے نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"سمندر!" بوڑھے نے پوپلا منہ کھولا اور ہنس پڑا۔ "اچھا خیال ہے۔ مگر تمھیں اوپر جانا ہوگا۔" اس نے کپکپاتی انگلی سے دور واقع اونچے پہاڑ کی سمت اشارہ کیا۔

لڑکے نے اوپر دیکھا۔ آسمان پر ستارے غائب ہو چکے تھے اور سورج کی روشنی پھیل رہی تھی۔ لڑکے نے بوڑھے کی بے معنی بات کا جواب دینے کے بجائے دوڑ لگا دی۔ "اس بوڑھے کا دماغ واقعی خراب ہو گیا ہے۔ سمندر پہاڑ پر کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے دوڑتے ہوئے سوچا۔ لیکن وہ پہاڑ مغرب کی سمت ہی واقع تھا لہٰذا اس کا سفر جاری رہا۔

کچھ دور جا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بوڑھا پہاڑ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ "یہ واقعی سنکی ہو گیا ہے۔" لڑکے نے سوچا۔

تیز دوڑنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول گیا اور رفتار کم ہو گئی۔ اس نے رک کر بیگ سے بوتل نکالی اور چند گھونٹ پانی پیا۔ اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اپنے کھانے کو بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ "ابھی سمندر کافی دور ہے، مجھے اپنی غذا احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا ہوگی۔" لڑکے نے سوچا۔

جلد وہ ایک چھوٹی پہاڑی تک پہنچ گیا۔ چوٹی پر

www.pdfbooksfree.pk

کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف دیکھی لیکن کسی بھی سمت سمندر کی علامت نظر نہ آئی۔ اب سورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ لڑکے کو بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پشت پر لدا تھیلا اتارا اور تھوڑا سا کھانا کھایا۔ پہاڑی سے اترنے کے بعد سامنے ایک وسیع چٹیل میدان اور دوسری طرف پہاڑیوں کا ایک اور سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ جب وہ میدان عبور کر کے ان پہاڑیوں کے قریب پہنچا تو سورج ڈھلنے لگا تھا۔

"یقیناً ان پہاڑیوں کے پیچھے سمندر ہو گا جس میں یہ سورج غروب ہوتا ہے۔" اس نے سوچا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے جسم میں توانائی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے پہاڑی سلسلہ عبور کرنے لگا۔ جب وہ آخری پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ سامنے ایک اور وسیع و عریض چٹیل میدان موجود تھا۔ اس کے کنارے دو بلند پہاڑ واقع تھے۔ غروب ہوتے سورج کی سرخ روشنی میں وہ بڑا عظیم الشان منظر دکھائی دے رہا تھا۔

لڑکے نے چلنا جاری رکھا۔ وہ حیران تھا کہ اتنے طویل سفر کے دوران راستے میں نہ کوئی قصبہ آیا تھا اور نہ ہی کسی انسان کی شکل دکھائی دی۔ خوراک کا ذخیرہ تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ اسے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ سمندر اتنی دور کیوں ہے؟ بہرحال وہ چلتا رہا۔ مسلسل چلتا رہا۔ اسے یاد بھی نہیں رہا کہ راستے میں کتنے دن اور رات بیت گئے۔ اس کے ذہن میں صرف سمندر دیکھنے کی تمنا بسی تھی۔ اسے کسی دوسری چیز کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اسے ایک بار بھی اپنے ماں باپ کا خیال نہ آیا جو اس کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔

تھکان کی وجہ سے جب کبھی اسے نیند آتی، وہ خواب میں سمندر میں تیرتی مچھلیاں دیکھتا، خود کو لہروں سے کھیلتا پاتا اور نیلگوں پانی میں تیرتے ہوئے لطف اٹھاتا۔ اسے اردگرد رنگ برنگی مچھلیاں گھومتی نظر آتیں جو اس کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتیں۔

سفر کے دوران وہ یہی سوچتا رہا کہ جب وہ پہلی بار سمندر کو دیکھے گا، تو اس کی دلی کیفیت کیا ہو گی؟ جب کہ سمندر کی لہریں بپھری ہوں گی یا پانی خاموش کھڑا ہو گا؟ کیا ساحل پر اسے اپنے جیسے بچے اور لوگ بھی ملیں گے جو سمندر کو تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچے اور اس کی خوبصورتی دیکھ کر ہمیشہ کے لیے وہیں رہنے پر مجبور ہو گئے؟

ٹانگوں میں چلنے کی سکت ختم ہو رہی تھی لیکن وہ دانت بھینچے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ پانی اور خوراک کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سامان کا تھیلا راستے ہی میں پھینک دیا۔ یوں کاندھوں کا بوجھ کچھ کم ہوا اور وہ مزید چند دن چلنے کے قابل ہو گیا۔ جب وہ پہاڑ کی چوٹی سے کچھ ہی دور تھا تو اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، وہاں دو چاند چمک رہے تھے۔ ان کی روشنی میں وسیع و عریض چٹیل میدان کی سرخ مٹی حد نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب وہ سانس لینے میں دشواری محسوس کرنے لگا۔ اس کے خلائی لباس میں موجود آکسیجن کا ذخیرہ ختم ہونے کو تھا۔

اسی لمحے لڑکے کو جانب مغرب عجیب نظارہ نظر آیا۔ وہاں ایک نیلا تارہ افق پر جھلملا رہا تھا۔ اس نے پہلے بھی اسے کئی بار دیکھا تھا۔ یقیناً وہ رات کو پہاڑ کی اوٹ میں چھپ جاتا ہوگا۔

یہ زمین تھی اور سمندر بھی وہیں واقع تھے۔ جو اسے دور نظر آ رہا تھا لیکن لڑکا کبھی وہاں نہ پہنچ سکا۔ اب مریخ کے کسی انسان کے لیے واپس زمین پر جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ قدرتی آفات کے باعث وہاں سے نوع انسانی ختم ہو چکی تھی۔ اور مریخ پر آباد انسان ایسے ذرائع نہیں رکھتے تھے کہ اپنی جنم بھومی لوٹ جاتے۔

◆◆●

www.pdfbooksfree.pk

سقراط نے کہا تھا کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں سب کو بدل بدل کر بانٹ دی جائیں تو جو لوگ اس وقت خود کو بدنصیب سمجھ رہے ہیں، وہ نئی تقسیم کو مصیبت اور پہلی کو غنیمت سمجھیں گے۔ اسی مضمون پر ایک انگریز ادیب، جوزف ایڈیسن نے مضمون لکھا "The Endeavour of mankind to get rid of their burden"۔ اس سے متاثر ہو کر محمد حسین آزاد نے ایک تمثیلی مضمون لکھا "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔" یہ مضمون اردو ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکا اور ہمیشہ کسی نہ کسی جماعت کے نصاب میں شامل رہا ہے۔ زیر نظر مضمون بھی اسی سلسلے میں نئے انداز اور تحقیق سے لکھا گیا۔

ہم نے اس عالم رنگ و بو میں جس میاں بیوی کو دیکھا، وہ ایک دوسرے سے تنگ ہی نظر آئے۔ بظاہر خوش و خرم نظر آنے والے جوڑے کو دیکھ کر غلط فہمی ہوئی کہ میاں بیوی واقعی ایک دوسرے سے خوش ہیں۔ لیکن جب ذرا قریب ہوئے حقیقت حال دریافت کی تو پتا چلا، اس دنیا میں مصیبت کی کوئی مختصر شکل ہے تو وہ اس کا ساتھی۔

یہ طرفہ تماشا بھی دیکھا کہ ہر کوئی اپنے ساتھی کو تو مصیبت اور دوسرے کے ساتھی کو نعمت سمجھتے ہوئے حسد میں گھلا جاتا ہے۔ وہ تمنائی ہے کہ کاش میں کسی طریقے سے اپنا ساتھی بدل سکتا۔ یورپ میں اسی سوچ کے تحت ایسے کلب قائم ہیں جہاں میاں بیوی ایک دوسرے سے جدا ہو کر جسے پسند کریں، اس کے ساتھ وقت بھی گزارتے

شادی شدہ جوڑے کسی حال میں خوش نہیں رہتے

مغرب سے بے غیرتی اختیار کرنے سے بھی نتیجہ ڈھاک کے تین پات نکلا

خادم حسین مجاہد

www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ اگر ادا کر پائیں، تو اکٹھے وقت بھی گزار سکتے ہیں۔ اس کلب کی رکنیت لیجیے اور فائدہ اٹھائیے۔ طلاق کی ضرورت نہ نئے معاہدہ نکاح کی! چونکہ انسان فطرتاً تغیر پسند ہے اور مرد تو بھی روز ہے نت نئی ساتھی کی خواہش کرنے لگتا ہے، اسی انسانی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر کلب والے نوٹ چھاپتے ہیں۔

شاید انہی مغربی اثرات کے تحت حکومت آزادستان کی پارلیمنٹ کے بعض ارکان نے بل پیش کیا کہ ہر شادی شدہ مرد و عورت کو زندگی میں کم از کم ایک بار اپنی پسند کا نیا ساتھی چننے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ بعض بزرگ اور کنوارے ارکان نے اس بل کی مخالفت کی مگر شادی شدہ مرد اور عورتیں اکثریت میں تھے۔ چونکہ جمہوریت میں دو ہاتھوں کی رائے ایک ہاتھ کی رائے سے بہتر ہوتی ہے، اسی لیے بل پاس ہی نہیں بلکہ نافذ بھی ہو گیا۔

پارلیمنٹ کے اندر اور باہر مذہب پسندوں نے بہت ہنگامہ کیا کہ جب طلاق اور عقد ثانی کی اجازت موجود ہے، تو اس مغربی بے غیرتی کی کیا ضرورت؟ چونکہ وہ اقلیت میں تھے، اس لیے زیادہ شور شرابے کے باوجود چپ ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔

جلد ہی ہر شہر میں بڑے بڑے پنڈال، میدان، ہال، کنونشن سنٹر، سٹیڈیم اور آڈیٹوریم وغیرہ آباد ہو گئے جہاں لوگ اپنے ناپسندیدہ ساتھی کو چھوڑ کر مرضی کا ساتھی چن سکتے تھے۔ اب ہوا یہ کہ کسی مرد نے اپنی بدزبان بیوی کو چھوڑا، تو کسی نے اچھی بھلی کی بیوی کو... کسی نے بدصورت بیوی چھوڑی، تو کسی نے بد اخلاق والی۔ کسی نے مسکین بیوی چھوڑی، تو کسی نے غیبت کرنے والی۔ کسی نے ناکارہ بیوی چھوڑی، تو کسی نے سادہ مزاج والی۔ کسی نے پھوہڑ بیوی کو چھوڑا، تو کسی نے بدمزاج۔ کسی نے سازشی بیوی کو چھوڑا، تو کسی نے چالاک کو۔ کسی نے ان پڑھ بیوی کو خیرباد کہا، تو کسی نے زیادہ پڑھی لکھی کو۔ کسی نے ملازمت پیشہ بیوی چھوڑی، تو کسی نے جھگڑا کرنے والی کو!

اسی طرح کسی عورت نے کنجوس مرد کو چھوڑا، تو کسی نے فضول خرچ کو۔ کسی نے کالے مرد کو چھوڑا، تو کسی نے ٹھگنے کو۔ کسی نے شکی مزاج مرد چھوڑا، تو کسی نے بزدل۔ کسی نے تنگ ضمیر مرد سے چھٹکارا پایا، تو کسی نے نکھٹو سے۔ کسی نے کھٹو شوہر چھوڑا، تو کسی نے دل پھینک! کسی نے ان پڑھ مرد چھوڑا، تو کسی نے غریب! کسی عورت نے نشئی مرد چھوڑا، تو کسی نے جواری! کسی نے عادتاً بے مروت کو چھوڑا، تو کسی نے ظالم کو! غرض ہر کسی نے کسی نہ کسی ناپسندیدہ خصلت یا خامی کے سبب اپنا جیون ساتھی چھوڑ دیا۔

یہ قدم اٹھانے والے اکثر مرد و زن نے بہت خوشی و آزادی محسوس کی۔ حتیٰ کہ اکثریت تو کہیں واپس جانے لگی، مگر قانونی کارندوں نے روک دیا کہ اب جس ساتھی کو منتخب کرنا پڑے گا کہ قانون یہی کہتا ہے۔ اکثریت اپنی آزادی کھونا نہیں چاہتی تھی مگر عام مرد و عورت مشکلات سے مجبور ہو کر نئے ساتھی تلاش کرنے لگے۔

اب ہوا یوں کہ جس مرد نے کالی بیوی چھوڑی تھی اس نے گوری چٹی کا انتخاب کیا، مگر جلد ہی اس کے نخروں سے عاجز آ گیا۔ جس نے بدزبان بیوی چھوڑ کر خوش اخلاق بیوی پسند کی، وہ الٹی بچانے کی ماہر اور سازشی نکلی۔ جس نے بدصورت بیوی چھوڑ کر خوب صورت کا انتخاب کیا، وہ بدکردار نکلی۔ اسے ہر وقت اس کا پہرہ دینا پڑتا۔ جس نے سادہ مزاج بیوی چھوڑی تھی، اس کی نئی بیوی حد سے زیادہ لڑاکا نکلی۔ جس نے پھوہڑ بیوی چھوڑی تھی اس کی نئی بیوی

www.pdfbooksfree.pk

حاکمانہ مزاج والی اور خود سر نکلی۔ جس نے ان پڑھ بیوی چھوڑ کر پڑھی لکھی پسند کی، اس نے چند ہی دن میں بحث و تکرار سے اس کا ناطقہ بند کر دیا۔

جس نے گھریلو بیوی چھوڑ کر ملازمت پیشہ پسند کی، موصوفہ نے اس کی اور گھر والوں کی خدمت کرنے سے انکار کر دیا۔ الٹا اسے اس کی خدمت کرنا پڑتی تھی کہ ناشتہ تک بنا کے دینا پڑتا اور کبھی کبھی تو اس کا سر اور ٹانگیں بھی دبانا پڑتیں۔ جس نے علم دشمن بیوی کو چھوڑ کر مطالعے کی شوقین عورت کا انتخاب کیا، وہ ہر وقت کتابوں اور رسالوں میں گھسی رہتی تھی۔ دودھ اور ہانڈی چولھے پر ابل جاتی۔

اسی طرح جس عورت نے کنجوس مرد کو چھوڑا، اس کا نیا شوہر فضول خرچ نکلا۔ جس نے فضول خرچ کو چھوڑا تھا، اسے کنجوس مل گیا۔ جس نے کالے کو چھوڑ کر گورے کا انتخاب کیا، لڑکیاں اس کا پیچھا ہی نہ چھوڑتی تھیں۔ جس نے ٹھگنے مرد کو چھوڑ کر اونچے لمبے مرد کا انتخاب کیا، وہ اس کے ساتھ چلتی خود کو چھوٹا محسوس کرتی۔ ٹھگنا مرد تو اس سے دب کر رہتا تھا مگر لمبو تو اسے خاطر ہی میں نہ لاتے۔

جس عورت نے شکی مزاج مرد کو چھوڑا تھا، اس کا نیا شوہر حد سے زیادہ لاپروا نکلا۔ جس نے بزدل خاوند کو چھوڑا تھا، اس کا نیا مرد ظالم اور بدتمیز نکلا۔ جس نے سخت گیر مرد کو چھوڑا تھا، اسے بے غیرت مل گیا۔ جس نے نکھٹو شوہر چھوڑ کر کماؤ ڈھونڈا، وہ اتنا مصروف رہتا کہ اس کے پاس بیوی کے لیے وقت ہی نہ تھا۔ جس عورت نے ان پڑھ مرد کی جگہ عالم فاضل مرد چنا، وہ اتنا بڑا دانشور تھا کہ اسے اندرون و بیرون ملک دوروں اور لیکچرز ہی سے فرصت نہ تھی۔

جس عورت نے دل پھینک مرد کو چھوڑا تھا، اس کا نیا شوہر سنگدل نکلا۔ جس نے غریب خاوند چھوڑ کر امیر پسند کیا، وہ اس کی ضروریات تو پوری کرتا مگر اسے ذرا برابر اہمیت دینے کو تیار نہ تھا۔ جس نے نشئی مرد چھوڑا تھا، اس کا نیا مرد جواری نکلا۔ جس نے جواری چھوڑا تھا، اس کا نیا خاوند نشئی نکلا۔ جس نے سادہ مزاج مرد چھوڑا تھا، اسے جو مرد ملا وہ چالاک و بدکردار تھا۔ اگر کسی عورت کا پرانا مرد زن مرید تھا، تو نیا مرد عورت ذات ہی کے خلاف نکلا۔ اگر کسی کا پرانا مرد بے روزگار تھا، تو نیا سسرال میں پڑا رہتا اور خود کوئی کام کرنا گناہ سمجھتا۔

غرض جس نے بھی کسی خامی کی وجہ سے پرانے ساتھی کو چھوڑا تھا، نئے ساتھی میں بھی کوئی نہ کوئی خرابی پائی۔ وہ اکثر حالات میں پرانی سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور ناقابل برداشت تھی۔ اب سب کو اپنے پرانے ساتھیوں کو یاد کرنے لگے کیونکہ اب وہ انہیں نے ساتھیوں سے بہتر لگے۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ نئے جوڑے ایک دوسرے کی شکل سے بھی بیزار ہو گئے۔ ان کے لیے ساتھ ساتھ چند لمحے گزارنا دوبھر ہو گیا۔ دراصل سبھی اپنے پرانے ساتھی کے عادی تھے، چاہے وہ جیسے بھی تھے۔ جو جوڑا اللہ تعالیٰ تخلیق کرے، اکثر اوقات انہیں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔ ہر انسان میں خامیاں ہی نہیں خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان کو تحسین کی نظر سے دیکھا جائے تو خامیاں بھی قابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ بہرحال یہ ہوا ایک دن پھوٹ پڑا۔ مختلف شہروں میں جگہ جگہ ہنگامے اور احتجاجی جلوس شروع ہو گئے۔ سب کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ یہ بے ہودہ بل ختم کر کے سابقہ جوڑوں کو بحال کیا جائے۔ اب وہ لوگ بھی اس کے خلاف ہو گئے جنہوں نے اسے منظور کرایا تھا۔ لہٰذا بل ختم کر کے پرانے رشتے بحال کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ اس پر سب نے کلمہ شکر پڑھا اور خوشی خوشی پرانے ساتھیوں کے لیے گھر روانہ ہو گئے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

رنگ برنگ

نوع بہ نوع تحریروں میں سے انتخاب

ہاتھ رہتا تھا دعا کی طرح سر پہ

(بیگم صفدر شیخ، لاہور)

ماں

اپنے بچوں کی پرورش ایثار، قربانی، محنت اور محبت سے کرتی ہے۔ میری امی جان بھی ایسی ہی ماں تھیں۔ ہوش سنبھالتے ہی انھیں دن رات محنت کرتے دیکھا۔ وہ ایک استاد تھیں، اپنے اسکول کی صدر مدرس اور بعض اسکولوں کی انتظامی ذمے دار بھی رہیں۔ اس طرح انھوں نے دوہری ذمے داریاں ادا کیں۔ والد صاحب کے ساتھ گھر کا معاشی بوجھ بھی بانٹا۔ وہ مخلص استاد تھیں، پڑھائی میں کمزور طالبات پر خصوصی توجہ دیتیں اور دوسری اساتذہ کو بھی اس کی تلقین کرتیں۔

وہ صبح سویرے بیدار ہو کر پہلے نماز فجر ادا کرتیں، تلاوت کلام پاک کرتیں اور پھر ہمارے لیے ناشتا بناتیں۔ گھر کے دیگر کام بھی انجام دیتیں۔ بعض اوقات صبح سویرے کپڑے بھی دھوتیں۔ اس زمانے میں کپڑے ہاتھ سے دھلتے۔ پانی کے لیے ہاتھ سے چلنے والا نل ہوتا۔ گھر کے کام کاج کرنے کے بعد اسکول چلی جاتیں۔ کچھ عرصہ تو ایسا بھی ہوا کہ اسکول دوسرے گاؤں میں ہونے کی وجہ سے انھیں تین میل روزانہ پیدل چلنا پڑتا۔ اسکول سے واپسی پر عموماً کسی عزیز سے ملنے چلی جاتیں یا کوئی اور معاشرتی مصروفیت ہوتی۔

گھر واپس آ کر کھانا پکاتیں اور بچوں کو سنبھالتیں۔ اس کے علاوہ سلائی کڑھائی بھی کرتیں۔ ہمارے بچپن میں انھیں اپنی والدہ سے مدد حاصل رہی۔ لیکن ظاہر ہے، زیادہ تر ذمے داری تو انھی کی تھی۔ ہماری پڑھائی کا خیال رکھنا، تربیت اور گھر کی تمام ذمے داری انھی کے کاندھوں پر تھی کیونکہ والد صاحب تو روزگار کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں رہے۔ ہماری ضروریات بن مانگے پوری کرتیں۔ محبت کا زبانی اظہار کم لیکن عملی مظاہرہ زیادہ تھا۔ بچوں کی تکلیف پر تڑپ اٹھنا تو ہر ماں کا خاصہ ہے۔ لیکن

www.pdfbooksfree.pk

انھوں نے اس سے بڑھ کر ہماری تعلیم و تربیت پر زور دیا۔ بچوں کی پڑھائی میں سستی یا کمزوری سے کبھی مایوس نہ ہوئیں۔ جہاں تک ممکن ہوا، پڑھائی جاری رکھی۔

والدہ کی زندگی میں بڑا صدمہ چھوٹی بہن، بہنوئی اور ان کے چار بچوں کا ریل میں بم پھٹنے سے انتقال ہو جانا تھا۔ اس صدمے نے تو ان کی کمر ہمت پر کاری ضرب لگائی۔ اس حادثے کے کچھ عرصے بعد وہ بیمار ہو گئیں۔ پھر سات سال بعد ہمارے والد کا انتقال ہوا، تو وہ تنہا رہ گئیں۔ بیماری بڑھتی گئی اور وہ کمزور ہوتی گئیں۔ ان کی زندگی کا آخری صدمہ بھی دوسری بہن کا انتقال تھا۔ اس وقت وہ خود بھی بیمار تھیں۔ کمزور صحت کے پیش نظر ڈاکٹروں نے بہن کی وفات کی خبر انھیں نہ ہونے دی۔

وہ اس دن بہت بے چین تھیں اور بار بار بہن کو یاد کرتیں۔ بعد میں انھیں بتایا گیا تو بہت صبر کا مظاہرہ کیا۔ لیکن دل کا دکھ اشعار کی صورت اختیار کر لیا۔ انھیں اپنی بہنوں سے بہت محبت تھی۔ اپنی زندگی کے آخری دو ماہ اسی بہن کے گھر گزارے اور اسی کی بیٹی نے ان کی خدمت کی۔ میں جو اپنے پانچ بچوں کی پیدائش کے مواقع پر ان کی شفقت کا فائدہ اٹھاتی رہی، ان کی خدمت نہ کر سکی۔ اس بات کا بے حد دکھ رہا۔

ایک ہاتھ جو رہتا تھا دعا کی طرح سر پر
سایہ تھا وہ ماں کا گیا، وہ اب اٹھ گیا سر سے

پنجرے سے کھول دیجیے

(محمد طاہر، اسلام آباد)

ہر نوع انسان کی طرح بقیہ کائنات کے اندر ہر ذی روح آزادی پسند ہے۔ ایک تتلی کو چند لمحوں کے لیے پکڑ لیجیے، آزاد ہونے کے لیے وہ بے طرح پھڑپھڑانے لگے گی۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ ہم میں سے بیشتر لوگوں نے محض شوقیہ معصوم پرندوں کو پکڑ کر قفس میں ڈال رکھا ہے جہاں وہ ہم جولیوں سے دور غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

یہ کس قدر فضول اور بے رحمانہ شوق ہے جس نے ہمیں بے حد خودغرض اور سنگ دل بنا کر رکھ دیا۔ اپنے اس فضول شوق کی تکمیل کی خاطر ہم ان معصوم پرندوں کی آزادی کے دشمن بن بیٹھے جنھیں قدرت نے آزاد پیدا کیا اور کھلی فضاؤں میں اڑنے کے لیے بال و پر عنایت فرمائے۔ اپنی قبیح حرکت پر نادم ہونے کے بجائے ہم قدرت کی طرف سے عطا کردہ ان معصوم پرندوں کی آزادی سلب کر کے خوش ہوتے ہیں۔

اگر آپ کو پرندوں کی آوازوں سے پیار ہے، تو کوہساروں اور نخلستانوں کا رخ کریں اور قدرت کی خوبصورتیوں کے مظاہر دیکھنے کے علاوہ حسین اور رنگ برنگے پرندوں کی میٹھی بولیوں سے محظوظ ہوا کیجیے۔ گھروں کے اندر پرندوں کو پنجروں میں بند کر کے ہم نادانستہ فطرت کے ساتھ سرد جنگ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ کیا اس جنگ میں ہم فطرت کو شکست دے سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ لیکن ایک نہ ایک دن قانون قدرت کی گرفت میں ضرور آ سکتے ہیں۔ لہٰذا ایسے تمام لوگ جو نادانستگی میں اس گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں، آج ہی پہلا کام یہ کریں کہ گھروں میں قید پرندوں کے پنجرے کھول دیں تاکہ معصوم اور بے گناہ پرندے اس آزادی سے مستفید ہوں جو قدرت نے ان کی تقدیر میں لکھی ہے۔

آئیے یہ عہد کریں کہ ہم پرندوں سے سچی دوستی کریں گے۔ اس کے لیے گھروں کی چھتوں اور دیواروں پر پرندوں کے لیے دانہ دنکا اور پانی سے بھری پراتیں رکھا کیجیے۔ معصوم پرندے قید کرنے والوں کو پیار سے سمجھائیے

www.pdfbooksfree.pk

اور انھیں اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ مقید پرندوں کو آزاد کر دیں۔ میرا حکومت سے مطالبہ ہے، وہ ایسا قانون بنائے کہ لوگ پرندوں کو پکڑ کر ان کا کاروبار نہ کر سکیں۔ جو اس قانون کی خلاف ورزی کرے، عدالت اسے قرار واقعی سزا دے۔

مسح اور پاؤں دھونے کی حکمتیں
(علامہ محمد ایاس عطاری، ڈی جی خان)

سر اور گردن کے درمیان ''حبل الورید'' یعنی شہ رگ واقع ہے۔ اس کا تعلق ریڑھ کی ہڈی اور حرام مغز اور جسم کے تمام تر جوڑوں سے ہے۔ جب وضو کرنے والا گردن کا مسح کرے، تو ہاتھوں کے ذریعے برقی رو نکل کر شہ رگ میں ذخیرہ ہو جاتی ہے۔ یوں ریڑھ کی ہڈی کے ذریعے ہمارے پورے اعصابی نظام کو توانائی ملتی ہے۔

پاؤں سب سے زیادہ گرد آلود ہوتے ہیں۔ پہلے پہل چھوت پاؤں کی انگلیوں کے درمیانی حصے ہی سے شروع ہوتی ہے۔ وضو میں پاؤں دھونے سے گرد و غبار، جراثیم اور بچے کھچے گندگی کے ذرات پاؤں کی انگلیوں کے درمیان سے نکل جاتے ہیں۔ لہٰذا وضو میں سنت کے مطابق پاؤں دھونے سے نیند کی کمی، دماغی خشکی، گھبراہٹ اور مایوسی (Depression) جیسے پریشان کن امراض دور ہو جاتے ہیں۔

آٹزم...بچوں کی بیماری
([illegible])

آٹزم دماغی نشوونما سے وابستہ بچوں کی بیماری ہے۔ اس میں مبتلا بچے لوگوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتے اور ایک ہی طرح کا رویہ یا حرکت بار بار دہراتے ہیں۔ ان بچوں کو رویے اور خیالات بیان کرنے میں مشکل ہوتی ہے۔ آٹزم ایک بیماری نہیں بلکہ مختلف طبی علامات کا ایک مجموعہ ہے جن میں دماغ و صحت کے مسئلے، توجہ کی کمی اور حرکات میں مشکلات کے مسائل شامل ہیں۔

آٹزم کی علامات ۳ سال کی عمر تک کسی بھی وقت ظاہر ہو سکتی ہیں۔ کچھ بچوں میں ۲ سال تک یہ علامات ظاہر نہیں ہوتیں اور وہ اس عرصہ میں جو کچھ سیکھتے ہیں، بھول جاتے ہیں۔

تحقیق کے مطابق لڑکوں میں یہ بیماری لڑکیوں کے مقابلے میں چار پانچ گنا زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ۳۵۰،۰۰۰ بچے آٹزم کا شکار ہیں اور یہ تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اس بیماری کی خاص علامات یہ ہیں:

☆ بے چین رہنا یا حرکت کرنے کی خواہش نہ کرنا۔
☆ کسی کے چھونے سے الجھن محسوس کرنا۔
☆ ایک ہی حرکت کو بار بار دہرانا جیسے کسی چیز کے گرد گھومنا۔
☆ بہت آہستہ یا بہت اونچا سننا۔
☆ بے مقصد رونا اور ہنسنا۔
☆ ڈر اور خطرے کی سمجھ نہ رکھنا۔

پاکستان ناگزیر تھا
(ہاشم خان، گورنمنٹ ڈگری کالج، بٹ خیلہ)

بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر پاکستان وجود میں نہ آتا، تو بھارتی مسلمانوں کے ساتھ پاکستانی حصے کے مسلمان بھی مل کر مؤثر اقلیت بن جاتے اور یوں بہتر طور پر اپنے مفادات کی حفاظت کرتے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تب بھی ہو، بھارت میں ہندوؤں ہی کی اکثریت ہوتی۔ وہ اپنی مرضی اور منشا کے مطابق حکومت کرتے اور کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے۔

www.pdfbooksfree.pk

بھارت میں مسلمان اب بھی سب سے بڑی اقلیت یعنی آبادی کے 19 فیصد ہیں لیکن ان کا معیارِ زندگی شودروں سے بھی بدتر ہے۔ ان پر ترقی کا ہر دروازہ بند ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کا حصہ ایک فیصد بھی نہیں۔ تعلیم، معیشت، صحت، صنعت، تجارت کسی جگہ ان کو آگے بڑھنے نہیں دیا جاتا۔ اور یہ بات خود بھارتی حکومت کے قائم کردہ سچر کمیشن کی رپورٹ میں درج ہے کہ مسلمان بدترین حالات سے دوچار ہیں۔

ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہمیں پاکستان ملا اور ہم مسلمان یہاں سکون سے اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔

قرآن پاک اور سائنس

(ڈاکٹر ندیم اکرام، راولپنڈی)

سائنس کے موضوعات کو قرآن کی روشنی میں سمجھنا کشادہ ذہن کا متقاضی ہے۔ لیکن یقیناً یہ تحقیق رجوع الی القرآن کی دعوت دیتی ہے۔ بقول اقبال

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
این کتابے نیست چیزے دیگر است
صد جہان تازہ در آیات اوست
عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
بندہ مومن ز آیات خدا است
ہر جہاں اندر بر او چوں قبا است
چوں کہن گردد جہانے در برش
مے دہد قرآن جہانے دیگرش
یک جہانش عصر حاضر را بس است
گیرا گر در سینہ دل معنی رس است

(اگر تو مخلص مسلمان کی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو وہ قرآن کو چھوڑ کر ممکن نہیں۔ کیا میں تجھے اپنے دل کی سچائی بتاؤں؟ قرآن پاک صرف ایک کتاب نہیں بلکہ یہ تو کچھ اور ہی ہے۔ ہزارہا جہان تازہ اس کی آیات میں پوشیدہ ہیں اور اس کی آیات ہزاروں سالوں کے رازوں کو آشکار کرتی ہیں۔ بندہ مومن اللہ کی آیت میں سے ایک ہے اور اس کے اعمال اس کے مطابق ہیں۔ جب بھی مسلمان کسی مسئلے سے دوچار ہوتا ہے تو قرآن اس کے سامنے اس کے حل کے دروازے کھولتا ہے۔ اس میں دی ہوئی راہنمائی انسانیت کے تمام مسائل کا حل ہے۔ اگر تیرے سینے میں دل زندہ ہے تو اس کی راہنمائی کو تھام لے۔)

حمد و ثنا کی فضیلت

(گل رسول، سیدو شریف)

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں حضرت نوح علیہ السلام کی مدح کرتے ہوئے فرمایا ہے "بے شک وہ (نوح) ہمارے شکر گزار بندے تھے۔" بعض مفسرین نے فرمایا ہے، حضرت نوح ہر وقت ہی اللہ کی تسبیح و تحمید بیان کرتے تھے۔ کھاتے پیتے اور لباس پہنتے ہر نعمت اور ہر حالت پر اللہ کا شکر ادا فرماتے۔ حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "بے شک اللہ ایسے شخص کو اپنی رضا و خوشنودی کا پروانہ عطا فرما دیتے ہیں جو ہر کھانے اور پینے پر اللہ کی حمد و ثنا بیان کرے۔"

آپ کا ایک نام شاکر بھی تھا۔ شاکر اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے اعمال سے بندگی اور ہر وقت خدا تبارک وتعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری میں مصروف منہمک رہے۔

www.pdfbooksfree.pk

کرپشن کا خاتمہ بذریعہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی

(غضنفر علی، کراچی)

پاکستان میں کرپشن کا زہر سرکاری اداروں میں سرطان کی طرح سرایت کر چکا۔ کئی عام شہری یا کاروباری حضرات بھی ٹیکسوں کی بچت، غیر قانونی ذرائع یا غیر دستاویزی کاروبار سے جو دولت اکٹھی کرتے ہیں، ان کا حساب بہت مشکل ہو چکا۔ اس ناکامی کا سبب یہ ہے کہ ہم کاروبار اور معیشت کو دستاویزی بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ ان جرائم کی تفتیش اور پھر عدالتوں میں کرپشن کو ثابت کرنا کیس میں ممکن نہیں ہوتا۔

سرکاری اداروں اور نجی کاروبار میں کرپشن اور غیر قانونی معاملات کی روک تھام کے لیے ماضی میں ایف آئی آر اور قومی احتساب بیورو کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان اداروں نے پچھلے کئی عشروں میں تفتیش و جرم کے کھوج پر کام کیا اور ملزمان عدالتوں میں بھیجے گئے۔ لیکن دستاویزی ثبوت کی کمی کی بنا پر زیادہ تر کیسوں میں عدالتیں ملزمان کو سزا نہیں دے سکیں۔ بعض کیسوں میں ملزمان تو شہادتوں پر رہا ہوئے یا الزامات سے بری ہو گئے۔ نظام سے جو شہادتیں عدالتوں میں پیش کی گئیں، وہ دستاویزات کے ساتھ مکمل ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہیں۔

درج بالا حقائق کی روشنی میں ضروری ہے کہ ملک میں آمدن اور خرچ کے طریقہ کار کو مکمل طور پر دستاویزی بنایا جائے تاکہ غیر قانونی کام کی گرفت آسان ہو اور انھیں عدالتوں میں بھی قابل قبول بنایا جا سکے۔ یہ طریقہ کار نافذ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم نیشنل ٹیکنالوجی سے مدد لیں۔ اس کے لیے ہم نادرا کے ریکارڈ سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس میں تمام پاکستانیوں کا ریکارڈ (Record Data Base) موجود ہے۔ اس طریقہ کار پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہو گا کہ تمام پاکستانیوں سے ایک فارم پر کرایا جائے جس میں درج ذیل تفصیلات پوچھی جائیں:

۱۔ تمام منقولہ و غیر منقولہ جائداد کی تفصیل۔

۲۔ ہر قسم کی آمدنی کے ذرائع۔ ۳۔ اخراجات۔ ۴۔ بینک اکاؤنٹس۔ ۵۔ ٹیکس کی ادائیگی، ۶۔ کریڈٹ کارڈ، ۷۔ کلب کی ممبرشپ اگر کسی کی ہے، ۸۔ تعلیمی اخراجات، ۹۔ انشورنس، ۱۰۔ ملکی و غیر ملکی سفر، ۱۱۔ واجبات کی ادائیگی، ۱۲۔ نوکری یا کاروبار کی تفصیلات۔

یہ فارم پر ہونے سے ہر پاکستانی کے اثاثہ جات، آمدنی و اخراجات، نوکری و کاروبار وغیرہ کی تفصیلات نادرا کے ریکارڈ میں شامل ہو جائیں گی۔ پھر کرپشن کے ذریعے حاصل کردہ اثاثہ جات، آمدنی اور اخراجات کو چھپانا ممکن نہ ہو گا بلکہ ملکی معیشت بھی دستاویزی ہو جائے گی۔ اس پروگرام کو موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ تمام سب رجسٹرار تمام اثاثہ جات کو دستاویزی بنائیں۔ انتقال جائداد کا طریقہ کار بھی شفاف، سادہ اور آسان بنایا جائے تاکہ تمام جائداد کی تفصیلات موجود ہوں۔

پھر اگر کوئی شخص قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جائداد بنائے یا اس کے اخراجات آمدن سے زیادہ ہیں تو ایسے شخص پر قانونی گرفت نہ صرف آسان ہو گی بلکہ عدالت سے اسے سزا دلانا بھی سہل ہو گا۔ امید ہے ارباب اختیار تجویز کردہ طریقہ کار پر سنجیدگی سے غور کریں گے تاکہ نہ صرف کرپشن کا خاتمہ ہو بلکہ ملزموں کو عدالتوں سے سزا دلوانا بھی ممکن ہو سکے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

دکھی شوہر کی فریاد سن کر

شاکی بیوی کا جواب

ازدواجی زندگی میں تلخیاں گھولنے والے عوامل و محرکات — ایک قاریہ کے قلم سے

پروفیسر شبانہ اصغر

شمارہ مارچ میں جناب مراد علی کا تحریر کردہ مضمون "ایک دکھی شوہر کی فریاد" زیر مطالعہ رہا۔ مضمون اہم تھا، انداز دلچسپ اور اختصار لیے ہوئے۔ تاہم تحریر پڑھنے کے بعد تشنگی کا احساس ہوا جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مضمون کی جامعیت پیش نظر نہ تھی۔

صاحب مضمون نے ازدواجی الجھنوں سے ہونے والے مسئلے کی تمام تر ذمہ داری اصناف نازک کے کاندھوں پر ڈال دی۔ [illegible]

میرے محدود علم اور مشاہدے کی روشنی میں یہ صورت حال جنم لینے کے اسباب کا مختصر جائزہ پیش ہے۔ وہ اس اہم مضمون کا مکمل احاطہ شاید نہ کر پائے، تاہم دوسرے اہم فریق کے نقطہ نظر کی ترجمانی کا حق کسی حد تک ادا ہو جائے گا۔

ہمارا معاشرتی اور خاندانی نظام اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے باوجود چند نقائص کا حامل بھی ہے۔ مثال کے طور پر میاں بیوی کے باہمی تعلق اور خلوت (Privacy) کا خیال کم ہی رکھا جاتا ہے۔ [illegible] باوجود اکثر گھروں میں آمد و رفت کی اخلاقیات (Ethics) کا تصور ہی نہیں ہے۔ بہت سے تعلیم یافتہ (شادی شدہ) اور صاحب علم بھی بیوی کی اخلاقی اقدار سے لاعلم ہیں [illegible] غلط طرزعمل اختیار کرتے ہیں۔

خلوت کی حق اور اس کی [illegible] مداخلت میاں بیوی کے

www.pdfbooksfree.pk

خصوصی تعلق کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں غلط فہمیاں اور رنجشیں بھی پیدا کرتی ہے۔ نتیجتاً ان کے درمیان غیر محسوس خلیج جنم لیتی ہے۔ جب غلط فہمیاں دور نہ ہوں تو بدقسمتی سے خلیج بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے، بچوں کی پیدائش کے بعد عورت کی محبت اور توجہ تقسیم ہو جاتی ہے۔ لیکن تقسیم کا یہ عمل اس لحاظ سے نہایت منفرد ہے کہ پیار اور وفاداری کے خمیر سے گندھے نسوانی وجود میں محبت کا عنصر کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ بدقسمتی سے خود مرد کی ذات کم از کم اظہار کی حد تک ان خوبصورت جذبوں سے محروم ہو جاتی ہے۔

ازدواجی زندگی کے آغاز میں چاند تارے توڑ کر لانے کی باتیں کرنے والے چھوٹی چھوٹی مگر اہم خوشیوں کے مواقع پر تحائف دینا تو درکنار، تاریخیں یاد رکھنا بھی بھول جاتے ہیں۔ احادیث نبوی ﷺ سے ثابت ہے کہ تحائف کا لین دین آپس میں محبت بڑھانے کا ذریعہ ہے اور یقیناً میاں بیوی کا تعلق اس سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ تحائف سے مراد قیمتی زیورات یا لباس نہیں۔ خلوص نیت سے کہے گئے چند الفاظ اور مسکراہٹ بھی اظہار محبت کا بہترین ذریعہ ہیں۔ حقیقتاً یہ ایسا نسخہ ہے کہ "ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ بھی چوکھا آوے۔"

روزمرہ زندگی میں جیون ساتھی سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ، تعریف اور حوصلہ افزائی خاتون کو خوش رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ مزاج کی خوشگواری گھر کا ماحول آسودہ رکھنے کے ساتھ ساتھ میاں بیوی کے تعلق کو مضبوط بناتی ہے۔ کسی قیمت کے بغیر حاصل ہونے والی یہ خوشی بھی ہمارے ہاں نایاب ہو چکی۔

ایک اہم پہلو کی نشاندہی صاحب مضمون نے تحریر میں خود ہی کر ڈالی۔ یہ وہ کیفیت ہے جس سے موصوف ایک نامعلوم پیغام موصول ہونے پر گزرے۔ پختہ کرداری کا ثبوت دیتے ہوئے انھوں نے پیغام نظرانداز کر دیا لیکن مستقبل میں کسی خوش آئند توقع کے پیش نظر اسے موبائل سے حذف نہیں کیا۔ مردوں کی اکثریت (معذرت کے ساتھ) ایسے مواقع پر علی الاعلان یا پوشیدہ طور پر بیوی کے ساتھ بے وفائی کی مرتکب ہوتی ہے۔ جبکہ عورت سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ شوہر کی عدم توجہی کے باوجود نیز تمام تر گھریلو ذمے داریوں کی ادائیگی کے بعد تھکے جسم اور ناخوش ذہن کے ساتھ اس "ذمے داری" کو بھی فرض کی طرح (محض مشین کے مانند) پورا کرے جو درحقیقت میاں بیوی کے درمیان تعلق مضبوط بنانے کا ذریعہ ہے۔

المیہ یہ ہے کہ ہم قرآن و احادیث نبوی ﷺ سے ایسے حوالے تلاش کرنے میں بہت ماہر ہیں جو ہمارے مفاد اور نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہوں۔ اس قرآنی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے "عورت مرد کی کھیتی ہے" ہم یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی معاملات میں راہنمائی فراہم کرنے والی اس کتاب روشن میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے۔ اسی کتاب ہدایت کی تفسیر قرار دی گئی ہستی مبارک ﷺ نے بھی عورت کو آبگینہ قرار دیا اور ازدواجی تعلق کی پائیداری کے لیے مختلف مواقع پر بحیثیت شوہر بہترین مثالیں قائم کیں۔

مثال کے طور پر ایک حدیث نبوی ﷺ کا مفہوم ہے: "تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا ہے اور میں تم سب میں اپنے اہل کے ساتھ سب سے اچھا ہوں۔"

بات ختم ہوتی یوں ہے کہ شاہراہ زندگی کے طویل سفر میں ہمسفر کے ساتھ اچھے تعلقات ہوں، تو وقت خوشگوار گزرتا ہے۔ سفر غیر دلچسپ اور پرتکان لگنے لگے تو روزمرہ کی مصروفیات سے وقت نکال کر ہر ایک نیت پر توجہ دیجیے تاکہ "حادثات" سے بچا جا سکے۔ سب سے اہم بات یہ کہ گاڑی کے پہیوں میں توازن ضرور رہنا چاہیے ورنہ وہ ڈگمگانے لگتی ہے۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

کتابوں کی کہکشاں

نام کتاب: نبی ﷺ کا اندازِ تعلیم و تربیت، مصنف: قاضی محمد مطیع الرحمن، ناشر: ... پبلی کیشنز، اسلام آباد، قیمت: ۱۲۰ روپے۔

جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں تبلیغ کا آغاز فرمایا تو آپ ﷺ کے ساتھی کسی مدرسے کے پڑھے ہوئے نہیں تھے، لیکن ... بعد میں ... مکمل ... آپ ﷺ کی ... اور عرب کے طول و عرض میں ... آپ ﷺ کی تعلیم و تربیت سے ... آپ ﷺ کی تعلیمات کا

خیر خواہی میں ہمارے لیے دنیا و آخرت کی کامیابیاں پوشیدہ ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے دورانِ تبلیغ کفارِ عرب کو راہ راست پر لانے کے لیے تعلیم و تربیت کے مختلف انداز اختیار فرمائے۔ جناب مطیع الرحمن نے اپنی تصنیف میں انہی ... انداز کو بیان کیا ہے۔ شروع کے ابواب اسلامی تعلیم کی تعریف و تاریخ کے لیے مخصوص ہیں۔ آگے کتاب میں تربیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب کے اہم باب ملاحظہ فرمائیے: "اسلام میں علم کی اہمیت، تعلیم کے اغراض و مقاصد، تعلیم و تربیت کی تکنیک، درس گاہ، طالبان علم کی مالی حالت، شفقت و رحم دلی، عورتوں کی تعلیم، سوالیہ اندازِ تعلیم، تربیت بذریعہ قصہ گوئی، تربیت بذریعہ تمثیل اور تربیت میں تقسیمات انداز" کتاب میں احادیث نبوی ... متن کی اہمیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔

یہ کتاب خوبصورت انداز میں معیاری کاغذ پر طبع

www.pdfbooksfree.pk

ہوئی ہے۔ قیمت کم رکھی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں۔

نام کتاب: حافظ خان بیری عوان۔ مصنف: محمد رشید عوان۔ ملنے کا پتا: مکان نمبر ۲۲۸، بلاک ۲، سیکٹر بی ۱۱، ٹاؤن شپ لاہور۔ قیمت: درج نہیں۔

بیری عوان سابق ریاست امب کا ایک گاؤں ہے۔ یہ گاؤں ۱۸۲۰ء کے لگ بھگ حافظ برخوردار نامی دینی

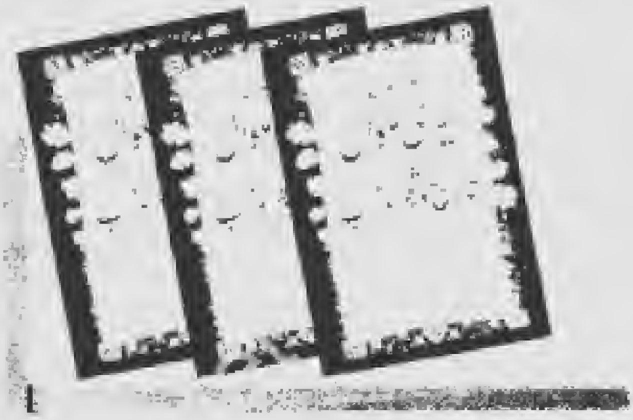

شخصیت نے بسایا تھا۔ ان کی اولاد خوب پھلی پھولی اور "حافظ خان بیری عوان" کے نام سے مشہور ہوئی۔ مصنف کے جد امجد بھی اس گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ اب انھوں نے زیرِ تبصرہ کتاب میں اپنے خاندان، ریاست امب اور بیری عوان سے متعلق دلچسپ معلومات جمع کر دی ہیں۔

کتاب کی رو سے سلطان محمود غزنوی کے ایک نامور فوجی سردار، میر قطب شاہ، حضرت علیؓ کے تیسرے بیٹے حضرت محمد بن حنفیہ کی اولاد میں سے تھے۔ جب محمود غزنوی نے ہندوستان فتح کیا تو میر قطب شاہ وادی سون سکیسر میں رہائش پذیر ہو گئے۔ ان کی اولاد ہی آگے "اعوان" کہلائی۔ حافظ برخوردار بھی انہی کی اولاد میں شامل تھے۔

مرتب نے متعدد کتب سے استفادہ کرتے ہوئے قیمتی معلومات شامل کی ہیں۔ ان کی طباعت معیاری ہے اور کاغذ عمدہ۔ خاندان اور ریاست امب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اسے مفید کتاب پائیں گے۔

٭٭٭

نام کتاب: چینا مسٹر پریذیڈنٹ اور علف الف لسی۔ مصنف: محمد شوید۔ ملنے کا پتا: فلیٹ ۶-۵، پہلی منزل، اندرون فرنچ مارکیٹ، ذائقہ ایئر ڈمپ سٹاپ، شاہراہ لیاقت، کراچی۔ قیمت: ۵۰۰ روپے

ایک حساس اور دردمند پاکستانی ملکی حالات پر کڑھتا رہتا ہے۔ اگر کوئی قلم کار بھی ہو تو وہ اپنے خیالات و جذبات صفحۂ قرطاس پر لے آتا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے مصنف کا شمار بھی ایسے ہی پاکستانیوں میں ہوتا ہے۔

جناب محمد شوید وطن عزیز کے سیاسی، معاشرتی و معاشی حالات سے خوش نہیں۔ لہٰذا انھوں نے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی اور غور و فکر کے موتی صفحات پر بکھیر دیے۔ کتاب کے مضامین میں ارباب علم و دانش کے لیے

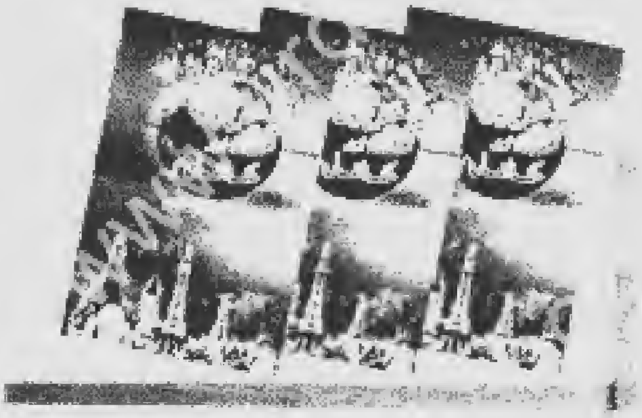

مشورے ہیں اور تنقید بھی۔ کتاب کی طباعت و کاغذ معیاری ہے۔

٭٭٭

نام کتاب: تاریخ مجھ۔ مصنف: مرزا بشارت علی۔ ملنے کا پتا: ۲/۲۰۵ لیاقت آباد، کراچی۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

یہ انیسویں صدی کے اوائل کی بات ہے جب ۱۸۱۳ء میں ریاست میں تحریک برپا ہوئی۔ دہلی کے قریب کی علاقے

ہریانہ میں واقع تھی۔ ریاست کا پہلا حکمران نواب نجابت علی خان اور آخری نواب عبدالرحمن خان تھا۔ ان نوابوں نے ریاست میں کئی عمارتیں تعمیر کرائیں جو اب بھی قائم ہیں۔

نواب عبدالرحمن خان نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنرل بخت خان سے قبل جنرل عبدالصمد خان دہلی میں شاہی افواج کے کمانڈر تھے۔ ان کا تعلق ریاست جھجر ہی سے تھا۔

بدقسمتی سے جنگ میں انگریز فتح یاب ہوئے۔ انھوں نے نواب عبدالرحمن کو پھانسی دے کر شہید کیا اور ان کی ریاست سکھ سرداروں میں تقسیم کر دی۔

زیرِ تبصرہ کتاب اسی ریاست جھجر کی تاریخ ہے۔ مصنف اسی ریاست میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی، پاکستان چلے آئے۔ کتاب چھے ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں ریاست جھجر کے محل وقوع، قدیم عمارت، نظام حکومت، اہم شخصیات، اہم جنگ آزادی، حالات بزرگان دین، تذکرہ مقابر اور ثقافت و معاشرت کے بارے میں سیر حاصل معلومات دی گئی ہیں۔

طباعت و پیشکش معیاری ہے۔ اسلامی تاریخ و تہذیب سے رغبت رکھنے والے اسے دلچسپ معلومات افزا کتاب پائیں گے۔

نامِ کتاب: ہمیں ...... ہمیں آدم!

مصنف: ذیشان شاہد۔ ناشر: ماورا پبلشرز۔ ۶۰ دی مال، لاہور۔ فون: ۳۷۳۰۳۳۹۰-۰۴۲، قیمت: ۲۵۰ روپے

حساس اور سوچنے والا انسان اپنے من میں نئی دنیا آباد کر لیتا ہے۔ اس نرالی دنیا میں نت نئے خیالات اور نظریات ملتے ہیں۔ بعض انسان اپنی بسائی دنیا سے چل بستے ہیں۔ کچھ اسے صفحۂ قرطاس پر اتار کر سبھی کے سامنے لے آتے ہیں۔ انھی ہستیوں میں ذیشان شاہد کا بھی شمار ہوتا ہے۔

ذیشان شاہد معلم ہیں۔ نیز پنجاب یونیورسٹی سے سالماتی حیاتیات میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ معلمی کے ساتھ زیرِ تبصرہ کتاب بھی تخلیق کر ڈالی۔ اس میں واعظ کی واعظ کی طرز نصیحتوں سے زندگی کے تلخ و شیریں حقائق و چھپے چھپے جملوں میں بیان ہوئے۔ یہ جملے انسان کو غور و فکر

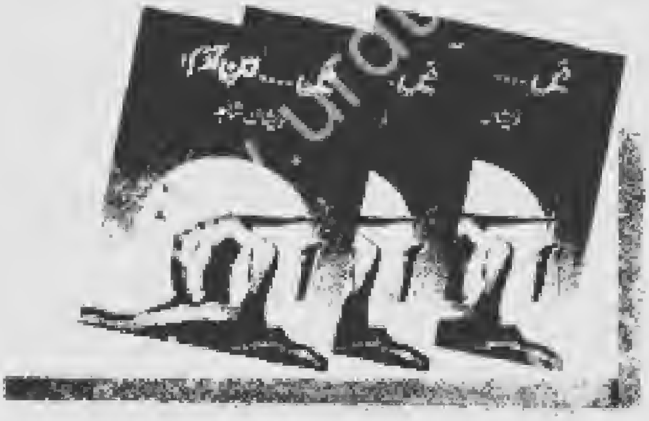

پر ابھارتے اور اسے زندگی سے قریب کرتے ہیں۔ چند جملے بطور نمونہ پیش ہیں:

٭ معلوم نہیں متکبروں نے تکبر کو عاجزوں سے احساس کمتری نے بڑھایا یا احساس کی وجہ سے ان کے تکبر نے جنم لیا۔

٭ انسان کی خوش قسمتی ہے کہ اسے اشیا پرکھنے کے لیے سائنس کا معیار مل گیا ورنہ یہ بدقسمتی ہے کہ وہ ہر چیز کو

www.pdfbooksfree.pk

سائنس سے پرکھنے لگا۔

٭٭ میں جاں کو بات سمجھا سکتا ہوں لیکن کم عمر شخص کو میرے حوالے نہ کرنا میں اسے نہیں سمجھا پاؤں گا۔

کتاب میں اسی قسم کے جملے بکھرے پڑے ہیں جو قاری کو نئے جہان میں لے جاتے ہیں۔ کتاب کی پیش کش عمدہ ہے اور قیمت مناسب! سنجیدہ تحریریں پسند کرنے والوں کے لیے یہ عمدہ تحفہ ہے۔

٭٭٭

نام کتاب: معصوم اور پریچے

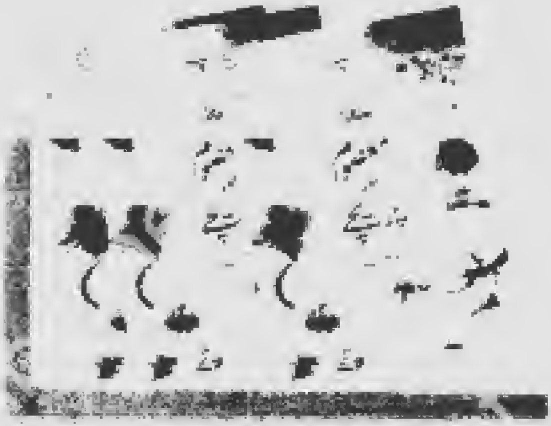

مصنف: گلزار۔ ناشر: بک کارنر، بالمقابل اقبال لائبریری، بک اسٹریٹ جہلم۔ فون: ۰۵۴۴-۶۱۴۹۷۷۔ قیمت: ۴۰۰ روپے۔

بھارت میں اردو جن دو ایک دم قدم سے زندہ ہے، ان میں سمپورن سنگھ اور معروف گلزار کا نام نمایاں ہے۔ آپ ہندو ہونے کے باوجود اردو بولتے، لکھتے پڑھتے اور اس زبان سے محبت کرتے ہیں۔ ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ شاعری کرتے، افسانے لکھتے اور فلموں کی ہدایت کاری کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں گلزار کی دو فلموں "معصوم" اور "پریچے" کے منظر نامے طبع ہوئے ہیں۔ منظر نامے سے مراد وہ کہانی ہے جو منظر میں بیان کی جائے۔ انگریزی میں یہ اصطلاح "سینیریو" (Scenerio) کہلاتی ہے۔ اگر منظر نامے میں ہدایت کاری کی خاطر تکنیکی ہدایات مثلاً "کٹ" وغیرہ لکھ دی جائیں، تو وہ "اسکرین پلے" کہلاتا ہے۔

پریچے فلم ۱۹۷۲ء میں سامنے آئی۔ اس کا اسکرین پلے گلزار صاحب نے لکھا اور ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیے۔ فلم معصوم ۱۹۸۲ء میں بنی۔ اس کا اسکرین پلے بھی گلزار نے تحریر کیا۔ ان دونوں فلموں نے بہت شہرت پائی۔ چناں چہ اب ان کا منظر نامہ پڑھنا قاری کو گلزار کی تحریروں کی ندرت فکر سے آشنا کراتا ہے۔ کتاب میں دونوں مختصر کہانیوں کا روپ دھار چکے۔

کتاب خوبصورت انداز میں طبع ہوئی ہے۔ کاغذ معیاری ہے۔ خوش فکر و خوش ذوق کتب کے شائقین اسے عمدہ پائیں گے۔

٭٭٭

نام کتاب: نوآبادیاتی عہد میں مسلمانان جنوبی ایشیا

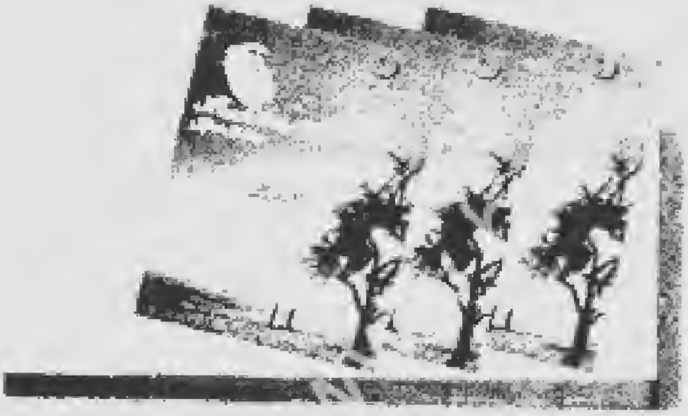

کے سیاسی افکار کی جدید تشکیل۔ مصنف: ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ ناشر: اشاعت مشرق اکیڈمی، اے-۳۵، بلاک ۵، ایف بی ایریا کراچی۔ فون: ۳۴۳۶۹۸۸۴۰۔ قیمت درج نہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے آٹھ سو برس تک حکومت

www.pdfbooksfree.pk

کی اور اس ملک سے پیچھے پرانی تہذیب و ثقافت کے نشان چھوڑے۔ جب وہ زوال پذیر ہوئے تو انگریز آن دھمکے۔ یہ انگریز ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایسے اقدامات کرنے لگے کہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا، ہندوستان سے مسلمان مٹ جائیں گے۔

ایسی گمبھیر صورت حال میں سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو قوم کی راہ دکھائی۔ ان کی کوشش سے مسلمانوں کے دل میں انگریزوں کے لیے بغض و نفرت کم ہوئی۔ سر سید نے مسلمانوں کو زوال سے بچایا تو ایک اور عظیم قومی رہنما علامہ اقبال نے انھیں ترقی اور بلندی کی راہ دکھائی۔ گویا مسلمانان ہند کے جدید سیاسی و فکری افکار کی تشکیل میں سر سید اور علامہ اقبال نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں انھی شخصیات کے افکار و نظریات پر تحریری و تحقیقی انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل ممتاز دانشور، ادیب اور محقق ہیں۔ انھوں نے بڑے مدلل اور دلنشین انداز میں کتاب کے مضمون سے پورا انصاف کیا ہے۔ کتاب معیاری انداز میں شائع ہوئی ہے۔

نام کتاب: کلیات فراق گورکھپوری۔ مرتب: [illegible] ناشر: [illegible] فون: [illegible]۔ قیمت درج نہیں۔

اردو غزل کے بہترین شعرا کا انتخاب کیا جائے تو اس میں فراق گورکھپوری کا نام شامل ہوگا۔ یہ عظیم اردو شاعر 1896ء میں پیدا ہوئے۔ 1982ء میں جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ آپ ہندو ہونے کے باوجود عمر بھر اردو کی ترویج و ترقی میں سرگرم رہے۔

مشہور ہے کہ فراق بھارتی سول سروس کے لیے منتخب ہو گئے تھے۔ مگر جب گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون شروع کی تو انھوں نے سرکاری ملازمت کو لات دے ماری۔ وہ پھر الٰہ آباد یونیورسٹی سے بطور پروفیسر منسلک ہو گئے اور انگریزی ادب پڑھانے لگے۔

فراق صاحب زود نویس تھے۔ غزل کے علاوہ نظم، رباعی اور قطعے بھی کہے۔ ان کی شاعری کے درجن سے زائد مجموعے شائع ہوئے۔ نثر کی چھ کتب چھپیں۔ انگریزی اور ہندی زبان میں بھی شاعری کی۔ گل نغمہ، روح کائنات آپ کی شاعری کے مقبول مجموعے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب فراق گورکھپوری کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا انتخاب ہے۔ اسے بھارت کے ممتاز شاعر

جناب گلزار نے مرتب کیا ہے۔ چونکہ منتخبات پر مشتمل اس کتاب میں فراق کی بہترین شاعری جمع کی گئی ہے۔ مرتب لکھتے ہیں: "غزل وہ پیمانہ ہے جو فراق کی شخصیت اور ... ہے، فراق نے عطا کیا، وہ اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔"

ناشر نے کتاب خوبصورتی و عمدگی سے شائع کی ہے۔ ٹائپ بڑا ہے تاکہ پڑھنے میں آسانی رہے۔ طباعت معیاری ہے۔ کلاسیک رنگ میں شاعری کے شائقین یہ کتاب پسند کریں گے۔ (تبصرہ نگار: سید عاصم محمود)

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

[illegible]

جوابات بھیجنے کا پتا: مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ ۲۲۵۔ [illegible]

ماہ اپریل میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز ۱: (الف) اورنگ زیب عالمگیر ۱۶۷۳ء (ب) شاہی مسجد (بادشاہی مسجد)

قصہ کوئز ۲: (الف) بادشاہی مسجد (ب) ۹ نومبر ۱۹۳۲ء

قصہ کوئز ۳: (الف) قطب الدین ایبک (ب) قطب مینار دہلی

درست جوابات دینے والوں کے نام

[illegible]

کچھ معلومات اور کچھ گزرے ہوئے کا جذب، یہی ہے اس کوئز کا اصل مقصد

یہی ہے قصہ کوئز

[illegible]

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- [illegible] (مظفرگڑھ)
- [illegible] (بہاولنگر)

[illegible]

www.pdfbooksfree.pk

قصہ کوئز/۱

بابا فرید، صوفی بزرگ، فرید الدین لقب۔ ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ اس قصبے کا موجودہ نام چاولی مشائخ ہے۔ والد جمال الدین سلیمان بھی صوفی تھے۔ والدہ قرسم خاتون زہد و تقویٰ کی بنا پر رابعہ عصر کہلاتی تھیں۔ ابتدائی تعلیم کھوتووال میں اور پھر ملتان میں مولانا منہاج الدین ترمذی سے ان کی مسجد میں اسلامی فقہ کی مشہور کتاب "النافع" پڑھی۔ وہیں ان کی ملاقات حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ہوئی۔ چنانچہ انھی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ علوم ظاہری و باطنی کے لیے غزنی، بغداد، سیوستان، بدخشاں اور قندھار کا سفر اختیار کیا اور اس زمانے کے مشہور صوفیا سے اکتساب فیض کیا۔ ۱۲۳۵ء میں آپ کو خرقہ خلافت ملا۔ تو آپ نے پاک پتن کو، جو اس زمانے میں اجودھن کہلاتا تھا، مستقل اقامت بنایا۔ زیادہ تر وقت جنگلوں میں گزارا۔

(الف) آپ کا اصل نام کیا تھا اور آپ کہاں پیدا ہوئے؟

(ب) آپ نے کب وفات پائی اور آپ کا مزار کس نے بنوایا؟

قصہ کوئز/۲

ظہیر الدین، مغل بادشاہ۔ ماں پیار سے بابر (شیر) کہتی تھی۔ باپ عمر شیخ مرزا فرغانہ (ترکستان) کا حاکم تھا۔ بابر باپ کی طرف سے تیمور اور ماں کی طرف سے چغتائی چنگیزی تھا۔ بارہ برس کا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ چچا اور ماموں نے شورش برپا کر دی، جس کی وجہ سے گیارہ سال تک پریشان رہا۔ بالآخر ۱۵۰۴ء میں کابل اور غزنی کا حاکم بن گیا۔ فتح سمرقند کے بعد قندھار پر حملہ کیا تاکہ آبائی مقبوضات ہاتھ آ جائیں۔ آخری ناکامی کے بعد ہندوستان کا رخ کر لیا۔ پہلے باجوڑ، علاقہ سرحد بھیرہ، سیالکوٹ فتح کیا۔ ۱۵۲۴ء میں دولت خان لودھی کی دعوت پر لاہور آیا اور دیپالپور فتح کر لیا۔ ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کو (پانی پت کی پہلی لڑائی میں) شکست دے کر دہلی و آگرہ پر قابض ہوا۔

(الف) تاریخ پیدائش بتائیں اور مشہور خودنوشت کا نام بتائیں؟

(ب) کب اور کہاں وفات پائی؟

قصہ کوئز/۳

فیلڈ مارشل، ایوب خان، سابق صدر پاکستان۔ قیام پاکستان کے بعد وزیرستان میں بریگیڈیر کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان میں میجر جنرل بنا کر بھیجا گیا۔ ۱۹۵۰ء کے وسط میں پاکستان آرمی کے ایڈجوٹنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۷ جنوری ۱۹۵۱ء کو پاک آرمی کے پہلے مسلمان کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں محمد علی بوگرہ کی کابینہ میں ملک غلام محمد گورنر جنرل کی سفارش پر وزیر دفاع مقرر ہوئے۔ اسی وزارت نے "ون یونٹ" کا منصوبہ تیار کیا۔ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو صدر مملکت سکندر مرزا نے مارشل لا نافذ کیا اور جنرل محمد ایوب خان کا تقرر سپریم کمانڈر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے کیا گیا۔ لیکن یہ دوستی آپ کو چند دن راس آئی اور بیس روز بعد ۲۸ اکتوبر کو آپ نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ سکندر مرزا کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔ وہ ملک سے باہر چلے گئے۔ اب جنرل محمد ایوب خان پاکستان کے صدر بن گئے تھے۔

(الف) آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(ب) آپ نے کب وفات پائی اور کہاں دفن ہیں؟

اقامت دین کے لیے تعاون

منشورات

خوبصورت اور معیاری کتب کم قیمت اعلیٰ معیار

منصورہ ملتان روڈ لاہور
042-35434909
042-35425356

www.pdfbooksfree.pk

قارئین کے تبصروں، مشوروں
اور باتوں سے سجا کالم

قدرتی وسائل سے مالا مال "بدقسمت" پاکستان

وطنِ عزیز قدرتی وسائل کے اعتبار سے دنیا کے امیر ترین ممالک میں شامل ہے۔ پاکستان میں کوئلے اور تانبے کے وسیع ذخائر موجود ہیں لیکن ہم ان سے فائدہ [illegible] ہیں لیکن ہماری معیشت آئی ایم ایف کے دیے گئے قرضوں سے چل رہی ہے۔

[illegible]

ایمان دار قیادت میسر نہ آ سکی۔ حکمرانوں کی ترجیحات ذاتی مفادات کی سمت مرکوز رہیں اور وہ ملک کا اچھا انتظام (گورننس) نہیں کر سکے۔ اب بھی جس وقت اچھے حکمران مل جائیں، تو قدرتی وسائل سے بھرپور فائدہ اٹھا کر پاکستان ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ (محمد [illegible]، کراچی)

قومی تمغے یا مذاق

ہر سال [illegible] حکومت کے کارپردازان سال میں چند شخصیات کو قومی تمغے [illegible] کرتے ہیں۔ ایک شخصیت کے کارناموں اور خدمات کی جانچ پرکھ کا کوئی معیار نہیں اور [illegible] ذاتی تعلقات کی بنیاد پر ریوڑیوں کے مانند بانٹے جاتے ہیں۔ [illegible]

[illegible]

جو قرارداد ہم نے پیش کی، وہ مسلمانوں ... کہیں یہ بات بھی دیکھی تھا (سعید احمد، لاہور)

اسلام آباد میں "ون ڈش"

۲۰۰۴ء میں سپریم کورٹ پاکستان نے حکومت کو حکم دیا تھا کہ اسلام آباد سمیت وفاقی علاقے میں تمام شادی ہالوں میں ایک ڈش (ون ڈش) کو رواج دیا جائے۔ لیکن پولیس و انتظامیہ نے اس حکم پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اب نواز شریف حکومت نے حکم دیا ہے کہ عدالتی فیصلے پر سختی سے عمل درآمد کرایا جائے۔ یہ ایک خوش آئند تبدیلی ہے۔

پاکستان میں شادی کی تقریبات میں بے انتہا فضول خرچی ہوتی ہے۔ کئی طرح کے کھانے پکتے اور غیرضروری ڈشیں لگائی جاتی ہیں۔ میرا مطالبہ ہے کہ پورے پاکستان پر ون ڈش کا عدالتی فیصلہ لاگو ہو جائے۔ کئی غریب طبقے سے [illegible] ہیں اور [illegible] رواج دینے سے [illegible] کا بھلا ہو گا۔ (احسان اعظم، اسلام آباد)

قارئین کے تبصرے

اردو ڈائجسٹ کا پرانا قاری ہوں، پڑھتے ہوئے اس سے بہت زیادہ استفادہ کرتا ہوں۔ شمارہ اپریل میں [illegible] کی کرامات [illegible] اور [illegible] کی کہانی عمدہ تحریریں تھیں۔

(محمد ایوب رومی انصاری، [illegible] لاہور)

شمارہ پسند آیا

شمارہ اپریل پڑھ کر [illegible] سے [illegible] شروع کر کے [illegible] تک [illegible] کی۔ [illegible] اور [illegible] پسند آئے۔

([illegible])

پاکستان کا جھنڈا مل گیا

[illegible] سلطان [illegible] غیاث الدین بلبن [illegible] (۱۲۶۶ء [illegible]) میں [illegible] بغاوت [illegible] سب سے زیادہ [illegible]

استحکام کی طرف توجہ دی تاکہ بیرونی دشمن اور ان کا مقابلہ کیا جا سکے۔

پاکستانی قوم کو خوشخبری ملے کہ جنرل راحیل شریف کی صورت میں بھی ایک محسن مل گیا۔ ۲۳ مارچ کو ان کی زیر قیادت پاک افواج نے اپنی طاقت و صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ یوں ثابت ہو گیا کہ اب بھی پاکستان اندرونی و بیرونی دشمنوں کو منہ توڑ جواب دے سکتا ہے۔

آئی ایس پی آر کے سابق سربراہ میجر جنرل (ر) اطہر عباس کا یہ بیان چشم کشا ہے کہ سابق سربراہ جنرل اشفاق کیانی شمالی وزیرستان میں عسکری آپریشن شروع کرنے سے ہچکچاتے رہے۔ اس ہچکچاہٹ کو تحریک طالبان نے ان کی کمزوری سمجھا اور [illegible] بزدلی سے پاکستانی قوم پر حملہ آور ہو گئے۔

اب یہ امر خوش آئند ہے کہ سیاسی اور عسکری قیادت شانہ بشانہ [illegible] ہے۔ ان کی کوششوں سے عوام کا اعتماد بحال ہوا ہے۔ [illegible] حکومت کی بھرپور [illegible] ہے کہ ملک میں امن و امان قائم ہو جائے۔ (حبیب زیدی، لاہور)

محمد علی نیکوکارا کی برطرفی

اخباری اطلاعات کے مطابق حکومت نے [illegible] اور [illegible] افسروں کی کارکردگی [illegible] میں [illegible] پیش آئی ہیں۔ [illegible] طرف اسلام آباد کے [illegible] محمد علی نیکوکارا کو برطرف کر دیا۔ یہ وہی [illegible] ہیں جو پچھلے دو سال میں اسلام آباد سے [illegible] تبدیل ہو چکے۔

[illegible] پہلے دور حکومت میں صدر غلام اسحاق خان سے [illegible] کے بعد دوسرے دور حکومت میں چیف جسٹس سجاد علی شاہ، صدر فاروق لغاری اور جنرل جہانگیر کرامت سے [illegible] جنرل پرویز مشرف سے [illegible] انھوں نے ان کا [illegible] کیا۔

اب تک [illegible] چاہیے کہ ملک [illegible] میں

www.pdfbooksfree.pk

تقرری کی بنیاد پر کسی [illegible] جا سکے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک میں آزاد و خود مختار سرکاری ادارے قائم ہوں جن کی سربراہی ایمان دار و اہل افسروں کے ذمے لگائی جائے۔ پھر کسی افسر کی تعیناتی، تبادلے اور برطرفی کے فیصلے متعلقہ ادارے ہی کریں، یہ وزیراعظم یا صدر کا کام نہیں۔

([illegible])

والدہ کا انتقال

میری والدہ شرافت، دیانت اور محبت کا حسین مرقع تھیں۔ وہ پچھلے دنوں وفات پا گئیں۔ لگتا ہے کہ ہم ایک گھنے سایہ دار شجر سے محروم ہو گئے۔ میرا سائبان مجھ سے چھن گیا۔ رب اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائے اور مرحومہ کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

(رانا محمد شاہد، گلستان کالونی، بورے والا)

ٹی وی چینلوں کا معیار

مجھے [illegible] افسوس ہوتا ہے کہ حکومت ٹی وی چینلوں کو اخلاقیات، اصولوں کے دائرے میں رکھنے کے لیے کوئی قانون نہیں بنا رہی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ پیمرا کا قانون کیا ہے۔ [illegible] حقیقت ہے کہ کئی پاکستانی ٹی وی چینل ناچ گانے اور [illegible] دکھا رہے ہیں۔ [illegible] لیکن نتیجہ اس ضرب المثل کے مطابق نکلتا ہے [illegible] اپنی بھی بھول گیا۔"

شاید [illegible]

مزید [illegible]

سنجیدہ خبریں بھی بے تکی اور مضحکہ خیز بن جاتی ہیں۔ جرائم کی خبروں کو خوب اہمیت دی جاتی ہے۔ انھیں مرچ مسالا لگا کر سنایا جاتا ہے۔ یعنی جرائم کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا نئی نسل کو بگاڑنے کے مترادف ہے۔

مجھے یاد ہے، پی ٹی وی کے زمانے میں خبرنامہ نو بجے نشر ہوتا تھا۔ تب شروع میں قومی اور عالمی نوعیت کی خبریں سنائی جاتیں، پھر صوبائی خبروں کا نمبر آتا۔ آخر میں کھیل اور موسم کی خبریں سنائی جاتیں۔

اب یہ ہو رہا ہے کہ ٹی وی چینل سب سے پہلے شہروں اور قصبوں کی خبریں سناتے ہیں۔ [illegible] ہمارا ذوق اتنا خراب ہو چکا؟ ٹی وی چینلوں کی یہ روش دیکھ کر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں "[illegible] ٹی وی چینلوں [illegible]"

(شفیق الرحمٰن، حیدرآباد)

وطن عزیز کا نظام تعلیم

ایک قوم کو ترقی یافتہ اور خوشحال بنانے کے لیے معیاری تعلیمی نظام انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن پاکستان میں الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ [illegible]

[illegible] قابلیت رکھتے ہیں مگر دولت یا سفارش نہ ملنے پر [illegible] حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ [illegible] محنت کر کے کامیاب ہونے والے طلبہ و طالبات کی حق تلفی ہوتی ہے۔

حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ ہے کہ قومی نظام تعلیم کا معیار بلند کیا جائے [illegible] ترقی یافتہ ممالک [illegible]

([illegible])

www.pdfbooksfree.pk

ایک مقابلہ نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: سجاد قادر

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر 18 سے 28 سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ اپریل میں دیے گئے اسلامی کوئز کے صحیح جوابات

[illegible]

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ [illegible] 2۔ [illegible] 3۔ [illegible] 4۔ [illegible]

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

[illegible]

اسلامی کوئز 1

[illegible]

(الف) [illegible] (ب) [illegible]

اسلامی کوئز 2

[illegible]

(الف) [illegible] (ب) [illegible]

نوٹ: [illegible] TCS [illegible] TCS [illegible] TCS [illegible] (مدیر اردو ڈائجسٹ)

[illegible]

اسلامک پبلی کیشنز

[illegible]

www.pdfbooksfree.pk